# داستاں چھوڑ آئے

ایوارڈ یافتہ

رحیم گل

بڑے دُکھ بھرے ہیں جاناں! میری زندگی کے لمحے
اگر ہو سکے تو سُننا میری داستاں خدا را
نہ مِل سکا ٹھکانہ میری بے قراریوں کو
کہیں رو کے رات کاٹی، کہیں رو کے دِن گزارا

——— مُصلح الدّین زابیکی

# پیش لفظ

دوستو.........! تمام اعترافات کے ساتھ حاضر ہوں.........!

"جنت کی تلاش" لکھتے وقت میں بہت چاق و چوبند تھا......... یوں کہیئے کہ یہ ناول لکھتے وقت میں اس قدر سرشار تھا کہ نہ تو مجھے مالی نا آسودگی نے پریشان کیا اور نہ کوئی ذہنی اور نفسیاتی دباؤ رہا.........

جونہی ناول کی تکمیل ہوئی اور میں تخلیق کے کرب سے آزاد ہوا تو عجب صورتِ حال پیدا ہوگئی......... چاروں طرف سے بیماریوں کی یلغار ہوئی......... ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ میں نے وصیت تک لکھ دی.........

"جنت کی تلاش" لکھنے کے بعد ' موت کوئی ایسی بھیانک چیز نہیں رہی تھی لیکن چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اچھا باپ ثابت نہیں ہوا۔ نہ کوئی اثاثہ ہے کہ میرے بعد ان کی تعلیم جاری رہ سکے بلکہ میں تو ایک چھت بھی فراہم نہ کر سکا کہ یہ لوگ دھوپ اور بارش سے بچ سکیں.........؟

شاید یہی احساس تھا کہ میں نے بیماریوں پر قابو پا لیا اور جینے کی امنگ نے ایک بار پھر مجھے زندگی کا سامنا کرنے کے لیے کھڑا کر دیا.........

میں نے سوچا بچوں کی تعلیم اور مستقبل کے علاوہ میرے پاس ایک اور طاقت بھی ہے......... وہ ہے تخلیق کے کرب کی طاقت......... اس طاقت سے میں نے "جنت کی

تلاش" کے چھ سال جس قلبی طمانیت اور روحانی آسودگی سے گزارے ہیں آئندہ بھی یہ طاقت میری دستگیری کرے گی.........

چنانچہ ایک نئی امنگ لے کر میں کام میں جت گیا.........

یہ کام زیادہ مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ ماضی کی ایک ایک یاد میرے دل پر نقش تھی۔ مصور تصویر شروع کرتا ہے۔کبھی کبھی موئے قلم غلط لائن بھی کھینچ دیتا ہے مگر مصور کے ذہن سے جو تویریں پھوٹتی ہیں وہ غلط لائن پر ایسا ہالہ بنا دیتی ہیں کہ اس ہالے میں سے ایک لافانی عکس کے خدوحال ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک دن یہ عکس شاہکار بن جاتا ہے.........

یہی صورتِ حال ایک ایسے لکھنے والے تخلیق کار کو بھی پیش آتی ہے۔ وہ خالی الذہن ہوتے ہوئے بھی قلم اٹھا کر جب یکسوئی سے بیٹھتا ہے تو خیالات کے کرنوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے اور وہ تخلیق کے کرب سے گزرتا ہے۔

یادداشتیں لکھتے وقت اگرچہ میں "جنت کی تلاش" کی سی کیفیت سے نہیں گزرا لیکن زندگی کے مختلف ادوار میں جیسے جیسے واقعات پیش آتے رہے وہ تخلیقی کرب سے کچھ کم درجہ نہیں رکھتے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں ان گنت محبتوں سے دو چار نہ ہوتا تو شاید تخلیقی کرب کی دولت سے بھی مالا مال نہ ہوتا.........

ہر محبت کی ناکامی نے مجھے ایک نئے احساس سے دو چار کیا اور ہر محبت کی ابتداء نے مجھے ایک نئی کیفیت سے آشنا کیا.........

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے پہلی محبت کو آخری محبت نہیں جانا اور یہ بھی کہ نہ دیوانہ ہوا' نہ صحراؤں میں نکلا اور نہ خود کشی کا دورہ پڑا۔ اس لئے افلاطونی عشق پر اعتقاد رکھنے والوں کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن ان گنت محبتوں کے اعتراف کو بوالہوسی کے کھاتے میں اس لئے نہیں ڈالتا کہ میں آخری محبت میں بھی اتنا ہی سچا تھا جتنا کہ پہلی محبت میں تھا......... پہلی اور آخری محبت میں جس حد تک سرشار رہا بیچ کی ساری محبتوں میں بھی ویسی ہی خود فراموشی رہی۔

یہ الگ بات ہے کہ مختلف مزاج کی لڑکیوں نے مختلف احساس دیئے اور فریفتگی کے گوناگوں رنگ دیکھے.........

ہوسکتا ہے......... وہ لوگ جو ایک محدود سوچ کے قلعے میں بند ہیں' میرے انداز نظر کو پسند نہ کریں لیکن جو لوگ جنس و محبت کے فلسفے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں وہ اس موضوع کی وسعت اور ایک فن کار کی فطرت کے پھیلاؤ کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ یہ کتاب میں نے انہی لوگوں کے لیے لکھی ہے۔

میرے نزدیک محبت ایک نیکی ہے......... عورت سے محبت' مرد سے محبت' بچے سے محبت' جانور سے محبت اور پھولوں سے محبت یہی میری سرشت ہے اور میں اس سرشت کے ساتھ زندہ رہنا پسند کرتا ہوں !

رحیم گل

غالباً میں پہلی یا دوسری جماعت میں پڑھتا تھا' جب ماں کا انتقال ہوا تھا۔ مجھے ماں کا ناک نقشہ اچھی طرح یاد نہیں۔ ہاں دھوئیں میں لپٹا ہوا دھیما سا ایک تصور ذہن میں موجود ہے کہ ایک گوری چٹی طویل القامت عورت کی لاش کفن میں لپٹی ہوئی پڑی ہے اور لوگ رو رہے ہیں۔ میں بھی رو رہا ہوں۔ پھر کوئی میرے ہاتھ میں دو آنے تھما کر اور مٹھائی کا جھانسہ دے کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکال دیتا ہے۔

میں سیدھا سندر داس کی ہٹی پہنچتا ہوں۔ اپنی پسند کی مٹھائی خرید تا ہوں اور ماں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جاتا ہوں۔

یہیں سے میں ایک سانولے میانے قد کے شفیق شخص کی انگلی پکڑتا ہوں۔ یہ انگلی جس ہاتھ کی انگلی ہے ..... وہ ایک محنت کش آدمی کا کھردرا ہاتھ ہے مگر اس کھردرے ہاتھ سے جو پسینہ نکلتا ہے' اس کی خوشبو میری روح میں اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ میں دو پیار کرنے والی بہنوں اور بھائی کی محبتوں سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہوں اور یہ فرق کرنا بھول جاتا ہوں کہ ممتا اور شفقت میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے جو مجھے کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنے والد جیسا شریف اور شفیق انسان نہیں دیکھا.........

کوہاٹ کے جنوب میں خٹک علاقہ میلوں..... ٹھیلوں کے لیے مشہور ہے۔ شادی

بیاہ، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ کے علاوہ کئی مواقعوں پر کوڈی (لمبی کبڈی) گھڑ دوڑ، بیل دوڑ، خٹک ڈانس، نشانہ بازی وغیرہ کے مقابلے ہوتے تھے اور بلا تفریق عمر بچے جوان اور بوڑھے ان میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا گیا ہو کیونکہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہمارے زندہ دل والد ایسے میلوں میں شریک نہ ہوتے.........

میں ان کی انگلی پکڑے رکھتا۔ شرنائی اور ڈھول کی جوشیلی تانیں سن کر میرے رگ و پے میں بجلی کی سی لہر دوڑ جاتی۔ گھڑ سوار گھوڑوں کی لگامیں کھینچتے کبھی ڈھیلے کرتے، گھوڑے ایک عجیب شان سے سر اٹھاتے، ناز و ادا سے بدکتے اور سبک قدموں سے آگے نکل جاتے.........

ان کے سرخ اور مشکی جسم چمکتے۔ ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے رنگ برنگ کے ریشمی ہار اور چھوٹے چھوٹے چوکس کانوں کے درمیان ریشمی کلغیاں عجیب سماں پیدا کرتیں.........

گھوڑوں کی یہ آن بان دیکھ کر میرا ننھا سا دل مچل جاتا اور گھوڑا بننے کو جی کرتا اور جب شاہسوار ہاتھ میں چمکتے ہوئے طرح دار نیزے لے کر نشانے پر گھوڑوں کو سرپٹ چھوڑتے تو شرنائی اور ڈھول کی لے بھی تیز ہو جاتی......... ایسے میں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے جسم میں عجیب وغریب کیفیت کی لہر دوڑ جاتی اور روح انجانے ولولوں کی یلغار سے سرشار ہو جاتی۔

دل چاہتا میں بھی دوڑ پڑوں اور ایسا دوڑوں کہ گھوڑوں کو فرلانگوں پیچھے چھوڑ جاؤں.........

یہی وہ لمحے ہوتے تھے، جب میں غیر شعوری طور پر باپ کی انگلی دباتا اور مروڑتا تھا اور وہ میری اس کیفیت کو دیکھ کر ہنس پڑتے تھے......... اور میں کھسیانا سا ہو کر اصلی حالت میں آجاتا تھا.........

بیلوں کی دوڑ ہوتی تو کچھ اور ہی سماں بندھ جاتا۔ کسان اعلیٰ نسل کے بیل دور دراز کے علاقوں سے خرید کر لاتے اور مہینوں انہیں کھلاتے پلاتے۔ اپنی اولاد کی طرح ان کے ناز نخرے اٹھاتے......... وقت پر دانہ، وقت پر پانی، نمک کے بڑے بڑے ڈھیلے کھرلی میں رکھے ہوتے۔ گھر کے بچے پیار سے ان کی گردنیں تھپتھپاتے اور گڑ کی ڈلیاں ان کے منہ میں ڈالتے رہتے......... بعض شوقین بانس کے فٹ ڈیڑھ فٹ کے ٹکڑے کے ذریعے دیسی گھی بیل کے منہ میں ڈال کر پلاتے۔

چند دنوں میں بیل کی کھال چمکنے لگ جاتی اور کسان کی آنکھوں میں جگنوں دمکنے لگتے......... اور جب وہ صاف ستھرے تھان پر بیٹھ کر نمک کا ڈھیلا چاٹنے لگتا تو کسان کی کیفیت دیدنی ہوتی.........

آخر وہ دن بھی آ جاتا، جب کسان اپنی جوڑی کی پیشانیوں اور جسم پر مہندی کے پھول سجاتا اور اسے میدان میں اتراتا۔

ایک سے ایک خوبصورت، ایک سے ایک پلا ہوا جانور، جدھر نظر اٹھاؤ وہیں نگاہیں ٹک جائیں۔ ہر جوڑی کے اردگرد دس بارہ آدمیوں کا جمگھٹا۔

پھر ڈھول بجتے شرنائی کی تانیں فضا میں بکھر جاتیں۔ مجمع چھٹ جاتے اور کھیت کی میلوں لمبی منڈیروں پر ایک خلقت نظر آتی۔

بیل چوکس ہو جاتے گویا ڈھول کی لے اور سم نے ان کی جبلت سے سرگوشی کر کے کوئی راز کی بات کہہ دی ہو۔

کسان جوڑی کی پشت پر، مانجھے پر کھڑے ہو کر جب بیلوں کو دوڑنے کے لیے للکارتا تو وہ لمحہ دیکھنے سے تعلق رکھتا......... ان بے زبان جانوروں کو جانے کیسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اپنے مالک کی آن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ ایک خاص ادا سے اپنی دُمیں کھڑی کر کے اس بے ساختگی سے بھاگتے کہ دل بے اختیار عش عش کر اٹھتا۔

کھیت کے اس سرے پر گردوغبار کے بادل سے نکل کر جب یہ جوڑی واپس آتی تو ڈھول اور شرنائی والے اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتے۔ ڈھول اور جوڑی کی درمیانی

جگہ میں دو چار نو جوان خٹک ناچ کا مظاہرہ کرتے........ بیل اپنی پذیرائی کی شان میں جھاگ اگلتے ہوئے' چھاتی تانے اور سر اٹھائے ہوئے ڈھول کے ہر ہر سم کو پاؤں تلے روندتے ہوئے' ایک عجیب تمکنت سے اپنے ہم جنسوں کی طرف واپس آتے۔

کسان خوشی سے پھولا نہ سماتا اور ناچنے والوں پر بے دردی سے روپیہ وارتا۔ اس ہجوم میں میں بھی باپ کی انگلی پکڑے کہیں کھڑا ہوتا اور اپنے فطری اضطرار کا مظاہر کسی نہ کسی شکل میں کرتا۔

وہ بات مجھے اب تک یاد ہے' جب میں والد سے پوچھتا۔

"ابا........اس فلاں بیل کا رنگ بھورا' فلاں کا رنگ کالا اور فلاں کا چت کبرا کیوں ہے؟ ان سب کا رنگ ایک جیسا کیوں نہیں؟"

تو میرے ابا ہنس پڑتے۔ وہ مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکتے۔ اب سوچتا ہوں' اچھا ہوا میرے ابا مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ کائنات کا بھید کھوجنے میں جو مزہ ہے' پا لینے میں شاید وہ مزہ نہ ہو۔!

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ والد ساتھ نہ ہوتے اور ہمیں تماشا دیکھنے کا موقع مل جاتا........ تب ہمارے قصبے شکر درہ تک سڑک نہیں بنی تھی۔ لوگ بیس میل کا سفر پیدل طے کر کے سڑک تک پہنچتے تھے' وہاں گھنٹہ دو گھنٹے انتظار کرتے۔ بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان سے آنے والی بسوں کے ذریعے کوہاٹ پہنچتے۔

گڑ' گندم' لکڑی اور زندگی کی ساری چھوٹی بڑی ضروریات جو راولپنڈی' پشاور' کوہاٹ اور بنوں سے خریدی جاتیں سڑک کے کنارے' کھلے نیلے آسمان کے نیچے اتار لی جاتیں۔ ان اشیا کا کرایہ سینکڑوں میل کا اتنا نہ بنتا جتنا بیس میل پر اخراجات اٹھ جاتے۔ بعض اوقات تو اصل قیمت سے کرایہ دوگنا پڑ جاتا۔

یہ سارا کاروبار اونٹوں کے ذریعے ہوتا تھا........ گڑ اور گندم کے کسی بڑے تاجر کا مال پہنچتا تو آدھے آدھے میل تک اونٹوں کے لمبے لمبے کاروان دیکھنے میں آتے۔ ان کی گردنوں میں ٹنگی ہوئی ٹلیاں بجتیں........ تو بچہ لوگ حیرت اور مسرت سے دیکھتے........



قصبے کی منڈی میں رونق لگ جاتی۔

برف باری کے دنوں میں افغانستان کے ژندراں اور خلجی قبائل کے کنبے مال مویشی اور بال بچوں سمیت پورے سرحد میں پھیل جاتے۔ کچھ خاندان ہمارے علاقے میں بھی آ جاتے۔ بار برداری کے لیے ان کے پاس بھی اونٹ ہوتے' جن کی کوہانوں اور گردنوں پر لمبے لمبے بال ہوتے تھے۔ یہ اونٹ قد میں نسبتاً" چھوٹے ہوتے تھے لیکن بے حد طرار اور سیماب صفت ہوتے تھے........

کڑاکے کی سردی میں جب سورج اپنے سنہری پر پھیلا دیتا' موسم خوشگوار ہو جاتا' دکانیں لگ جاتیں' منڈی گرم ہو جاتی تو کسی کونے سے کوئی مست اونٹ گردن اونچی کرتا تالو باہر نکالتا اور بھڑک مارتا تو سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ داد بھری نگاہوں سے دیکھتے اور اس کے جذبہ جنوں کو تسلیم کرتے۔

یہی دورۂ جنوں ہوتا ہے' جب اونٹ اپنی سرشت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے شتر کینے کا عملی ثبوت فراہم کرتا ہے۔ بھڑکیں مارتا ہے اور دشمن کو للکارتا ہے۔ دشمن سامنے نہ آئے تو بھی جوش جنوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ زندگی میں ہلچل ہو۔

یہی وقت ہوتا کہ کسی دوسرے کونے سے بھی بھڑک سنائی دیتی ہے۔ اس بھڑک میں بھی وہی شان اور وہی نخوت ہوتی ہے........ لوگوں کی گردنیں اب دوسری طرف مڑ جاتی ہیں اور ان کی آنکھیں چمکنے لگ جاتی ہیں........

دونوں اونٹ وحشت بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں اور عجیب بے ہنگم انداز میں ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی گردن میں دانت چبھونے کی کوشش کرتے ہیں........

میں ایک طرف سہما ہوا کھڑا ہوں مگر یہ تماشا چھوڑنے کو بھی جی نہیں کرتا........

دکانداروں نے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ لی ہیں اور تماشائی میدان خالی کر کے ایک طرف ہو گئے ہیں........

ایک اونٹ نے دوسرے کی گردن میں دانت گاڑ دیئے ہیں۔ وہ بار بار گردن گھما کر

دانت گاڑنے والے کو پکڑنا چاہتا ہے مگر وہ اس کی ایک چلنے نہیں دیتا۔ اب وہ لٹو کی طرح بے ہنگم انداز میں ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں۔

دونوں مالک آ گئے ہیں انہوں نے اپنے اپنے اونٹ پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے ہیں مگر لگتا ہے کہ ڈنڈے ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن ان دیوپیکر چٹانوں کا کچھ نہیں بگڑے گا.........

میں سوچتا ہوں......... بیل ایک دوسرے سے لڑتے ہیں تو سینگ پھنسا کر زور آزمائی کرتے ہیں' طاقت ور کمزور کو دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ آخر کمزور پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے۔ جیتنے والا دایاں پاؤں زمین پر مار مار کر گرد اڑاتا اور اسے للکارتا ہے اور فتح کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ بیلوں کی لڑائی کے گر اور قواعد کچھ کچھ سمجھ میں آتے ہیں مگر اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی' کے مصداق ان کی لڑائی کا بھی کوئی قاعدہ اور قانون نہیں ہے کیونکہ اگلے لمحے گردن پکڑنے والے اونٹ کی ٹانگ دوسرے اونٹ کی گرفت میں آ گئی ہے۔ اب وہ تین ٹانگوں سے اچھل رہا ہے مگر وہ اپنی زخمی گردن کا پورا پورا حساب چکا رہا ہے۔

بڑی تگ و دو کے بعد پہلے اونٹ نے دوسرے اونٹ کے کوہان میں دانت گاڑ دیئے ہیں۔ اب ایک کی ٹانگ اور دوسرے کا کوہان.........

یہی موقع تھا کہ دونوں سار بان جھپٹ پڑے اور انہوں نے اپنے اپنے اونٹوں کے نکیل پکڑ لیے اور تماشا ختم ہوا۔

اور تب معلوم ہوا کہ میں جو پندرہ منٹ سے اعصابی کھچاؤ میں جکڑا کھڑا تھا' اب کتنا سبک محسوس کر رہا ہوں۔

کوہاٹ' جو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشموں کے لیے مشہور ہے۔ اعلیٰ نسل کے بلٹریا کتوں کے لیے بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ سفید رنگ کا بلٹریا روایتاً" ہمارے گھر میں بھی پالا جاتا تھا۔ بلٹریا کتا بظاہر جس قدر نازک اور خوبصورت نظر آتا ہے' مزاجاً" اتنا ہی تن خو' دلیر اور طاقت ور ہوتا ہے۔ جہاں دانت گاڑ دیتا ہے' گوشت کا ٹکڑا الگ کیے بغیر منہ



نہیں کھولتا۔ ایسے موقع پر اس کے کان میں پانی ڈالا جاتا ہے' تب وہ اپنے شکار کو چھوڑتا ہے۔ بلٹریا عموماً" بہرہ ہوتا ہے۔

ہمارا بجو بھی اسی نسل کا کتا تھا۔ بھیڑیوں اور ریچھوں سے کامیاب لڑائیاں لڑنے کے بعد اس کی ایسی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ دن بھر کی قید کے بعد رات کو جب اسے زنجیروں سے آزاد کر کے گھر کی چار دیواری میں کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا تو کسی کو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہمارے گھر کے قریب سے گزر سکے۔

گیدڑ کو تو وہ گردن سے پکڑ کر دو چار جھٹکوں میں ختم کر دیتا۔

روزانہ شام کو جب میں اسے زنجیر میں بندھا ہوا سیر کے لیے نکالتا تو لوگ راستہ چھوڑ دیتے۔ اس کی طاقت اور طراری کا یہ عالم تھا کہ سارا راستہ مجھے گھسیٹتا چلا جاتا.........

بندر اور ریچھوں کو نچا کر روزی کمانے والے خانہ بدوش' جب بھی ہمارے قصبے میں آتے بجو سے ریچھ کی لڑائی کا اہتمام ضرور کیا جاتا۔ شوقین مزاج نوجوان چندہ جمع کرتے۔ پچاس ساٹھ روپیہ اکٹھا ہو جاتا تو ریچھ والے کو دے کر مقابلے کی تاریخ مقرر کر دی جاتی۔ قصبے میں اس مقابلے کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ گرد و نواح سے بھی لوگ آجاتے اور بالکل میلے کا سا سماں بندھ جاتا.........

ہم بجو کو خوب کھلاتے پلاتے صابن سے نہلاتے۔ میرا بھائی اور والد اسے پیار سے تھپتھپاتے اور اسے اپنی وضع داری اور روایت برقرار رکھنے کی ہدایت کرتے۔ بجو ان کے ہاتھ چاٹتا دم ہلاتا اور پاؤں میں لوٹتا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں میں سے ان کی تسلی کر دیتا.........

" فکر نہ کرو دوستو' میری نسل کی قسمت میں دست فطرت نے ہار نہیں لکھی!"

کھلے میدان میں مقابلے کا اہتمام ہوتا۔ ریچھ کی گردن میں مضبوط لمبی رسی ڈال دی جاتی۔ رسی کا دوسرا سرا نہایت مضبوطی سے لوہے کی بڑی کیل کے ذریعے زمین میں گاڑ دیا جاتا۔ لوگ چاروں طرف سے گھیرا باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ کر

تماشا دیکھتیں۔ بجو کو بڑی شان وشوکت اور طمطراق سے لایا جاتا۔ ریچھ کو دیکھ کر بجو پر دیوانگی طاری ہو جاتی۔ وہ بار بار زور لگا کر ریچھ کی طرف لپکتا......... بھونکتا بالکل نہیں تھا مگراس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

ریچھ جو نہایت خونخوار اور طاقت ور درندہ مشہور ہے' بجو کو دیکھ کر سہم جاتا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف بھاگتا اور بار بار اس کا پیشاب نکلتا۔ لوگ ہنستے کیونکہ جسامت کے لحاظ سے دونوں میں ایک اور چار کی نسبت تھی۔

ایسے ہی ایک مقابلے میں بجو کو زنجیر سے آزاد کر دیا گیا۔ وہ گولی کی طرح سیدھا ریچھ پر حملہ آور ہوا ریچھ فرار کی کوئی صورت نہ پاکر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ بجو نے اچھل کر اس کی تھوتھنی پر حملہ کیا مگر بجو کا پہلا حملہ ہمیشہ ناکام ہوتا۔ تازہ دم ریچھ نے ایسا روز دار پنجہ مارا کہ بجو لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ ریچھ کے آہنی پنجے سے اس کے سفید جسم پر خون کی پانچ لکیریں کھچ گئیں۔

لوگ دم بخود رہ گئے لیکن اگلے لمحے بجو اٹھا اور اس نے خونخوار جانور پر پہلے سے زیادہ شدید حملہ کیا۔ حملہ بھی ایسا کہ اس میں تحفظ کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ وہ دم اور پشت کی طرف سے حملہ نہیں کرتا تھا' سیدھا تھوتھنی کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پہلے تین چار حملے ریچھ نے بڑی پامردی سے بچائے۔ اچانک ریچھ نے بجو کو چاروں ٹانگوں میں لپیٹ کر سینے میں دبا لیا اور بجو کے کانوں میں دانت گاڑ دیئے۔ ریچھ اسے مچھر کی طرح مسل رہا تھا......... سب کا خیال تھا کہ بجو کی کمر ٹوٹ چکی ہوگی اور آج اس کا زندہ بچنا مشکل ہے۔

اس کاروئی کے گالے کی طرح سفید جسم لہو لہان ہو چکا تھا مگر کسی نے اس کی "چوں" کی آواز نہیں سنی۔ میرا بھائی اور والد حیران و پریشان کھڑے تھے۔ بجو ہمارا قابل اعتماد دوست تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ اس سے پہلے وہ دوبارہ قدآور ریچھوں کو ناک چنے چبوا چکا تھا۔

قلندر' ریچھ کی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا۔

اچانک ریچھ دھاڑا اور اس نے بجو کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ بجو کے منہ میں



گوشت کا ایک لوتھڑا تھا' جو ریچھ کے سینے سے نوچ لایا تھا......... ریچھ بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ بجو نے سر جھٹک کر گوشت پھینک دیا اور ریچھ کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تھوتھنی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ سارا مجمع خوشی سے چیخ اٹھا......... اب ریچھ ایک بار پھر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ بجو اس کی تھوتھنی میں دانت گاڑے لٹک رہا تھا۔ ریچھ اپنے بھاری ہاتھوں اور نوکیلے پنجوں سے بجو کو پسلیوں میں باری باری مار رہا تھا۔ بجو کی کھال دونوں طرف سے ادھڑ گئی مگر اس نے ریچھ کی تھوتھنی سے منہ الگ نہ کیا۔ آخر ریچھ ہیبت اور وحشت سے گر پڑا۔ بجو اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ ریچھ دھاڑیں مار کر چیخ رہا تھا اور بجو اس کی تھوتھنی جھنجھوڑ رہا تھا۔

ریچھ والے نے رونا شروع کردیا اور میرے ابا کے پاؤں گر پڑا۔

"میاں جی' رب کا واسطہ' میرے جانور کو چھڑوا دو۔ میرے بچوں کی روزی نہ چھینو"۔

کس میں جرأت تھی کہ اس لمحے بجو کو اپنے شکار سے پیچھے ہٹائے......... ابا نے بھائی کی طرف دیکھا۔ بھائی نے لپک کر کتے کے پٹے میں زنجیر کی کنڈی پھنسا دی اور اسے تھپتھپی دے کر پیچھے کھینچنے لگا مگر بجو کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ دانت اور نیچے اتر گئے۔

ریچھ والے نے لپک کر ایک ڈنڈا بجو کے جبڑوں میں ڈال دیا' اسے ٹیڑھا کر کے اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔ یہ بجو کے لیے خاصا تکلیف دہ عمل تھا' لیکن بلٹریا نسل کی بھی اپنی ایک فطرت تھی۔ وہ اپنی روایات کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

اس لمحے ابا آگے بڑھے۔ انہوں نے ریچھ والے سے ڈنڈا چھین کر پرے پھینک دیا اور پانی کے چند قطرے بجو کے کان میں ڈال دیئے۔

بجو کو جیسے بجلی چھو گئی۔ اس نے ریچھ کو چھوڑ دیا۔ بھائی کھینچ کر اسے پیچھے لے گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا مگر اب بھی زخمی کان کھڑے کیے ریچھ کی طرف زور لگا رہا تھا۔ مجمع اسے داد دے رہا تھا.........

آخر خون میں لتھڑے ہوئے بجو کو بھائی گود میں اٹھا کر گھر لے گیا۔ گرم پانی سے نہلایا' دودھ پلایا۔ اتنے میں سلوتری بھی آگیا' اس نے نہایت توجہ اور دھیان سے بجو کی مرہم پٹی کی۔ وہ بجو کی بے جگری سے اتنا خوش ہوا تھا کہ مسلسل ایک ماہ تک گھر آکر بجو کی مرہم پٹی کرتا رہا۔

آٹھ برس بعد جب بجو بوڑھا ہو کر مرگیا تو ہمارے گھر میں باقاعدہ اس کا سوگ منایا گیا میرے ابا نے کہا.........

"آج چودہ سال کی رفاقت ختم ہوگئی ہے۔"

اس کی موت کو ہم نے اچھے دوستوں کی جدائی کی طرح محسوس کیا!!

لڑکپن میں میرے مشاغل عجیب و غریب تھے۔ بلبل اور بٹیر میں نے پالے' تیتر اور چکور ہمارے گھر میں تھے۔ اصیل مرغ اور کبوتروں کا شوق مجھے رہا......... بلبل کو کشمش کی موڑی کھلا کھلا کر اس طرح سدھایا کہ وہ حقِ پرواز و نشیمن بھول گیا۔ پہلے اسے آزمائشی طور پر اڑاتے۔ اس کے پیروں میں لمبا دھاگہ باندھ دیتے ہیں۔ ایک چھت پر کھڑا ہو جاتا دوسرا لڑکا بیس پچیس گز دور دوسری چھت پر کھڑا ہو جاتا۔ بلبل میرے ہاتھ پر بیٹھا ہوتا۔ سامنے والا لڑکا کشمش کا حلوہ دکھاتا اور "آ آ" کہہ کر بلبل کو متوجہ کرتا۔ وہ پھر کر کے اڑ جاتا اور بے حد بکساری سے حلوے کی پوٹلی والے ہاتھ پر پھول کی طرح بیٹھ جاتا۔ اس لمحے ضروری ہوتا کہ چار پانچ چونچیں مار کروہ پیٹ پوجا کرے۔

ہمیں حیرت اور خوشی ہوتی کہ پہلے دن وہ ہمارے ہاتھوں میں کس طرح پھڑ پھڑاتا رہا تھا۔ وہ اڑنے کے لیے کس قدر مضطرب اور بے تاب تھا۔ اس کی ننھی ننھی معصوم آنکھوں میں شوقِ آوارگی کی کیا کیا التجائیں تھیں اور اب یہ ذوقِ دہن نے اسے ہمارے ہاتھوں میں اسیر کردیا ہے اور ہاتھ کی انگلی پر بیٹھا یوں مچل رہا ہے' جیسے شاخِ گل پر بیٹھا چہلیں کر رہا ہو۔

پھر وہ دن بھی آتا کہ ہم اس کے پیروں سے دھاگہ نکال دیتے اور ادھ میل کے فاصلے سے پوٹلی دکھاتے اور وہ درختوں پر سے اڑتا ہوا فضاؤں کو چیرتا ہوا سیدھا ہمارے



کندھے یا ہاتھ پر آبیٹھتا اور چہک چہک کر کہتا۔ "لاؤ میرا کھانا کہاں ہے"؟

ہم اپنی کامیابی پر خوش ہوتے کہ اس کی فطرتِ آوارگی کو زیر کرلیا ہے۔

صبح دم تیتر اور چکور کی خوش الحانیوں سے ہمارے گھر میں رحمتوں کا نزول ہوتا۔ سحر خیزی کا سنہری اصول ہم نے یہیں سے سیکھا تھا.........

ہمارے گھر کی عورتیں اٹھتیں منہ ہاتھ دھوتیں۔ پرندوں کے پنجروں میں دانہ پانی ڈالتیں' جگالی کرتی ہوئی بکریوں کو جھنجوڑ کر اٹھاتیں اور ان کے تھنوں سے دودھ دوہتیں۔ دودھ کی پہلی دھاریں کٹورے سے ٹکراتیں تو ایک مترنم آواز کے ساتھ ساتھ تازہ تازہ دودھ کی خوشبو میرے خوابیدہ احساس میں گھل مل جاتی اور میں سوچتا فطرت کس غیر منظم طریقے سے میری روح کی شادابی کا فرض انجام دے رہی ہے۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے میری بہن کبوتروں کے کوئیں سے طباخ اٹھاتی۔ اس "غوں غوں" کرتے ہوئے کوئیں سے ایک پھڑ پھڑاتا ہوا رنگین شعلہ طلوع ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے کوٹھوں کے منڈیروں پر سپاہِ امن کی صفیں بندھ جاتیں۔ میری بہن رات کی باسی روٹی کا بھرا ہوا چنگیر میری گود میں ڈال جاتیں۔ میں اپنے سرخ سلیٹی اور دودھ کی طرح سفید کبوتروں کے بھرے بھرے گول گول جسم اور سرخ سرخ آنکھوں کو پیار سے دیکھتا......... ان کی گردنوں کی دل لبھا دینے والی حرکتوں اور اداؤں سے محظوظ ہوتا اور باسی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتا رہتا۔

جونہی ڈھیری سی بن جاتی۔ کبوتر مچلتے ہوئے میرے سر پر منڈلانے لگتے۔ ان کے خوبصورت پروں کا سنگیت مجھے گدگدا جاتا۔ ایک آدھ قلندر کبوتر میرے شانے پر آکر بیٹھ جاتا۔ میں روٹی کے ٹکڑوں سے مٹھی بھر کر اس کے آگے کردیتا اور وہ بلا خطر چگنے لگ جاتا۔ اس کے دیکھا دیکھی کچھ اور کبوتر اڑ کر میرے ارد گرد بیٹھ جاتے۔ ان کی ملائم ملائم آنکھوں میں جھجک اور قربت کی ملی جلی کیفیت ہوتی۔ وہ ڈرتے ڈرتے آنکھوں میں میری دوستی کا نور لیے چنگیر کی طرف بڑھتے۔

میں پیار سے "آ آ" کرتا وہ ننھے ننھے قدم اٹھاتے۔ فاصلہ بالکل کم رہ جاتا حتیٰ کہ

وہ چنگیر کے پاس پہنچ کر ٹھونگیں مارنا شروع کردیتے.......... منڈیروں پر بیٹھے ہوئے کبوتر ایک ایک کر کے اترنے لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے چنگیر کے ارد گرد کنول کا پھول سا بن جاتا۔ ان کی گردنیں میکانکی انداز میں اوپر نیچے اٹھتیں۔

منٹوں میں چنگیر صفا چٹ ہو جاتی اور وہ اڑ کر دوبارہ منڈیروں پر جا بیٹھتے ایک بہت ہی سفید بے داغ کبوتری چنگیر میں چہل قدمی کے لیے رہ جاتی اور اپنی بھولی بھولی آنکھوں سے بچے کھچے بھورے تلاش کرتی اور ٹھونگیں مار کر دیر سے پہنچنے کی تلافی کرتی..........

اتنے میں میری بہن چائے کا ایک پیالہ اور خمیری باسی روٹی کا پاؤ بھر کا ٹکڑا چولھے پر سینک کر مجھے پکڑا دیتی' جس کا ذائقہ اور مزہ آج تک نہیں بھول سکا۔

اس کے بعد میں تیتر اور چکور کے پنجرے لے کر باہر کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ وہ میرے اشاروں کے اس قدر عادی ہوچکے تھے کہ سیٹی کی بجائے ذرا سی چٹکی بجانے پر پنجرے میں چھاتی تان کر اپنی اپنی بولیاں شروع کردیتے.......... راستے میں کیڑے مکوڑے مار کر کھلاتا۔ یہ ان کا من بھاتا کھاجا تھا۔

جونہی گھر واپس پہنچتا بلبل میری آواز سن کر چہکنے لگ جاتا۔ میں اس کی بے چینی بھانپ کر ہنس پڑتا چنانچہ اس کی تنکوں کی طرح پتلی پتلی ٹانگوں سے دھاگہ نکالتا وہ پھدک کر میرے کندھے پر آ بیٹھتا۔ کندھے سے سر پر اور سر سے ہاتھ پر اس کی میٹھی میٹھی چہک کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا' تا آنکہ کشمش کے حلوے کی پوٹلی اس کے سامنے نہ کرتا.......... وہ دیوانہ وار پوٹلی پر ٹوٹ پڑتا..........

جب اس کا پیٹ بھر جاتا تو اڑ کر بائیں ہاتھ کی مخصوص قلمی انگلی پر بیٹھ جاتا اور کشمش کے خاص حلوے سے لتھڑی ہوئی چونچ کو دائیں بائیں دونوں طرف سے میری کلائی پر رگڑ کر صاف کرتا مجھے اس کی یہ ساری حرکتیں بے حد پیاری لگتیں۔

ابا شام کو تھکے ہارے گھر پہنچتے تو میرے دوستوں کی پرسش احوال ضرور کرتے۔ میں اپنے پالتوں جانوروں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک ادا کا تفصیلی احوال بیان کرتا۔ ابا بہت خوش ہوتے۔ ان کی رائے صرف بٹیر کے متعلق اچھی نہیں تھی کیونکہ وہ کبھی وفا نہیں



کرتا اور انسان دوستی کا کوئی جز اس کے خمیر میں نہیں ہے۔ اس لئے اس کی خدمت کرنا ایسا ہے جیسا کہ ریت میں بیج ضائع کرنا!

لیکن بٹیر کا شکار نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ ایک تو عام طریقہ ہے کہ چار پانچ نوجوان جال لے کر کھیتوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ جال کھیت کے ایک سرے میں لگا دیا جاتا ہے' دوسرے سرے سے ہنکارا شروع ہو جاتا ہے۔ فصل میں چرتے یا آرام کرتے ہوئے بٹیر ہنکارے سے آگے کو چلنا شروع کردیتے ہیں.......... جال کے قریب پہنچ کر گھیرا تنگ کر دیا جاتا ہے اور بٹیروں کا رخ جال کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ جب شکاریوں کو یقین ہو جاتا ہے۔ بٹیر پھیلے ہوئے جال کے اندر داخل ہو گئے ہیں تو وہ پیچھے سے ہلہ بول دیتے ہیں۔ بٹیر گھبرا کر اڑتے ہیں اور جال میں پھنس جاتے ہیں۔

مگر یہ بٹیر کے شکار کا محدود طریقہ ہے۔ بٹیر کا اصل شکار "بلارے" سے کیا جاتا ہے۔ ہمارے قصبے میں دو تین خاندانوں میں "بلارہ" پالا جاتا ہے اور کئی نسلوں سے وہ لوگ اس روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں..........

"بلارہ" اعلیٰ نسل کے ستراسی بٹیروں کے اجتماع کو کہا جاتا ہے۔ ایک ایک بٹیر الگ پنجرے میں بند ہوتا ہے۔ ان کی باقاعدہ تربیت کا کمال یہ ہوتا ہے کہ مالک کے اشاروں پر ایک مخصوص وقت پر مسلسل پٹاخنے لگ جاتے ہیں۔ مجھے "بلارے" کے شکار کی ایسی چاٹ پڑ گئی تھی کہ آدھی رات کو جب "بلارے" والے ہمارے گھر کے قریب سے گزرتے تھے تو میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ میں اٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔

قصبے سے دو تین میل دور کھیتوں کے قریب کوئی موزوں اونچی جگہ دیکھ کر بٹیروں کے پنجرے اکٹھے رکھ دیئے جاتے۔ جال کھول دیئے جاتے۔ اس جال کو "بلارے" والوں کی اصطلاح میں پٹی کہا جاتا ہے۔ ایک پٹی تقریباً" بیس پچیس فٹ لمبی ہوتی ہے چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے بیس بائیس پٹیوں کا ایک بہت بڑا دائرہ لمبے لمبے بانسوں کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا.......... ان بانسوں کے ساتھ رسیاں بندھی ہوتی' جن کو خیموں کی رسیوں کی طرح کھینچ کر لوہے کے کیلوں کے ذریعے زمین میں گاڑ دیا جاتا۔ یوں تمام پٹیاں تن کر کھڑی ہو

جاتیں۔ پٹیوں کے نچلے حصے کو گز بھر باہر کی طرف الٹا کر جیبیں بنائی جاتیں.........

اس طرح جال کا ایک وسیع قلعہ کھڑا ہو جاتا جو تمام تر چھلنی ہوتا۔

میری طرح اور بھی شوق کے مارے ہوئے لڑکے آتے۔ ہر ایک کے حصے میں دو دو پٹیاں آ جاتیں۔ یعنی ان دو جالوں میں پھنسنے والا شکار وہی لڑکا نکالتا جس کے حصے میں وہ جال آتے تھے......... یوں سارے لڑکے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتے۔

ان سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ساعتیں آجاتیں جب "بلارے" کا مالک مخصوص سیٹیاں بجا کر بٹیروں کو پٹاخنے کی ترغیب دیتا۔ بٹیر آہستہ آہستہ بولنا شروع کرتے۔ ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا حتیٰ کہ سارے کے سارے بٹیر پٹاخنے لگ جاتے۔

چاروں طرف کھیت ہوتے۔ سیاہ راتوں میں ان لہلہاتے کھیتوں پر خاموش سمندر کا گماں گزرتا۔

"بلارے" کے بٹیروں کے پٹاخنے کی آوازیں میلوں تک جاتی تھیں۔ کھیتوں اور منڈیروں میں بسیرا کرنے والے آوارہ بٹیر اپنے ہم جنسوں کی اتنی ان گنت آوازیں سنتے تو قومی اجتماع کا بھوت ان کے سر پر سوار ہو جاتا۔ چنانچہ بلا تفریق صنف مادہ اور نر دونوں دور دور سے آوازوں کی سمت پرواز کرتے۔

بلارے کے قریب کے کھیتوں سے بھی فردا" فردا" پٹاخنے کی صدائیں' آتیں گویا پوچھ رہے ہوں......... "دوستو خیریت تو ہے!"

مگر اجتماع کے منجھے ہوئے اور بڑے بڑے لیڈروں کے لچھے دار آوازیں سن کر انفرادی آوازیں دب جاتیں اور مرگ انبوہ جشن دارد کے مصداق وہ بھی "بلارے" کا رخ کرتے۔

میں اچانک چونکتا......... دھپ سے' کھڑے جال سے بٹیر ٹکراتا اور سیدھا جال کی جیب میں گرتا۔ میں لپک کر اسے پکڑتا اور پہلے شکار کے احساس سے سرشار ہو جاتا......... اب یکے بعد دیگرے بٹیروں کا تانتا بندھ جاتا۔ وہ قوت اور تیزی سے آتے......... ٹکراتے جیب میں گرتے اور پھڑ پھڑاتے۔



سب لڑکے اپنے اپنے شکار پر جھپٹتے اور خالی پنجرے بھرنے شروع ہو جاتے۔ بٹیروں کا آنا اور ٹکرانا' ٹکرا کر جیب میں پہنچنا۔ پھڑ پھڑانا' ہمارا جھپٹنا اور پکڑنا......... بس یہی کشش ہمیں کھینچ لاتی تھی.........

اس خوشی کی عمر صرف تیس منٹ ہوتی تھی مگر بٹیروں کا اولوں کی طرح برسنا ایک عجیب کیفیت کا حامل ہوتا تھا۔

شاید میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا......... گولی کی طرح تیز اڑنے والا پرندہ جو ہاتھ آئے تو مٹھی بھر جائے......... شاید خوشی اس بات کی ہو کہ جو ہو رہا ہے' خلافِ توقع ہے۔ گویا گماں حقیقت اور وہمہ یقین بن گیا ہے!

پَو پھٹتے ہی اولے برسنا کم ہو جاتے' بلکہ ایک حد تک ختم ہو جاتے۔ کوئی بھولا بھٹکا بٹیر آتا لیکن طرح دے کر نکل جاتا.........

ہمارے پنجروں میں بند بٹیر چیخ چیخ کرتے اور بے طرح لڑتے کچھ مادہ اور نر حیران کھڑے لڑنے والوں کو دیکھتے' جیسے پوچھ رہے ہوں۔

"بھئی یہ کیا مصیبت ہے"؟

پھر منٹوں میں جال کا قلعہ مسمار ہو جاتا۔ بانس کے ڈنڈے یک جا کر کے باندھ لیے جاتے۔ پالتو بٹیروں کے پنجرے ایک لمبے مضبوط بانس میں پرو دیئے جاتے۔ قیدیوں کی گنتی ہوتی......... روز کی طرح دو ڈھائی سو سے کم نہ ہوتے۔

مالکوں میں سے ایک پٹیاں اٹھاتا۔ دوسرا بانس کا گٹھا' تیسرا لمبے بانس میں پروئے ہوئے پالتو بٹیروں کو شانے پر اس طرح جماتا کہ ترازو کی طرح آدھا بانس آگے اور آدھا بانس پشت کی طرف ہو جاتا۔ چوتھا وہ پنجرہ اٹھاتا' جس میں آج کے شائقین اجتماع اسیر ہوئے ہوتے۔

ہم لڑکے جو صبح کاذب کے تیس منٹوں کے اسیر تھے' گھروں کو چل دیتے۔ ہاتھ خالی ہوتے۔ آنکھیں بوجھل مگر سینہ بھرا بھرا اور دل شاد!

یہ زندگی کا وہ دور تھا کہ لینے اور دینے سے واسطہ نہ تھا مگر ایک ہنگامے پر زندگی موقوف تھی.........!!

گندم کی فصل پک جاتی تو لاکھوں کی تعداد میں چڑیاں شمال کی طرف سے آ جاتیں۔ سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ قبل لوگ چھرےدار بندوقیں لے کر کھیت کی طرف نکل جاتے اور آٹھ نمبر کے کارتوسوں سے بندوقیں لوڈ کر لیتے........

چڑیوں کے ہزاروں کی تعداد میں ڈاریں مختلف سمتوں سے آتیں اور کھیتوں کے منڈیروں میں بیری کے درختوں پر بیٹھ جاتیں۔ شکاری تاک میں رہتے۔ جونہی چڑیاں درخت کی ٹہنیوں پر پاؤں جماتیں' بندوق داغ دی جاتی۔ ایک فائر میں پچاس ساٹھ چڑیاں گرتیں۔ شکاری دوڑ کر پہنچتے' چاقو نکال کر چڑیاں حلال کرتے اور ایک جگہ ڈھیر کرتے جاتے۔

اتنے میں اور ڈاریں آتیں۔ شکاری پیچھے ہٹ کر تیس پینتیس گز کے فاصلے پر دوبارہ مورچہ زن ہو جاتے۔ ڈار بیٹھتی تو ٹریگر دبا دیا جاتا۔ جن کو چھرا لگتا' وہ نیچے گرتیں اور جو چھرے کی زد سے بچ جاتیں اڑ کر فضاؤں میں پھیل جاتیں۔

شام کو جب مرد گھروں کو لوٹتے تو سینکڑوں کی تعداد میں چڑیاں ان کے ہاتھ میں ہوتیں۔ بچے بوڑھے اور عورتیں منتظر ہوتیں........ چڑیاں فوراً صاف کر لی جاتیں اور سیخوں میں پرو کر بھوننے کے لیے انگاروں پر پھیلا دی جاتیں۔ ان کی چربی پگھل پگھل کر دہکتے انگاروں پر گرتی تو خوشبوں سے اشتہا اور بڑھ جاتی۔

گھر کے سارے افراد اپنی اپنی سیخ اٹھاتے اور ایک ایک چڑیا نکال کر ہڈیوں سمیت





چباتے جاتے۔ سیخ میں بھونی ہوئی پہاڑی چڑیا کے گوشت کی لذت وہی لوگ جانتے ہیں' جن کے کام و دہن کبھی اس ذائقے سے آشنا ہوئے ہوں۔

ہمارے علاقے کے پہاڑ جو نمک کی کانوں کے لیے مشہور ہیں۔ ہرن چکور تیتر اور سسی کے لیے بھی ویسے ہی شہرت رکھتے ہیں۔ ہرن کے شکار کا مجھے کبھی موقع نہیں ملا۔ اسی طرح تیتر اور چکور کے شکار میں بھی مجھے مزہ نہیں آیا لیکن سسی کے شکار میں ایسے ایسے تماشے دیکھنے میں آتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

میں اگر جانوروں میں کتے کو جنسی دیوانگی کے سلسلے میں سر فہرست رکھوں گا تو پرندوں میں نر سسی کو پہلا نمبر دوں گا۔ اس کا جنسی جنون دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

گرمیوں میں جب مادہ سسی انڈوں پر بیٹھ جاتی ہے اور سسا اکیلا رہ جاتا ہے تو اس کے وہ پندرہ دن عذاب سے کسی طرح کم نہیں ہوتے جو وہ مادہ کے بغیر گزارتا ہے........وہ کسی چٹان یا ٹیلے پر بیٹھا ہوتا ہے اور مادہ کی جدائی میں "غوک غوک" کی آوازیں نکالتا رہتا ہے........

سسی کا شکار صرف پندرہ دن کھیلا جاتا ہے لیکن اس پندرہ دن کی خاطر شکاری سال بھر مادہ سسی کو تربیت دیتے ہیں........ کامیاب تربیت وہی ہوتی ہے کہ شکاری وقت بے وقت جب چاہے اپنی پالتو سسی کو بولنے پر آمادہ کر سکے۔ چنانچہ اس موسم میں پانچ پانچ چھ چھ شکاریوں کی ٹولیاں اپنی پالتو سسیاں اور گھوڑے کی دم کے بنے ہوئے دام لے کر پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں........ اگرچہ خود میں نے کبھی مادہ سسی نہیں پالی تھی لیکن سسی کے شکاریوں سے ہمیشہ رابطہ رہتا اور جب بھی ایسی ٹولیاں شکار کے لیے نکلتیں میں کسی ٹولی کے ساتھ ضرور ہوتا۔

چونکہ یہ شکار صرف پندرہ دنوں تک کے لیے محدود ہوتا تھا' اس لیے عام طور پر دس بارہ دن باہر رہنے کا مستقل پروگرام بنتا........ چینی' چائے کی پتی' کیتلی' نمک' ماچس' چاقو ایک ایک چادر اور پانی کے لیے ایک دو ہلکے مشکیزے۔ جہاں رات آئی' چادر بچھا دی اور سو گئے۔ دودھ کی جب بھی ضرورت پڑتی' چرتے ہوئے ریوڑ میں سے کوئی بکری پکڑ لیتے

اور دودھ دھو لیتے۔ اس چوری اور ڈھٹائی میں بڑا مزہ ہوتا۔

گوشت کی اتنی بہتات ہوتی کہ روٹی کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ دو تین روز کے بعد روٹی کی اشتہا ہوتی تو ذائقہ بدلنے کے لیے کسی دیہاتی کے گھر سے پکوا کر لے آتے۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے شکار شروع ہو جاتا۔ کسی جھاڑی کے چاروں طرف دام بچھا دیئے جاتے۔ مادہ سسی کا پنجرہ جھاڑی میں چھپا دیا جاتا۔ شکاری پندرہ بیس قدم ہٹ کر کسی چٹان کے اوٹ ہو جاتے۔ سسی تربیت کے مطابق سگنل پا کر بولنے لگ جاتی........ سسا جو کسی چٹان یا ٹیلے پر بیٹھا ہجر کی گھڑیاں گن رہا ہوتا۔ مادہ کی آواز سن کر "غوک غوک" کرنے لگ جاتا اور اگلے لمحے اڑتا ہوا مادہ کے پاس پہنچ جاتا۔

مادہ پر نظر پڑتے ہی پر پھیلا دیتا۔ عجیب سی بے چینی اور بے تابی کا اظہار کرتا۔ وہ جو جانوروں اور پرندوں میں انسان سے بچ نکلنے کا فطری وجدان ہوتا ہے' جنسی غلبے کی نذر ہو جاتا۔ دام کہاں اسے تو انسان بھی نظر نہ آتا........ جونہی جھاڑی میں اٹکے ہوئے پنجرے کی طرف لپکتا ہے' دام میں پھنس جاتا۔ دو تین بار پھڑکتا۔ اتنے میں ہمارا کوئی ساتھی پہنچ جاتا۔ اسے دام سے نکال کر پنجرے میں بند کرتا اور دام کا پھندا دوبارہ کھول دیتا۔

لیکن نر کی دیوانگی کا یہ عالم کہ شکاری پھندا لگا کر ابھی راستے میں ہوتا کہ ایک اور نر دھپ سے وہاں بیٹھ جاتا۔ ایک دو بار "غوک غوک" کرتا اور پھر دام میں پھڑپھڑاتا ہوا نظر آتا........

پندرہ منٹ میں دس بارہ نروں کی گرفتاری بہت معمول بات تھی۔ سسوں کی مسلسل پھڑپھڑاہٹ سے مادہ گھبرا جاتی اور کچھ وقت کے لیے خاموشی اختیار کر لیتی۔ ایسے میں سہمی ہوئی مادہ کی جگہ دوسری مادہ رکھ دی جاتی۔ دوبارہ وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ فراق کے مارے ہوئے دیوانے آتے اور دیوی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے!

ناشتے کا وقت ہو جاتا تو آگ جل جاتی سسیوں کے پنجروں پر کپڑا چڑھا دیا جاتا تاکہ باز اور عقاب کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہو جائیں۔ ایک صاحب چاقو نکالتے بسم اللہ پڑھتے۔ ان کی گردنوں پر چاقو پھیرتے........ بسمل اور اسیر کی پھڑپھڑاہٹ میں تقریباً" ایک



ہی طرح کا کرب ہوتا۔

دوسرا شکاری ان کے پر نوچتا' پیٹ صاف کرتا اور دھو کر آگے بڑھا دیتا' کوئلے دہکتے رہتے۔ کوئی قید نہیں تھی کہ ایک آدمی کتنے سے کھاتا ہے اور یوں سسی کے لذیذ ترین گوشت کا ناشتہ کر کے ہم آگے چل پڑتے۔

شکاریوں میں میرے بغیر ہر آدمی مادہ سسی کی سی آواز نکالنے پر قادر تھا۔ دو تین میل کے بعد یہ لوگ مصنوعی سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس علاقے میں بھی مادہ انڈوں پر بیٹھی ہوئیں ہیں........ جونہی "غوک غوک" کی آواز آتی ہم کیمپ لگا دیتے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے میں تقریباً" ایک مربع میل کے علاقے میں صفایا ہو جاتا۔

دوپہر کو کسی چشمے کے کنارے لنچ ہوتا........ اور پھر پہاڑ کی کسی کھوہ میں دو ڈھائی گھنٹے آرام کرتے........ سورج غروب ہونے سے پہلے پھر شکار شروع ہو جاتا........ شام ہونے تک ہم سینکڑوں سسے شکار کر لیتے........

پہلے دو دن ندیدوں کی طرح بہت بے دردی سے کھاتے پھر آہستہ آہستہ طبیعت میں اعتدال آ جاتا اور آنکھوں کی بھوک بھی تقریباً" مٹ جاتی۔

صبح دوپہر شام تینوں وقت سسی کا گوشت کھانے کے باوجود چار دن کے بعد ہمارے پاس سسیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جاتی کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ ایک آدمی کی ڈیوٹی لگ جاتی وہ زندہ پرندوں کا پنجرہ لے کر قصبے چلا جاتا اور سب شکاریوں کے گھروں میں بانٹ آتا۔ واپسی پر وہ سارے گھروں کی خیریت کے ساتھ ساتھ میٹھی چیزیں اور چلم کے لیے تمباکو لے آتا۔

اور ہم نئے ولولوں کے ساتھ دوبارہ شکار میں مگن ہو جاتے........ آج آدھی صدی کے بعد مجھے یہ سب کچھ خواب و خیال نظر آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ ڈرائینگ روم نے مجھ سے کیا کیا کچھ چھین لیا ہے........ اور یہ کہ تہذیب مجھے کہاں کھینچ لائی ہے اور ترقی کی خواہش نے مجھے پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتار کر شہر کے زمین دوز تہہ خانوں میں بند کر دیا ہے؟

یہی کیا مجھے وہ شامیں اور راتیں اب تک یاد ہیں جن کی پُراسراریت اور تجسس کا خیال اب بھی میرے سینے میں ہلچل برپا کر دیتا ہے........

خرگوش، گیدڑ، لومڑی اور بھیڑیے کے لیے ہمیں کیا کیا اہتمام کرنے پڑتے تھے۔ لگڑ بگڑ اب تو بالکل ناپید ہو چکا ہے، مگر اس زمانے میں خال خال پائے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہمارے شکنجے میں پھنس جاتے تھے۔

شام ہونے سے تقریباً دو گھنٹے پہلے جب کسان کھیتوں میں کام ختم کر کے واپس آجاتے تھے اور ریوڑ گھروں کو لوٹ جاتے تھے تو ہم تین چار لڑکے شکنجے کندھوں پر اٹھائے شکار کے اہتمام میں نکل جاتے تھے۔ پہاڑوں سے کھیتوں کی طرف آنے والی پگڈنڈیاں ہماری منزل مقصود ہوتیں۔

وہ جگہیں جہاں تین چار پگڈنڈیاں ایک دوسرے کو کاٹتی تھیں، شکنجہ لگانے کے لیے نہایت موزوں ہوتیں۔ لوہے کی میخوں سے منٹوں میں گڑھا کھود لیا جاتا۔ شکنجے کی کمانیاں دونوں پیروں کے نیچے دبا کر نہایت احتیاط سے پھندا لگا دیا جاتا اور پھر اسی احتیاط سے شکنجہ گڑھے میں رکھ دیا جاتا۔ اب گھوڑے یا گدھے کی سوکھی لید سے آہنی شکنجے کو چھپا دیا جاتا۔ جب گڑھے کی سطح پگڈنڈی کی سطح پر آجاتی تو پگڈنڈی کی باریک نرم مٹی نہایت محتاط ہاتھوں سے لید کی سطح پر پھیلا دی جاتی۔ یہ کام اس قدر ہوشیاری اور چالاکی سے کیا جاتا کہ مشاق سے مشاق آدمی بھی یہ پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ شکنجے کا گڑھا کہاں کھودا گیا ہے؟

جانور اس قدر حساس ہوتے ہیں کہ اگر ذرا بھی شبہ ہو جائے تو عین شکنجے کے قریب پہنچ کر راستہ بدل دیتے ہیں۔ ایسے واقعات سے ہم عموماً دو چار ہوتے رہتے، خاص کر لومڑی کو دھوکا دینا آسان کام نہیں ہوتا۔

مختلف پگڈنڈیوں پر شکنجے لگ جاتے تو ہم گوشت کے لوتھڑے اور پھیپھڑے نکال لیتے اور پہاڑوں کے دامن تک جانے والی پگڈنڈیوں پر گھسیٹتے شکنجے والی جگہ پر بھی بے حد احتیاط سے پھیپھڑا پھیر دیا جاتا۔

اس عمل سے شکار کو کھینچ لانا بہت آسان ہو جاتا۔ پگڈنڈی پر گوشت کی باس جانور



کو حواس باختہ کر دیتی اور خطروں سے بے نیاز ہو کر تیزی سے وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

شام تک ہم لوگ واپس گھروں میں آجاتے۔

پہاڑوں کی شدید سردی، کہ گھڑوں میں پانی جم جاتا۔ بہتی ندیوں پر بھی کرنگ کی موٹی موٹی تہیں تیرتی رہتیں۔ ہم لوگ شلوار قمیض پر سوتی چادر اوڑھے بھیگے ہوئے شبنمی موسم میں رات کے دو بجے گرم گرم لحافوں کی نیندوں کو خیرباد کہتے اور مہم پر نکل پڑتے........

کتے بھی ہمارے ساتھ ہوتے وہ اس مہم میں ہم سے زیادہ پیش پیش ہوتے۔ منزل پر پہنچ کر سب سے پہلے ہم جانوروں کے نقش پا دیکھتے۔ نقش پا نظر نہ آتے تو ہمارے قدم بوجھل ہو جاتے۔ دور ہی سے شکنجے والی جگہ پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے اگر جگہ صاف ہوتی تو اور کالا دھبہ نظر نہ آتا تو ظاہر ہے کہ قسمت نے یاوری نہیں کی۔

لیکن اگر پاؤں کے نشان نظر آجاتے تو ہمارے قدم سبک ہو جاتے اور کامیابی کی ترنگ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے........ کتے بھی چوکس ہو جاتے کیونکہ آس پاس جانور کی مخصوص باس ہم سے پہلے ان کے حساس نتھنوں تک پہنچ چکی ہوتی۔ بعض دفعہ نقش پا نظر آنے سے پہلے ہی کتوں کی بے چینی دیکھ کر ہمیں علم ہو جاتا کہ شکنجے میں جانور پھنس چکا ہے۔

نقش پا دیکھ دیکھ کر ہمیں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ فوراً ہی معلوم ہو جاتا ہے آج کس جانور کی شامت آئی ہے........

شکنجے کی جگہ خالی گڑھا دیکھ کر ہم خوشی کا نعرہ لگاتے۔ جانور کہیں قریب ہوتا تو نعرہ سن کر ضرور حرکت کرتا۔ ہم آہنی شکنجے کی جھنکار سن کر ادھر دوڑ پڑتے لیکن اگر جانور نڈھال ہو کر دبک جاتا یا دور نکل جاتا تو ہم کھوجیوں کی طرح اس لکیر کو پکڑ لیتے جو شکنجے کی آہنی زنجیر سے بن جاتی تھی۔

غالباً یہی وہ ساعتیں ہوتی تھیں، جن کی خاطر ہم جاڑوں کی لا تعداد گرم گرم نیندیں قربان کر دیا کرتے تھے........

آخر وہ مقام آ جاتا کہ شکنجے کی مانوس جھنکار ہمارے کانوں سے ٹکراتی۔ ہم چونک کر ٹارچ کی روشنی اس سمت پھینکتے........

لومڑی ہوتی تو دور ہی سے اپنی مایہ ناز دم کی وجہ سے پہچان لی جاتی۔ گیدڑ یا بھیڑیا ہوتا تو دم دباتا غراتا اور دانت نکالتا........ خرگوش ہوتا تو بے چارہ سہما ہوا پڑا رہتا۔ اس کی باہر کو ابلی ابلی آنکھوں میں دکھ ہوتا........ کبھی کبھی جنگلی بلا بھی پھنس جاتا۔ یہ شور مچاتا، چیخیں مارتا اور اچھل اچھل کر حملے کی ناکام کوشش کرتا۔ کوئی بھی جانور ہوتا کتے اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ ہم کچھ دیر کے لئے تماشا دیکھتے۔ شکنجے میں پھنسا ہوا درندہ زندگی اور موت کی کش مکش میں تین چار جھپٹتے ہوئے کتوں کا پینترے بدل بدل کر مقابلہ کرتا اور آخردم تک زندگی کے لیے سعی کرتا........

جب کمزور پڑنے لگتا تو ہم کتوں کو پکڑ کر پیچھے ہٹا لیتے اور درندے کی گردن کو ڈنڈے کے نیچے دبالیتے........ اور اس کی تھوتھنی پر چرمی خول چڑھا دیتے۔ جب اس کی تینوں ٹانگیں رسی سے باندھ لیتے تو شکنجے کی کمانیاں دبا کر اس کی زخمی ٹانگ نکال لیتے۔ ایک لڑکا اسے کندھے پر ڈال کر چل پڑتا........

صبح تک ہم گاؤں واپس آجاتے آہنی شکنجوں کی جھنکار سے گاؤں کے کتوں کو ایسا ذہنی تعلق ہو گیا تھا کہ بھونکنا شروع کردیتے۔ بچے سب سے پہلے ہمارے استقبال کے لیے نکلتے۔ جانور دیکھ کر ان کی باچھیں کھل جاتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوان اور بوڑھے بھی پہنچ جاتے۔ لومڑی کی تو بڑی حفاظت ہوتی کہ اس کی کھال بہت قیمت ہوتی ہے۔ اس لئے کتوں کی چیر پھاڑ سے بچ جاتی لیکن گیدڑ اور بھیڑیے کے ساتھ کتوں کی جنگ باقاعدہ ایک روایتی کھیل کی شکل اختیار کر گئی تھی........

گیدڑ کے مقابلے کے لیے ایک کتا اور بھیڑیے کے مقابلے میں دو کتے لائے جاتے۔ جانور کے پاؤں کھول دیئے جاتے اور اس کی تھوتھنی سے چرمی خول بھی اتار لیا جاتا اور اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا۔ وہ زخمی ٹانگ اٹھائے لنگڑاتا ہوا بھاگتا۔ مجمع سے چالیس پچاس قدم دور نکل جاتا تو کتوں کی زنجیریں کھول دی جاتیں۔ کتے دوڑتے اور کچھ فاصلے پر جانور کو گھیر



لیتے........ مجمع بھی شور مچاتا ہوا قریب پہنچ جاتا........ چار پانچ منٹ جانور اور کتوں میں خوب خوب مقابلہ ہوتا۔ گیدڑ تو جلد قابو آجاتا لیکن بھیڑیا زخمی ٹانگ کے باوجود دو کتوں کا بے جگری سے مقابلہ کرتا۔ کبھی کبھی اس کا حملہ نہایت شدید ہوتا۔

عام دیسی کتا اکیلے بھیڑیے کو زیر نہیں کر سکتا تھا........

آخر جب درندے زیر ہو جاتے، ختم ہو جاتے تو گویا اس دن کی مہم بھی کامیابی سے ختم ہو جاتی۔

جس دن خرگوش کے شکار کا پروگرام بنتا۔ بہت رونق ہو جاتی........ دیہاتوں میں جب فصل بوائی اور کٹائی کے دن نہیں ہوتے تو لوگ عموماً فارغ ہوتے ہیں اور پھر ہمارے خٹک قبیلے کے لوگ عام طور پر زندہ دل ہوتے ہیں۔ اس پر خرگوش کا شکار جو تیزی پھرتی اور تجسس کا حامل ہوتا ہے، لوگوں کو کھینچ کر لے آتا تھا........

رنگ برنگے خوبصورت تازی نسل کے کتے جن کی تھوتھنیاں لمبی، ٹانگیں پتلی اور کمریں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں، لوگوں کے لیے بے حد کشش رکھتے تھے۔ اگرچہ تازی کتے نہ لڑنے بھڑنے کی فطرت رکھتے ہیں، نہ ریوڑوں کی حفاظت کرتے ہیں اور نہ گھروں کی رکھوالی کا کام کرتے ہیں۔ شاید قدرت نے اس لیے پیدا کئے ہیں کہ اپنی بے پناہ دوڑنے کی قوت کا مظاہرہ کریں اور شکار پر لپکنے، جھپٹنے اور پھلانگنے کی بے مثال طراری کے کرتب دکھائیں........

تماشائی اونچے ٹیلے یا پہاڑی پر چڑھ جاتے۔ شکاری ٹیلوں کے دامن میں اگی ہوئی جھاڑیوں میں خرگوش تلاش کرتے........ جونہی کوئی خرگوش کسی جھاڑی سے نکلتا، کتے چھوڑ دیئے جاتے۔ بس یہ لمحے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ اونچے ٹیلوں سے یہ نظارہ اور بھی دلفریب ہو جاتا تھا........ متحرک نقطے کی طرح اکیلا خرگوش آگے آگے اور چھ سات تازی کتے متحرک لفظوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے........

یہ سارا عجیب لگتا تھا۔ گویا الفاظ کو یہ احساس تھا کہ نقطے کے بغیر ان کا وجود بے معنی ہے!

کبھی کبھی یہ دوڑ میل ڈیڑھ میل تک لمبی ہو جاتی۔ کوئی کتا قریب پہنچتا تو خرگوش طرح دے کر ایک طرف مڑ جاتا اور کتا تیزی سے آگے نکل جاتا۔ اس کی تیزی اور قوت ٹوٹ جاتی اور خرگوش بہت دور نکل جاتا۔ ہمیں حیرت ہوتی کہ یہ سہا ہوا غریب و مسکین جانور خطرے کے وقت کتنا بیدار اور ہوشیار ہو جاتا ہے اور کس چوکسی سے زندہ رہنے کا جواز اور یقین پیدا کرتا ہے۔

لیکن ہر ذی روح جو اس زمین پر آتا ہے، زندگی کی طرح موت کا ذائقہ ضرور چکھتا ہے........ آخر کوئی کتا اس کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ طرح دیتا کتے کی لمبی تھوتھنی اسے لپیٹ میں لے چکی ہوتی........

کتوں کی گزوں لمبی قلانچوں کی جگہ اب چیر پھاڑ کا کھیل ہوتا اور خرگوش کی نرم نرم کھال اور مہین مہین روئیں، خون میں لت پت ہو جاتیں اور اس کی باہر کو ابلی ہوئی معصوم آنکھوں میں ایک عجیب سی لرزش ہوتی جیسے کہہ رہی ہوں۔

”یہ کیا تھا، یہ سب کیا تھا، ایسا کیوں ہوتا ہے“؟

کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ گھروں کو لوٹ جاتے........

یہی نہیں شکار کی چند اور شکلیں بھی تھیں۔ جب شام کا کھانا کھا کر محلے کے سارے لڑکے ایک جگہ جمع ہو جاتے اور فیصلہ کرتے کہ آج خربوزوں اور تربوزوں کے کون سے باغ کو لوٹنا ہے۔

باغ کا رکھوالا بیچ کھیت چارپائی پر سویا رہتا۔ بندوق اس کے بغل میں پڑی ہوتی۔ لڑکے رینگتے رینگتے باغ میں مختلف سمتوں سے داخل ہوتے۔ رکھوالے کا کتا پائنتی اونگھتا رہتا حالانکہ یہ وقت بھونکنے کا ہوتا۔ ادائیگی فرض کا!

مگر بے چارہ کتا تو نشے میں ہوتا کیونکہ کتے اور باغ کے مالک کا لڑکا تو ہماری ٹولی میں شامل ہوتا تھا۔ وہ سر شام ہی موٹی خمیری روٹی میں افیم چھپا کر اسے کھلا دیا کرتا تھا۔ دوسرے دن کسی اور باغ کا پروگرام بنتا۔ ایسے باغ میں ہم ہرگز نہ جاتے جس کا کوئی جاسوس ہمارے گروہ میں نہ ہوتا........



تب ہم کسی اونچے ٹیلے پر بیٹھ جاتے........ خوب کھاتے، شرارتیں کرتے اور جب پیٹ بھر جاتے تو تربوزوں کے گودے سے ایک دوسرے پر نشانہ بازی کرتے........

ہم اتنا کچھ اٹھا لاتے کہ ڈھیرے کے ڈھیرے بچ جاتے۔ چوری کا مال گھروں میں تو جا نہیں سکتا تھا، بس ٹھٹھا مخول میں سارا ضائع کر دیتے۔ یہ کبھی خیال ہی نہ آتا تھا کہ ضرورت کے مطابق مال اٹھاتے۔ ایسا خیال آسکتا تو پھر چوری نہ کرنے کا خیال بھی ضرور آتا........!

دراصل ہمارے نزدیک یہ چوری نہیں ہوتی تھی، کیونکہ جو لڑکے ہماری ٹولی میں شامل ہوتے تھے، ان میں اکثر باغات کے مالک ہوتے تھے۔ بس اس مہم بازی میں کچھ ایسی بات تھی کہ ہم مختلف شکاروں کے سیزن کی طرح خربوزوں کی چوری کا باقاعدہ سیزن مناتے تھے!

صبح لوگ رفع حاجت کے لئے نکلتے اور ٹیلے پر خربوزوں اور تربوزوں کے کشتوں کے پشتے دیکھتے تو سارا دن قصبے کی منڈی میں ذکر ہوتا کہ آج لڑکوں نے پھر کوئی باغ لوٹا ہے........ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ چوروں کا سراغ کبھی نہ لگتا........ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ چوری روایت کے طور پر نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ کیونکہ آج بھی جب قصبے کی منڈی میں شرفا بیٹھتے ہیں اور ایسی چٹ پٹی خبریں سنتے ہیں، تو غصہ ہونے کی بجائے مسکرا دیتے ہیں........!

یہ وہ دن تھے کہ میں بلوغت کی وادی میں قدم رکھ رہا تھا۔ ایک ہندو لڑکا سوشیل داس جو میرا کلاس فیلو تھا اور دوست بھی۔ سوشیل کا ہمارے گھر اور میرا سوشیل کے گھر آنا جانا تھا۔ سکول کا کام بھی مل بیٹھ کر کرتے۔ میں اس سے حساب سیکھتا تھا اور وہ مجھ سے اردو اور تاریخ میں مدد لیتا تھا۔

اس کا باپ جو پکا کانگرسی تھا، گاؤں کے . . . پینتیس چالیس کھاتے پیتے ہندوؤں میں سب سے زیادہ مالدار تھا۔ ایک دوبار سیاسی قید بھی کاٹ چکا تھا۔ ہم سے کبھی کبھی ”اعلیٰ ہذالقیاس“ قسم کے الفاظ کی املا لکھواتا، جس میں سوشیل رہ جاتا اور میں جیت جاتا۔ تب وہ

خفیف سی ہنسی ہنستا اور سوشیل کو چبھتی باتیں کہتا........

سوشیل کی ماں گوری موٹی انتہائی دھیمے اور اچھے مزاج کی خوش شکل عورت تھی۔ ہمارے علاقے کے ہندو چھوت چھات کے بہت قائل تھے مگر سوشیل کی ماں کے رویے میں میں نے اس طرح کا کوئی احساس کبھی نہ پایا........ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔

رام پیاری سوشیل سے چھوٹی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کا رنگ سانولا تھا اور خدوخال میں بھی دونوں ماں کی بجائے باپ سے زیادہ قریب تھے۔

رام پیاری پہلی لڑکی تھی جس نے میرے معصوم دل میں پیار کی پہلی جوت جگائی تھی........! تب میں محبت اور چاہت کے معنی نہیں سمجھتا تھا........ وہ چھوٹی سی معصوم لڑکی تھی لیکن جب ہماری نگاہیں ٹکراتیں تو کوئی چیز میرے دل میں غوطہ لگاتی اور میں کانپ سا جاتا........ رام پیاری کی سیاہ آنکھوں میں خوف اور خوشی کی عجیب سی وحشت ہوتی۔

وہ بہانے بہانے بھائی کے پاس آتی، کبھی پنسل، کبھی ربڑ اور کبھی روشنائی۔ اس کا ہاتھ بھائی کی طرف بڑھتا اور آنکھیں مجھ پر جم جاتیں۔

میری یہ کیفیت ہوتی کہ ہاتھ لرزنے لگتے اور سبق ذہن سے نکل جاتا........ وہ بھائی سے چیز لے کر جاتی۔ آنکھوں سے اوجھل ہونے سے پہلے ایک بار مڑ کر دیکھتی۔ میں بھی سوشیل سے نظریں بچا کر اس کی طرف دیکھتا۔ وہ نہ مسکراتی نہ ہنستی مگر آنکھوں میں ایسی ملائمت ہوتی کہ میری روح کپکپا جاتی۔

جس دن میں ان کے گھر نہ جاتا تو دس بار اس گلی سے گزرتا........ رات کو بھی اس کی سیاہ آنکھیں میرا پیچھا نہ چھوڑتیں........

انہی دنوں سوشیل کے پتا نے آٹا پیسنے کی مشین لگوائی۔ سوشیل نے سکول چھوڑ کر چکی کا کام سنبھال لیا۔ یوں میرا ان کے گھر آنا جانا ختم ہوگیا۔

مگر سوشیل سے میری دوستی ہمیشہ ہمیشہ رہی۔ وہ اپنی ماں کی طرح دھیمے مزاج کا لڑکا تھا........ سکول سے چھٹی ہوتی تو میں گھر کی بجائے چکی پر جاتا۔ وہ میرا انتظار کرتا پھر ہم



ملائی بھری چائے اکٹھے پیتے........

رام پیاری کو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس گئی تھیں۔

سال ڈیڑھ سال کے بعد سوشیل کو دق ہوگئی۔ اب وہ گھر پر رہتا تھا اور درجنوں دوائیاں کھاتا تھا۔ میں تیسرے دن اس سے ملنے جایا کرتا اور یوں ہر تیسرے روز رام پیاری کے درشن ہو جاتے........

اسے پتہ ہوتا کہ میں نے کس دن اور کس سمے آنا ہے۔ جب بھی دروازہ کھٹکھٹاتا رام پیاری ہی دروازہ کھولتی۔ ایک لمحے کے لیے ہماری آنکھیں ملتیں، وہ مسکراتی اور لجا کر آنکھیں جھکالیتی۔ میں آگے بڑھتا وہ دروازے کو کنڈی لگاتی اور دبے قدم میرے پیچھے پیچھے آتی........

سوشیل کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے مڑ کر اسے دیکھتا، وہ پہلے سے منتظر ہوتی۔ دوبارہ آنکھیں ملتیں۔ وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتی۔ اس کا چہرہ شرم و حجاب کے نور سے تمتما اٹھتا........

میں کانپتے قدموں سے سوشیل کے کمرے میں داخل ہوتا اور اپنے اس پیارے ساتھی پر نچھاور ہونے کو جی چاہتا۔

سوشیل اگر سویا ہوتا تو میں خاموشی سے بیٹھ جاتا مگر وہ عموماً" میرا انتظار کرتا۔ ہم گھنٹوں دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ کچھ لوگ اس کی خطرناک بیماری کا ذکر کرتے اور مجھے وہاں جانے سے منع کرتے مگر مجھے تو بہرحال سوشیل سے ملنا ہی ہوتا۔

تھوڑی دیر بعد رام پیاری آتی اور خشک پھلوں کی ٹرے میز پر رکھ دیتی اور خاموشی سے چل دیتی۔ کمرے کے باہر وہ ایسی جگہ جہاں سے سوشیل اسے نہ دیکھ سکتا۔ بجلی کے کوندے کی طرح ہماری نگاہیں ملتیں۔ ان دو چار لمحوں میں صدیوں کی مسرتیں پنہاں ہوتیں۔

پھر ایک دن اچانک سوشیل ختم ہوگیا۔ قصبے کے ہندو مسلمان سب کو اس کی جوانی کی موت پر شدید افسوس ہوا۔ میں بہت رویا، بہت رویا!

میں ایک بار پھر رام پیاری سے کالے کوسوں دور جا پڑا۔

کچھ عرصہ بعد اچانک جامع مسجد کی بغل والی تنگ گلی میں ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔

میں مسجد سے تلاوتِ قرآن کے بعد گھر جا رہا تھا۔ وہ مندر سے پوجا کر کے گھر آ رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں بوکھلا گئے اور بھول گئے کہ گلی میں کھڑے ہیں........

ڈاک خانہ قریب تھا' کچھ لوگ ادھر سے نکلے تو میں دوبارہ مسجد کی طرف پلٹ گیا۔

رام پیاری ہونٹ چبائے اور سر جھکائے آگے بڑھ گئی۔

رات پھر اس کی سیاہ آنکھیں میری روح کو منور کرتی رہیں۔

اب میں نہایت باقاعدگی سے جامع مسجد تلاوتِ قرآن کے لیے جاتا۔ ایسی جگہ بیٹھتا جہاں سے مندر کا راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ آدھا سپارہ پڑھ کر قرآن مجید کو غلاف میں بند کرتا' چومتا اور نہایت عقیدت سے الماری میں رکھ دیتا۔ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا۔ مگر دل ایک عجیب سی بے قراری اور نغمگی سے سرشار ہوتا کہ دعا کا مفہوم ہی گڈمڈ ہو جاتا اور کوئی واضح صورت سامنے نہ آتی کہ میں خدا سے کیا مانگوں........؟

گو جسمانی بلوغت کی آمد آمد تھی مگر ذہنی بلوغت کا دعویٰ نہیں تھا۔ گناہ اور ثواب کے فلسفے پر یقین رکھتا تھا مگر اس کے باوجود مسجد میں بیٹھ کر مندر کی طرف سے آنے والے قدموں کی چاپ سننے کا منتظر رہتا۔ میرا معصوم دل جو ابھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوا تھا' گناہ کے خوف کے باوجود یہ عقدہ حل نہ کر سکا کہ یہ کیسا احساس ہے جو نیکی اور ثواب کے تصور کی ساری طاقتوں کو مغلوب کر دیتا ہے اور سفید کپڑوں میں ملبوس ایک معصوم لڑکی کے لیے چشم براہ رہتا ہے۔

دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ غیرارادی طور پر گر جاتے۔ میں بے تابی سے اٹھتا کیونکہ دور گلی کی نکڑ سے رام پیاری آتی دکھائی دیتی۔

مسجد کے احاطے سے نکل کر میں گلی کی طرف مڑتا۔ میرا رواں رواں بیدار ہو جاتا اور سینے میں ڈھول بجنے شروع ہو جاتے اور دل حلق میں آ کر اٹک جاتا۔ جس دن ہمارا ستارہ عروج پر ہوتا تو گلی خالی مل جاتی۔ ایک عجیب و غریب کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہم ایک



دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے........

خاموش' متین' خوف زدہ اور سرشار........

ہم کوئی بات نہ کرتے۔ ہم نے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی انگلیوں کے پور تک چھو نہ سکے تھے۔ ہم نے لمس کا ذائقہ نہیں چکھا تھا' لیکن ہماری روحوں نے ایک دوسرے کو چھو لیا تھا۔ وہ ایک دوسری میں تحلیل ہو چکی تھی........

ہم اس طرح ایک دوسرے کو تکتے رہتے۔ اس طرح ایک دوسرے میں گم ہو جاتے' جیسے حیات کا مفہوم یہیں آ کر رک گیا ہو۔

اور کھڑے کھڑے صدیاں بیت گئی ہوں........

تا آنکہ کوئی چڑیا ہمارے سروں پر سے گزر جاتی اور ہم چونک پڑتے۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھ جاتی۔ میں مخالف سمت کو نکل جاتا........

روز یہی ہوتا۔ اس سے ملتی جلتی کہانی........ سوشیل کی موت نے بہن کے جذبات کو ایسا گداز کر دیا تھا کہ وہ روز پوجا کے لئے جاتی۔ پرارتھنا کرتی اور آتما کو شانت کرتی........

میری بھی یہی کیفیت تھی۔ روز کی تلاوت سے چہرہ منور ہو گیا تھا۔ لوگ تھے کہ میرے مذہبی رجحان کی تعریفیں کرتے اور مجھ پر محبتیں اور عقیدتیں نثار کرتے۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ محبت کا نور ہے جو مسجد اور مندر والی گلی میں' دو محبت کرنے والے ایک دوسرے پر انڈیلتے ہیں۔

یہی وہ زمانہ تھا' جب کوڈی (لمبی کبڈی) کے کھیل میں مَیں نے بہت نام پیدا کیا۔ کوہاٹ کے علاوہ بنوں' میانوالی اور کیمبل پور (اٹک) کے اضلاع تک میری دوڑ اور کھیل کی باتیں ہونے لگیں........

مگر مجھے کبھی اپنی اہمیت کا احساس نہ ہوا تھا۔ تعریف سن کر جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی' لیکن اس میں فخر یا غرور کا کوئی پہلو نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرا لڑکپن اور جوانی محبتوں کے جھولے جھولتی ہوئی گزری تھی اور زندگی بہت حسین

تھی.........

انہی دنوں مجھے ایک لڑکے نے بتایا کہ جب میں شام کو بلٹریا کتا لے کر سیر کے لئے نکلتا ہوں تو ایک لڑکی گھر کی دیوار کے منڈیر سے سر نکال کر مجھے تکتی رہتی ہے اور کئی مہینوں سے اس کا یہ معمول بن چکا ہے۔

میں نے بے یقینی کے لہجے میں لڑکے کی تردید کی تو قسمیں کھا کھا کر اس نے میرے سینے میں ننھا سا چور بٹھا دیا۔

دوسرے دن سیر کے لئے نکلا تو تصدیق ہو گئی۔ گہرے عنابی رنگ کے دوپٹے میں گول خوبصورت چہرہ نظر آگیا......... میں نے انگڑائی کی آڑ میں اشارہ کیا تو ادھر سے بھی انگڑائی ہی کے انداز میں جواب ملا اور میرا دل دھک سے رہ گیا!

زرینہ نہایت عالی نسب خاندان کی لڑکی تھی۔ پردے کی سختی سے پابند' میں نے اس لڑکی کو پانچ چھ برس کی عمر میں دیکھا تھا اور یا پھر آج دیکھ رہا تھا......... اس کا شمار گاؤں کی حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا.........

چند دنوں میں ہی ہماری محبت کے چرچے عام ہو گئے.........

ایک رام پیاری کا پیار تھا کہ ہم نے آتماؤں میں چھپا رکھا تھا۔ دوسرا زرینہ کا پیار تھا کہ ذکر یار کا فسانہ عام ہوا۔ تو تہہ در تہہ مسرتوں کا ظہور ہوا......... آج تو شاید میں ان دہری اور سہری محبتوں کی توجیہہ کر سکوں مگر تب میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تھا اور یہ عجیب تھا کہ جواز نہ ہونے کا احساس تو ضرور تھا۔ لیکن ایسا کمزور کہ ہمیشہ ایک تیسری طاقت سے ہار جاتا.........

میری فطرت نے ایسے احساس کو ہمیشہ پاؤں تلے روندا ہے.........!

زرینہ' رام پیاری کی ضد تھی......... بے حد نڈر' دلیر اور محبت کی خاطر مرمٹنے والی لڑکی......... نہ اسے عالی قدر باپ کی پروا' نہ خاندانی وجاہت کا خیال اور نہ دنیا والوں کا ڈر......... بالکل افسانوی کردار.........

اس کا مجنونانہ رویہ مجھے بہت اچھا لگا.........



اور پھر یہ کہ وہ نہایت ہنس مکھ اور خوش باش لڑکی تھی۔ میں جب بھی اس گلی کا پھیرا لگاتا۔ وہ تازہ پھول کی طرح کھلی ہوئی ملتی۔ اس کی پیشانی پر کبھی شکن نہ ہوتی تھی.........

ایک لحاظ سے زرینہ پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے عاشق ہونے کی بجائے محبوب ہونے کا احساس دیا تھا۔ غالباً" یہی وجہ تھی کہ اس کے ساتھ میرا رویہ ہمیشہ ہلکا پھلکا رہا اور وہ گمبھیرتا جو رام پیاری کو دیکھ کر مجھ پر طاری ہو جاتا تھا' زرینہ کے لئے مقدر نہ ہو سکا۔

پھر ایک دن اچانک بالکل غیر متوقع ایک واقعہ ہو گیا......... ہمارے محلے کی ایک لڑکی' جس کی حسین صورت کو گلاب سا مکھڑا یا چاند کا ٹکڑا کہہ دینا کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ قصبے کے سارے لڑکے اور نوجوان اس کے والہ و شیدا تھے اور اس کی ایک جھلک کے لئے ترستے تھے۔ مگر افروزہ کے حسن میں ایسی تمکنت تھی اور اس کی چال ڈھال میں ایسی نخوت تھی کہ کسی کو اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی.........

افروزہ اب دو گھڑے سر پر اور ایک بغل میں لے کر پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھی تو اس کے سرو قد جسم کے زاویے دیکھ کر لوگ دم بخود رہ جاتے تھے اور سانس رک رک جاتے تھے اور جسم پگھلنے لگ جاتے تھے۔

سردیوں کی وہ شام مجھے ابھی تک نہیں بھولی جب ہماری ڈیوڑھی کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ کمرے کے اندر چولہے میں آگ روشن تھی اور ہمارا سارا خاندان چولہے کے اردگرد چٹائیوں پر بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی حیثیت سے ڈیوڑھی کا دروازہ بھی مجھے ہی کھولنا تھا۔

قسمت یاوری کر رہی تھی۔ اندھیری ڈیوڑھی میں پہنچا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے استفسار کیا......... "کون.........؟"

تو ایک شوخ جواب نے میرے سینے میں ہلچل مچا دی۔

"میں ہوں افروزہ' ڈاکہ ڈالنے آئی ہوں گلو' دروازہ کھولو.!"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں بالکل بوکھلا گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں آسمان

زمین پر اتر آیا تھا......... میں نے دروازہ کھول دیا......... وہ ہنس پڑی.........

"نسوار لینے آئی ہوں۔ میرے ابا کے سر میں درد ہے۔"

میرے ابا نزلہ زکام کے مریض تھے اور ناک کی نسوار کا مستقل استعمال کرتے تھے۔ میں نے دروازہ تو کھول دیا تھا مگر غیرارادی طور پر راستہ روکے کھڑا تھا......... وہ پھر ہنس پڑی.........

"ہوش میں آؤ گلو! تم تو راستے میں کھڑے ہو گئے ہو" ؟

میں پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر آ گئی۔

مگر اگلے لمحے میں نے اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیا!

وہ ہنسنے لگ گئی......... اور دبے دبے لہجے میں بولی.........

"چھوڑ دو گلو' چھوڑ دو' کیا کرتے ہو۔"

اور میں نے اسے چھوڑ دیا......... ہم دونوں اکٹھے اندر آئے......... ابا نے اسے نسوار دی اور وہ چلی گئی......... پندرہ منٹ بعد ابا نے مجھ سے کہا۔

"جاؤ بیٹا! ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر آؤ۔"

میں تیزی سے باہر بھاگا......... وہ پندرہ منٹ کیا تھے۔ گویا پندرہ برس کی قید کاٹ کر نکلا تھا.........

مگر افروزہ جا چکی تھی.........

میں سوچے سمجھے بغیر اس کے گھر کی طرف بھاگا مگر ان کی ڈیوڑھی کا دروازہ بند تھا......... چوڑا اور اونچا دروازہ......... جو بڑے بڑے خانوادوں کی حویلیوں میں ہوتا ہے.........

رات بہت تاریک تھی......... ستاروں نے آسمان کا سینہ چھلنی کر رکھا تھا اور ان سے نور کے دھارے بہہ رہے تھے۔ یہ ٹھنڈی اور یخ بستہ رات مجھے موسم بہار کی طرح خوبصورت لگی.........

میں گھر کی طرف پلٹا' گود میں ریشم کے ڈھیر کا احساس لئے ہوئے......... یا خدا' یہ



کیسا لمس تھا؟ کیسا لمس تھا؟

میں نے زندگی میں پہلی بار عورت کے وجود کے لمس کا ذائقہ چکھا تھا.........!

اور وہ جو گلو کہہ کر اس نے پکارا تھا......... زندگی میں پہلی بار کوئی اتنا قریب آ کر مجھ سے مخاطب ہوا تھا......... یہی وہ لفظ تھا جس نے سارے فاصلے مٹا دیئے تھے.........اور میں نے بغیر سوچے سمجھے افروزہ کو گلے لگا لیا تھا.........

میں سوچ رہا تھا گلو کہنے کے لیے افروزہ نے کتنا طویل سفر طے کیا ہو گا۔ کیسی کیسی ذہنی اوراخلاقی اذیتوں کا سامنا کرنے کے بعد یہاں تک پہنچی ہو گی.........

کون جانتا تھا کہ ایک دن باپ کے سر میں درد ہو گا۔ اسے نسوار کی ضرورت ہوگی......... اور نسورا لینے افروزہ ہی آئے گی اور اتفاق سے دروازہ کھولنے والا بھی وہی ہو گا......... جسے گلو کہنے کے لیے جانے وہ کتنی مدت سے انتظار کر رہی تھی.........

"چھوڑ دو گلو' چھوڑ دو۔ کیا کرتے ہو.........!"

کتنا عجیب و غریب احتجاج تھا اور کتنا احمق تھا میں کہ "چھوڑ دو" کے معنی وہی لیے جو کتابوں میں درج تھے......... حالانکہ اس کے معنی بھی وہی تھے' جو گلو کے تھے.........!

چھوڑ دو اور گلو ہم معنی لفظ تھے۔

رات بھر "گلو' چھوڑ دو" کا ارتعاش ندائے گنبد کی طرح میرے وجود میں تھرتھراتا رہا......... اور میں سوچتا رہا.........ایسا پھر کب ہو گا ایسا پھر کب ہو گا.........؟

❖ ❖

صبح میں باہر نکلا۔ افروزہ کی ڈیوڑھی کا اونچا دروازہ کھلا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں سورج کی ترچھی اور نرم شعاعوں کی تپش کے بہانے کھجوروں کے جھنڈ میں کھڑا ہو گیا........ کہ اچانک ننھی منی سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ افروزہ کی چھوٹی بہن تھی اور اس کے ہاتھ میں کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ تھا........

اس نے شرماتے ہوئے رقعہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لڑکی بھاگ گئی' میں نے دیکھا........ افروزہ کی ڈیوڑھی کے دروازے کے ایک پٹ کے ساتھ نیلا آنچل لہرا رہا تھا........

ہاں ........ یہ افروزہ ہی تھی۔ گذشتہ شام اس نے اسی رنگ کا دوپٹہ لیا ہوا تھا.....رقعے میں لکھا تھا........

گلو........! یہ تم نے کیا کردیا؟

میں ساری رات آگ میں جلتی رہی!!

میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ میں خوشی سے کانپ رہا تھا۔ میں نے مسرتوں کا پہاڑ سر پر اٹھا لیا تھا........ وہ سارا دن میں نے گھر کے باہر کھجوروں کے جھنڈ میں گزرا تھا........ افروزہ بار بار نیلا آنچل لہراتی ہوئی' ڈیوڑھی کے دروازے تک آتی........ کبھی مسکراتی' کبھی ہنس پڑتی اور کبھی چاندی کی طرح سفید ہاتھ لہراتی ہوئی ماتھے پر رکھ کر سلام کرتی........

اس دن میں مسجد بھی نہ گیا........ تلاوت نہ کر سکا ........ اور رام پیاری کے درشنوں سے بھی محروم رہا........ زرینہ کا بھی خیال نہ آیا........

دوسرے دن رام پیاری مسجد کی بغل والی گلی میں ملی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو





ٹپ ٹپ گر پڑے........ میں سٹپٹا گیا۔ وہ مضطربانہ ہونٹ چبانے لگی........

غالباً" چار پانچ ماہ کی مسلسل ملاقاتوں میں یہ پہلا ناغہ تھا........

قدموں کی چاپ سن کر میں چونکا۔ کوئی پیچھے سے آرہا تھا۔ میں تیزی سے ڈاکخانہ کی طرف بڑھ گیا........ وہ آدمی اب رام پیاری کے قریب سے گزر رہا تھا اور اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا مگر رام پیاری وہیں کھڑی رہی۔ اس نے نہ آدمی کی طرف دیکھا اور نہ مڑ کر میری طرف........

گلی خالی ہوئی تو میں پھر اس کی طرف چل پڑا........

وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ لپک کر مجھ سے لپٹ جائے گی مگر دوسرے لمحے وہ جھنجلاتی تڑپتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ مسجد کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ جاتی رہی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی........

میں بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ جیسے سیلِ رواں میں سب کچھ بہہ گیا ہو! وہ سارا دن میں نے گھر پر گزارا اور ڈیوڑھی میں بان کی چارپائی پر لیٹا رہا........

شام کی سیر کے لیے بھی نہ نکلا........

اگلے دن میں حسبِ معمول مسجد پہنچا۔ تلاوت کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ مگر مندر سے آنے والا راستہ سونا تھا........ حالانکہ مجھے اس کی آمد کے وقت کا اتنا صحیح اندازہ تھا کہ جونہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ........ ایک آدھ منٹ کے بعد رام پیاری مندر والی گلی کے نکڑ سے نظر آجاتی........ مگر کل کے ناغے کی طرح آج پہلا دن تھا کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے رہے اور قبولیت کا لمحہ نہ آیا........ رام پیاری کی موہنی اور معصوم صورت نظر نہ آئی........

میں پریشان ہو گیا تھا اور پاگل کتے کی طرح کچھ سجھائی نہ دیتا تھا........

دوسرے دن بھی یہی صورت حال رہی........

تیسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا........

چوتھے روز میں زار زار رو پڑا.........

پورے آٹھ دن میں سولی پر لٹکا رہا مگر باقاعدہ مسجد جاتا رہا......... خدا خدا کر کے نویں دن اس سے ملاقات ہوگئی.........وہ اسی طرح سنجیدہ تھی......... بس یہ کہ اس نے ایک رقعہ مجھے تھما دیا اور چلی گئی......... کانپتے ہاتھوں سے رقعہ کھولا۔ لکھتا تھا.........

بھیا کے پیارے

بالکل نہیں جانتے کہ تم مجھے کتنے پیارے ہو۔ بس ایک دن ہی تم نہیں آئے تھے نا' کوئی کام ہو گا۔ بیمار ہو گئے ہو گے۔ کوئی اور......... وجہ بھی ہو سکتی تھی مگر مجھ باؤلی کو دیکھیے۔ بھونچال آگیا تھا میری زندگی میں۔ سینکڑوں وسوسے' ڈھیروں اندیشے اور سیروں آنسو بہہ گئے' اس رات یہ خیال بھی ستاتا رہا کہ بھگوان نے آخر میری نیت کی کھوٹ پالی ہے۔ میں مندر بھگوان کے درشن کرنے تھوڑی جاتی تھی۔ میرے من مندر کا دیوتا تو مسجد کے پچھواڑے سے نکلتا تھا......... شاید یہ بات بھگوان کو بری لگی ہو......... تب میں ڈر گئی تھی اور بھگوان کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی اور گھر میں بیٹھ کر رام اور کنہیا کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی کہ بھول ہو گئی ہے' شما کر دیجیے' نادان ہوں' ناسمجھ ہوں کہ ایک مسلمان منش پر من ہار بیٹھی ہوں مگر میرے اور بھیا کے پیارے آٹھ دن کی تپسیا مٹی میں مل گئی۔ دھرتی اسے چاٹ گئی۔ یہ ایسا پاپی دل ہے' گھڑی میں پھر گیا بالکل باغی ہو گیا نہیں مانتا کیا کروں.........

میں نے دیکھ لیا......... میں نے آزما لیا......... دھرم کی شکتی ہار گئی' من کی شکتی جیت گئی۔ لوگ برا کہیں گے؟ ہاں ہاں کہیں۔ میں تو کہوں گی......... من کی شکتی کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نویں دن گھر سے نکل آئی تاکہ بھگوان کے بہانے تمہارے درشن کر سکوں.........

یہ آٹھ دن کیسے گزرے......... کیا بتاؤں......... آٹھ طبق



روشن ہو گئے......... وہ روتی آنکھوں والا لڑکا جو سوشیل بھیا کو بہت پیارا تھا' جو سوشیل بھیا سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا لیکن جو میرے سامنے کبھی لب نہیں کھولتا تھا۔ جو آنکھوں آنکھوں میں سندیسہ دیتا تھا۔ آنکھوں سے امرت پلاتا تھا......... بہت یاد آیا......... اتنا یاد آیا......... اتنا من پر چھایا کہ جاؤں دیکھوں۔ وہ گھر دیکھوں جس میں ایک بھولا سا لڑکا رہتا ہے۔ اس کی بہناں سے ملوں۔ اس کے بھیا سے ملوں۔ اس کے پتا کے چرن چھوؤں۔ اور پھر لوٹ کر نہ آؤں۔ میکہ بھول جاؤں......... مندر بھول جاؤں۔ سب کچھ بھول جاؤں بس......... بسے تو تو ایک بھولا سا لڑکا من میں۔ وہ دبلا سا' لمبا سا' وہ روتی آنکھوں والا۔ جو بات نہ کرے مگر آنکھوں آنکھوں سے من میں جا گھسے اور آتما میں جا بیٹھے.........

میں ہار بیٹھی ہوں گل جی' مجھے اپنے پاس بلا لو۔ ان پہاڑوں سے پرے اور ان پربتوں سے بھی دور' کوہ سفید کے دامن میں' جہاں قبائلی سورما بستے ہیں۔ جہاں کوئی فرنگی نہیں پہنچ سکتا' جہاں کوئی ہندو نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں قانون اور دھرم کی کوئی طاقت مجھے تمہاری آنکھوں سے دور نہیں رکھ سکتی.........

گل جی' میرے شریر میں ہندو استری کی آتما ہے۔ اپنے پیار کے لیے مرنا جینا میری گھٹی میں شامل ہے۔ میں تم پر قربان ہونا جانتی ہوں' گل مجھے بلا لو گل کل' پرسوں جو انتظام کرنا ہے کر لو کہ اب تم بن رہا نہیں جاتا.........!

رام پیاری کا خط پڑھ کر میں بالکل حواس باختہ ہوگیا.........

فوری طور پر مجھے یوں لگا کہ دنیا کا سب سے قیمتی راز میرے پاس ہے......... اور اگر یہ راز فاش ہوگیا تو پلک جھپکنے میں یہ دنیا فنا ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی گھبراہٹ میں کھیتوں کی طرف بھاگا۔ کھیتوں میں خطرے کا احساس نہ ٹلا تو پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ ایک چٹان کی اوٹ بیٹھ کر پناہ لی۔ رام پیاری کا خط نکالا۔ پڑھا' اتنا پڑھا۔ اتنا پڑھا کہ از بر

ہوگیا۔ جب از بر ہوگیا تو میں نے وہ خط چور چور کر دیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوا میں اڑا دیئے۔ تب میں بہت رویا، بہت رویا، دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ تو از بر کی ہوئی کویتا گنگنانے لگ گیا۔ مجھے بے حد سکون محسوس ہوا۔

مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ شاعری میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ رام پیاری کو معلوم نہیں تھا مگر در حقیقت وہ شاعرہ تھی۔ عظیم شاعرہ........!

گھر واپس آیا تو کسی سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ میں خوف زدہ تھا، اس جرم سے جو ابھی مجھ سے سرزد نہیں ہوا تھا........

رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو مجھے طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ تین لڑکیوں سے محبت کر کے میں جس کیفیت اور لذت سے آشنا ہوا تھا۔ میرے نزدیک یہی محبت تھی، یہی زندگی تھی اور یہی زندگی کی مسرتیں تھیں۔ لیکن رام پیاری کا خط پڑھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ محبتوں کا انجام یوں بھی ہوتا ہے........

یوں لڑکیاں زندگیاں نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔

یوں لڑکیاں دل، دماغ اور دین سے بے گانہ ہو جاتی ہیں۔

یوں لڑکیاں مردوں کا امتحان لیتی ہیں۔

اور یوں لڑکیاں مردو ں کے کندھوں پر ذمہ داریاں ڈال دیتی ہیں........

مگر میں مرد کہاں تھا میں تو لڑکا سا تھا، ڈرپوک سا، بزدل سا۔ میں نے کوہ سفید کا نام جغرافیے میں پڑھا تھا........ دور سے یہ پہاڑ نظر بھی آتا تھا مگر وہاں تک جانا بھی ہو گا، یہ کبھی نہ سوچا تھا۔ ایک ہندو لڑکی کو ساتھ لے کر میں ان پہاڑوں اور پربتوں کے اس پار کا سفر کر سکوں گا۔ میری سوچوں کی پرواز میں ایسی وسعت پیدا نہ ہوئی تھی اور پھر یہ کہ اس وقت میں نے دنیا کے کلاسیک رومانوں کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ نہ تیشۂ فرہاد کے ضرب کی گونج سنی تھی اور نہ ناقۂ لیلےٰ کی گمشدگی کی اطلاع پائی تھی........

ابا کی بے پناہ محبت نے مجھے معاشرتی مریض بنا دیا تھا۔ ان کے سامنے گستاخی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کی بے پناہ دوستی اور توجہ ہی کا نتیجہ تھا کہ میں ان سے لاڈ تو کر سکتا تھا،



مگر اپنی کسی حرکت سے انہیں دکھ نہیں پہنچا سکتا تھا........

میں انہیں کیسے کہتا........ کہ ایک ہندو لڑکی سے محبت کرتا ہوں جبکہ یہ فعل اس صدی کے تیسرے چوتھے عشرے میں گردن زدنی کے مترادف تھا۔

میں انہیں کیسے کہتا کہ کوہ سفید کے دامن تک پہنچنا چاہتا ہوں کہ میں ان کا لاڈلا تھا۔ اور یہ جان جوکھوں والا مسئلہ تھا........

میں انہیں کیسے کہتا........ کہ ایک لڑکی کے اغواء میں ہاتھ بٹائیں کہ یہ باپ بیٹے میں حجاب کا سوال تھا اور مروجہ اقدار کی نفی........

جو ہونا تھا۔ وہی ہوا........ میں نے مندر سے مسجد کی طرف آنے والی گلی کا پھیرا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا........

رام پیاری پر کیا گزری۔ نہیں جانتا۔ البتہ وہ زندہ رہی تا آنکہ ملک کا بٹوارہ ہو گیا اور وہ اس دیس سے چلی گئی۔ جس دن ہندوؤں کا قافلہ ہمارا گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا، اس دن سب لوگ انہیں الوداع کہنے کے لیے نکل آئے تھے۔ ایک میں ہی تھا کہ گھر سے نہ نکلا کہ رام پیاری کا سامنا نہیں کر سکتا تھا........

کبھی کبھی سوچتا ہو ں کہ میں جو ابا کی زندگی میں عضو معطل تھا، بالکل لاڈلا اور ناکارہ۔ اگر ابا زندہ ہوتے اور میں وہی آدمی ہوتا جو ابا کی موت کے بعد ثابت ہوا یعنی میری ساری سرکشیاں اور تمام صلاحیتیں ابا کی موت کے بعد سامنے آتیں تو میری زندگی کا رخ شاید کچھ اور ہوتا........ پھر میں کوہ سفید کے دامن تک بھی ضرور پہنچ جاتا اور رام پیاری میری بیوی ہوتی۔

یہ عجیب سا تصور ہے جو زندگی کے ہر عشرے میں مجھے کبھی کبھی پریشان کرتا رہتا ہے........

اب زرینہ تھی اور افروزہ........ میں اپنی افتاد طبع کے مطابق دونوں سے مخلص تھا۔ زرینہ رام پیاری سے زیادہ خوبصورت تھی اور افروزہ ان دونوں سے زیادہ حسین تھی۔ مگر میرے دل میں تینوں کی جو درجہ بندی ہوئی تھی، وہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہ تھی۔

رام پیاری ایسی روح تھی کہ لپک کر سامنے آجاتی تھی اور دونوں پر سایہ کر دیتی تھی........

وقت گزرتا گیا.رام پیاری بیچ میں سے نکل گئی۔ اب میں کبھی زرینہ کی طرف لپکتا........ کبھی افروزہ کی طرف........ کبھی ایک اچھی لگتی کبھی دوسری........ لیکن ان دونوں سے ملتے ہوئے ایک احساس جرم مجھے پریشان کرتا رہتا۔ یہ بہت نازک سا احساس تھا' جس پر کبھی میں غالب آجاتا تھااور کبھی یہ احساس مجھ پر غالب ہو جاتا تھا۔

اول یہ کہ رام پیاری سے رشتہ نہ رہا تو اب آئندہ ثابت قدمی کا دعویٰ کیا معنیٰ؟

دوم یہ کہ جب میرے سینے میں ایک دل ہے تو میں دو دلوں کا دعویٰ کیوں کر رہا ہوں؟

مگر یہ عجیب تھا کہ اگر ایک طرف میں ابا کی محبتوں کی وجہ سے تہذیبی قیدی بن گیا تھا تو دوسری طرف لڑکیوں سے محبت کے سلسلے میں تمام اقدار منہ دیکھتی رہ جاتی تھیں........ اور میں آگے بڑھ جاتا تھا........

زرینہ اور افروزہ کی محبت کے قصے عام ہو گئے تو کچھ اور لڑکیوں نے بھی تانک جھانک شروع کر دی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لڑکیوں کی اس توجہ میں زرینہ اور افروزہ سے حسد یا چشمک کا جذبہ کام کر رہا تھا یا میری شہرت کو دخل تھا یا واقعی مجھ میں لڑکیوں کو پسند آجانے والی طرح داری اور انداز موجود تھے؟

بہرحال جو بات بھی تھی' میں اس تاک جھانک پر مسکرا ضرور جاتا تھا اور میرے کسی منفی جذبے کی تسکین ہوتی تھی لیکن قصبے میں کسی چوتھی لڑکی سے متاثر نہ ہوا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد جب تک گاؤں میں رہا کسی اور رومان کی ضرورت محسوس نہ کی........

میرا بڑا بھائی جو بے حد جذباتی آدمی تھا' احمقانہ حد تک عملی آدمی بھی تھا۔ گو ابا اسے بھی بہت چاہتے تھے مگر وہ میری طرح ابا کی محبتوں کا غلام نہیں بن سکا تھا۔ اس کے کردار میں مجھ سے مختلف قسم کی ناپختگی تھی۔ جلد بازی میں وہ سب کام کر جاتا تھا جو میں کم از کم ابا کی زندگی میں کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا........



وہ شادی شدہ تھا۔ دو تین بچوں کا باپ تھا مگر جب ایک نیا رومان اس کی زندگی میں در آیا تو اس نے آگے پیچھے نہ دیکھا اور ہرچہ بادا باد کے مصداق لڑکی اغوا کر کے لے گیا۔

میں جو کوہ سفید کے دامن تک نہ پہنچ سکا تھا پہنچنے والا پہنچ گیا!

اور لڑکی بھی اس شخص کی' جس کے نام سے علاقے کے بڑے بڑے جی داروں کے کلیجے پانی پانی ہو جاتے تھے........ وہ نہایت تند خو بہادر اور انتقام نہ بھولنے والا آدمی تھا۔ میرے والد جن کی شرافت اوردیانت مشہور تھی........ بھائی کی اس حرکت سے سخت شرمندہ اور پریشان تھے۔ لوگ ان سے ہمدردی جتا رہے تھے اور اس شک کا اظہار کر رہے تھے کہ لڑکی کا سرکش باپ کسی وقت بھی وار کر سکتا ہے؟

لیکن ساڑھے چھ فٹ کے اس قد آور آدمی کا رویہ لوگوں کی خیال آرائیوں سے حیران کن حد تک مختلف نکلا۔ اس نے کہا........

میں "بھگوڑوں کی تلاش میں ہوں۔ میں دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مجھ سے بچ کر جا بھی نہیں سکتے لیکن میں میاں ابراہیم کے باقی خاندان سے تعرض نہیں کروں گا کہ وہ شرفاء کا گھرانہ ہے!"

گرمی کا موسم تھا........ ہم جو حفظِ ماتقدم کے طور پر اس واقع کے بعد اندر سونے لگ گئے تھے' صحن میں نکل آئے۔ اور پہرے بھی ہٹا دیئے........ کیونکہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ لفظ ایک بہادر آدمی کی زبان سے نکلا تھا!

لڑکی کے بھاگ جانے سے پورے علاقے میں اس کی جو بدنامی ہوئی تھی' میرے والد کسی حد تک اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوراً" ایک قطعہ زمین تین ہزار کے عوض بیچنے کا بندوبست کیا۔ تیسرے چوتھے عشرے کے تین ہزار آج کے پچاس ہزار کے برابر تھے ........ انہوں نے علاقے کے دستور کے مطابق دنبے اور جرگے کا بھی اہتمام کیا۔

جس طرح قتل کے واقعات میں خون بہا دے کر راضی نامہ کیا جاتا ہے اسی طرح

اخلاقی جرائم کے سلسلے میں جرگہ اور دنبہ بھیجنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے.........

گویا ہم شرمندہ ہیں۔ خطا مانتے ہیں اور معذرت کرتے ہوئے آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔

خلافِ توقع لڑکی کے باپ نے ہماری معذرت قبول کر لی......... دنبہ ذبح کر کے اراکین جرگہ کو کھلا دیا گیا۔ تین ہزار روپیہ چونکہ زمین کی رجسٹری کے بعد ملنا تھا۔ اس لئے اس کی ادائیگی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

لیکن ابھی یہ روپیہ ادا نہ ہوا تھا کہ ایک رات یہ بہادر شخص قتل کر دیا گیا۔ پورا قصبہ وہاں جمع ہو گیا۔ تھری ناٹ تھری کی چھ گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو چکی تھیں۔

ایک ہنگامہ تھا جو آدھی رات کو برپا ہو گیا تھا۔ اس کے گھر کی ایک دو ناسمجھ عورتوں نے بین کرتے ہوئے' میرے بھائی کو کوسا کہ قاتل وہی ہے کچھ اور لوگوں نے بھی شک کا اظہار کیا۔ گویا ہم لوگوں نے خوف زدہ ہو کر اسے قتل کر دیا ہے.........؟

لیکن مقتول کی بیوی جہاندیدہ عورت تھی۔ اس نے گھر کی عورتوں کو ڈانٹا' خاموش کرایا......... اور جب پولیس پہنچ گئی تو ابتدائی رپورٹ میں ملزموں کی جو فہرست سامنے آئی۔ ہمارے خاندان میں سے کسی کا نام اس میں شامل نہیں تھا۔

دراصل یہ قتل ایسے موقع اور ایسے وقت پر کیا گیا تھا کہ لازماً توجہ ہماری طرف مبذول ہو جانی چاہیئے تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جن لوگوں پر قتل کا دعویٰ ہوا تھا.........وہ بھی عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گئے.........

بہر حال خدا بہتر جانتا ہے کہ قاتل کون تھے.........؟

اب مسئلہ ان تین ہزار روپوں کا تھا جو "ننواتی" (صلح بندی) کی بنیاد پر دینا تھا۔

بہت سے لوگوں نے میرے ابا کو رائے دی .........کہ.........

"خطرہ ٹل گیا ہے ......... اب روپیہ دینے کی ضرورت نہیں ہے"۔

کسی نے کہا......... "زمینیں بیچ کر لوگ شادیاں نہیں کرتے۔"

کسی نے کہا......... "خس کم جہاں پاک"۔



مگر ابا نے اپنوں پرایوں اور دوستوں میں سے کسی کی بھی نہ سنی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا.........

"میں روپیہ دینے کا قول دے چکا ہوں۔ میں لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دوں گا کہ ابراہیم جیسے ایک سرکش آدمی کے خوف سے روپیہ دینے کی حامی بھری تھی لیکن جب وہ آدمی مرگیا تو خود اس کا قول بھی مرگیا.........!"

چنانچہ ابا نے تین ہزار روپیہ اس کی بیوہ کو دے دیا.........

اور وہ لڑکی جو اس وقت پندرہ سولہ برس کی تھی' آج چھ سات بچوں کی ماں ہے اور میری بھابی ہے.........!

لیکن میں جو اس سے پہلے رام پیاری کو کھو چکا تھا۔ والد کی زندگی تک اسی طرح روایتی بزدل بنا رہا حالانکہ میرے ابا کی ایسی ساکھ تھی کہ زرینہ اور افروزہ دونوں میں سے جس کا رشتہ بھی مانگا جاتا' آسانی سے مل سکتا تھا ......... مگر میں چپ رہا۔ رومان کے چسکے لیتا رہا......... اور بنیادی بات نظر انداز ہوتی رہی......... نہ خود ابا سے ذکر کر سکا اور نہ کسی دوسرے کی زبانی کہلوا سکا۔حتیٰ کہ ایک دن چپکے سے ایسی لڑکی سے میری منگنی ہو گئی جس سے ذہنی اور قلبی طور پر میں کوسوں دور تھا۔

لیکن ابا کے سامنے زبان نہ کھل سکی......... میں اف تک نہ کر سکا.........

ایک بے حد وحساب محبت کرنے والے مہربان باپ نے اک بے حد پیارے بیٹے کو نہایت سادگی سے روایات کے جہنم کدے میں دھکیل دیا تھا.........!

میری منگنی کا گڑ افروزہ اور زرینہ کے گھروں تک بھی پہنچ گیا تھا......... افروزہ نے کہرام مچا دیا تھا۔ ہر دو گھنٹوں کے بعد اس پر جنوں کے دورے پڑنے لگ گئے تھے۔

یہ دورے ایسے والہانہ ہوتے تھے کہ وہ کپڑے پھاڑ ڈالتی تھی۔ بال نوچ ڈالتی تھی اور بمشکل چار پانچ آدمی اسے قابو کرتے تھے۔ شروع شروع میں جنوں کے دوروں میں بڑی شدت رہی......... لیکن کچھ عرصہ بعد ان کی شکل بدل گئی.........

اب میرے لیے باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ جونہی باہر نکلتا اور افروزہ کی نظر

پڑتی تو فوراً" جن پہنچ جاتے اور افروزہ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ گر پڑتی اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتی۔ میں ڈر کے مارے کھجوروں کے جھنڈ میں چھپ جاتا یا دبک کر گھر کے اندر چلا جاتا........ میری بہن اور بھابیاں ہنستیں بڑی بھابی فقرہ چست کرتی........

"برقع پہن کے نکلا کر لڑکے' برقعہ!"

میں جھینپ جاتا وہ ہنستی رہتیں........

لیکن اس کے برعکس زرینہ سے ملاقات ہوئی تو وہ اسی طرح ہشاش بشاش ہنستی کھیلتی ہوئی ملی........ منگنی کی مبارک باد دی تو میں نے پوچھا........

"تمہیں دکھ نہیں ہوا؟"

وہ اپنی فطری خوش دلی سے بولی........

"آپ نے تو مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکی افروزہ کو نظر انداز کر دیا۔ بھلا مجھے گلہ کیوں ہو؟"

میں نے افسردگی سے کہا........

"دراصل تم دونوں نظر انداز نہیں ہوئیں۔ تقدیر نے مجھے نظر انداز کر دیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی........

"میں تو خیر تبھی بازی ہار گئی تھی' جب افروزہ آپ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی لیکن ہوں تو آپ کی باندی' دیکھ لینا۔ جب کوئی آپ کے ساتھ نہیں ہو گا' زرینہ آپ کے ساتھ ہو گی۔ کیونکہ میں نے تو عمر کے ساتویں برس سے آپ کو چاہنا شروع کر دیا تھا اور نیک نامی کی حد تک آپ کے لیے بدنام ہوئی ہوں........؟"

زرینہ کی باتیں اس کے ہنستے ہوئے چہرے کی طرح صاف اور ستھری ہوا کرتی تھیں۔ جس طرح اس کے روشن چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا' اسی طرح اس کی باتوں میں بھی کوئی الجھن نہیں ہوتی تھی۔ اسے صرف پیار کرنا آتا تھا اور اس پیار کے لیے بچھ بچھ جانا اس کی فطرت تھی........

سردی کے موسم میں جب افغان قبیلے جنہیں سرحد میں ژندران' خلجی' پاوندے اور



کوچی جیسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے' سرحد کے مختلف علاقوں میں پھیل جاتے تو حسن کی دنیا میں اور اضافہ ہو جاتا........

ان کے مرد یا تو محنت مزدوری کرتے یا مال مویشی چرانے پہاڑوں کی طرف نکل جاتے۔ بوڑھی عورتیں اور مرد بچوں کے ساتھ گھروں میں رہتے اور جوان لڑکیاں دونوں وقت گھر گھر بھیک مانگ کر کنبے کے لیے روٹیاں جمع کرتیں ........شام کو سارا کنبہ جمع ہو کر مختلف گھروں سے اکٹھے کئے ہوئے مکئ' گیہوں اور باجرے کے سوکھے ٹکڑے لسی یا چٹنی کے ساتھ کھاتے........

یوں تو یہ مانگنے والی لڑکیاں محلے محلے بھیک مانگتی نظر آتیں لیکن ان میں ایسی نخوت اور تمکنت ہوتی کہ آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا۔ سر تا پا سیاہ لباس میں ملبوس یہ سرخ و سفید کشیدہ قامت لڑکیاں' بالکل تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح شگفتہ ہوتی تھیں........

جب یہ خیرات کے ٹکڑوں کے لیے دامن پھیلاتیں تو ان کی آنکھوں میں حیاو حجاب کا ایسا حسن سمٹ آتا کہ انسان بکھر بکھر جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی بڑی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور شہزادیوں کے ہاتھ میں انتقاماً کشکول دے دیئے گئے ہیں........

اور پھر یہ نہیں کہ ایک آدھ ہی خوبصورت ہو' غول کا غول ہی محل سرا سے نکالا ہوا لگتا تھا اور یہ بھی نہیں کہ ان میں سے کوئی لڑکی کسی مقامی لڑکے کے ہاتھ لگ جائے۔ وہ ہزار بھیک مانگیں' روٹی کے ٹکڑے کے لیے بے شک دامن پھیلائیں مگر دولت' امارت کسی کی کوئی ترغیب ان کے پائے استحکام میں لرزہ پیدا نہیں کر سکتی تھی........

یہ ان کے تمدن یا تربیت یا ماحول کا اثر تھا یا اظہار کا عجز تھا کہ رومانیت ان کی زندگی سے نکل گئی........ یا شاید دب گئی تھی۔

جب سردیاں ختم ہو جاتیں اور ان کے قافلے لوٹ جاتے تو عجیب سا احساس ہوتا' جیسے یہ دنیا خالی خالی ہو گئی ہے........!

انہی دنوں مجھے مطالعہ کا بھی چسکہ پڑ گیا تھا۔ چھپا ہوا کوئی کاغذ' رسالہ یا کتاب ہاتھ لگ جاتی تو "الف" سے "یے" تک پی جاتا........ پشتو کی بہت سی لوک کہانیاں پڑھ

ڈالیں۔ خوش حال خان خٹک اور رحمٰن بابا پر بھی ہاتھ ڈالا......... ان دنوں خٹک کی بالکل سمجھ نہ آئی مگر رحمٰن بابا کا تو دیوان ہی از بر ہوگیا......... رحمٰن بابا ایسا عجیب و غریب شاعر ہے کہ ان پڑھ پٹھان بھی نہ صرف اس کے شعروں سے محظوظ ہوتا ہے بلکہ بے ساختہ پھڑک اٹھتا ہے اور بڑے بڑے سکالر بھی اس کے اتنے ہی معترف ہیں' جتنا ایک عام پٹھان.........

ہر ذہن کے سطح کا آدمی رحمٰن بابا کے شعروں سے اپنے مطلب کا مفہوم پا لیتا ہے اور پشتو کے ہر علاقے اور ہر لہجے کا پٹھان بابا کے شعروں سے تسکین پاتا ہے.........

بہت بعد میں نے جب خٹک کو دوبارہ پڑھا تو اس کی عظمت کا احساس ہوا۔ اس کا لہجہ اس کی للکار اس کی رومانیت' اس کی گہرائی اور گیرائی' اس کے مشاہدے کی وسعت اور فنکارانہ دسترس کہ صدیوں میں کوئی پیدا ہو!

لیکن جو بے ساختگی' جو نغمگی' جو شعریت رحمٰن بابا کے حصے میں آئی ہے' شاذ و نادر ہی کسی شاعر کا مقدر بنتی ہے......... حجروں میں اور عام محفلوں میں رحمٰن بابا کا کلام کوڈ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور بعض لوگ تو ان کے دیوان سے فال نکالتے ہیں.........

ہر پٹھان کو جہاں چند ٹپے یاد ہوتے ہیں' وہاں رحمٰن بابا کے اشعار بھی از بر ہوتے ہیں اور موقع بموقع سند کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب انقلاب زندہ باد کے اکا دکا نعرے سنائی دینے لگ گئے تھے ......... میں ابا سے انقلاب کے معنی پوچھتا تو وہ جواب دینے سے قاصر رہتے تھے.........

جامع مسجد کے امام مولوی شیر خان مرحوم انگریزوں کے خلاف زور دار تقریریں کرتے تھے' وہی ہمارے علاقے میں کانگرس کے صدر تھے۔ مولوی شیر خان مرحوم بادقار اور بارسوخ آدمی تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی بہت سے مسلمان کانگرس میں شامل ہو گئے۔ ہندو تو پہلے ہی اس تحریک کے ساتھ تھے.........

دیکھتے ہی دیکھتے سرخ پوش تحریک اس قدر زور پکڑ گئی کہ بہت سے بوڑھوں اور جوانوں نے اپنے سفید کپڑے رنگ لیے اور پٹیاں باندھ کر باقاعدہ پریڈ ہونے لگی۔ یہی



زمانہ تھا' جب سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان پہلی اور آخری بار ہمارے گاؤں آئے۔ ان دنوں سڑک نہیں بنی تھی اور ہمارے گاؤں تک بائیس میل کا پہاڑی راستہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔

یہ پورا قافلہ گھوڑوں پر ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ پہنچا تھا.........

بادشاہ خان کے ساتھ اور بھی بہت سے چیدہ چیدہ لوگ تھے' جن میں قاضی عطا اللہ مرحوم اور پیر شہنشاہ مرحوم کے نام مجھے یاد ہیں......... جامع مسجد میں بہت بڑا جلسہ ہوا......... اس جلسے کو سب سے آخر میں بادشاہ خان نے خطاب کیا تھا۔ ان کی غیرمعمولی شخصیت اور غیر معمولی تقریر آج بھی میرے دل پر نقش ہے......... یہ پہلا سیاسی جلسہ تھا' جس میں مَیں اپنے خام ذہن کے ساتھ شامل ہوا تھا.........

بادشاہ خان کے جانے کے بعد تحریک میں اور زیادہ جان پڑ گئی اور صبح و شام پریڈیں ہونے لگیں مگر چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک رات اچانک پولیس نے گرفتاریاں شروع کردیں۔ سرخ پوش تحریک پر پابندی لگ گئی تھی.........

مولوی شیر خان مرحوم رام پیاری کے پتا لالہ سیوارام اورموچی گل شیر مرحوم کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ گرفتار ہو گئے۔ پولیس نے چھاپے مار کر سرخ کپڑے برآمد کر لیے اور بیچ میدان میں آگ لگا دی.........

جن لوگوں نے معافیاں مانگ لیں' انہیں رہا کردیا گیا اور جنھوں نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا' انہیں سال چھ مہینے کی سزا ہوگئی......... قید ہونے والوں میں مولوی شیر خان لالہ سیوارام اورموچی گل شیر نے پوری قید کاٹی.........

جن لوگوں نے معافیاں مانگی تھیں' شرم کے مارے کافی عرصے تک گھروں میں بند رہے کیونکہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے.........

میری عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی ہوگی' جب مڈل کے امتحان کے لیے ہمیں لاچی جانا پڑا۔ ہم کل چار لڑکے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں گاؤں سے باہر نکلا تھا۔

نتیجہ نکلا۔ ہم چاروں پاس ہو گئے تھے میرے اور میرے ایک قریبی رشتہ دار محمد

یٰسین جو بعد میں ایس ڈی او ہو گئے تھے' دونوں کا آٹھ روپیہ ماہوار وظیفہ لگ گیا تھا۔ اب ہائی سکول کے لیے ہمیں کوہاٹ داخلہ لینا تھا۔ ہم دونوں بضد تھے کہ تعلیم حاصل کریں لیکن ایک بار پھر میرے سادہ دل باپ کی محبت آڑے آئی۔ انہیں میری جدائی گوارا نہ تھی اور یوں میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میرے دیکھا دیکھی محمد یٰسین کے والد نے بھی میرے والد کی تقلید کی ......... (بعد میں ہم دونوں نے آرمی سے میٹرک سٹینڈرڈ کے امتحان پاس کیے)

مڈل کے امتحان کے بعد ہم شتر بے مہار کی طرح آزاد تھے کوئی کام نہ کرتے تھے۔عمر چھوٹی تھی' فوج میں بھی نہ جا سکتے تھے۔ بس یہی کہ والی بال کھیلتے' فٹ بال' کبڈی اور یا شکار۔ ڈھائی تین سال یونہی آوارہ گردی کرتے رہے.........

ہمارے ایک عزیز پولیس میں تھانے دار تھے۔ وہ جب بھی چھٹی پر آتے' میرے ابا کو ترغیب دیتے کہ مجھے پولیس میں بھرتی کرائیں۔ ابا ہنس کر ٹال جاتے......... لیکن ایک روز انہوں نے سچ مچ میرے ہاتھ میں تعزیرات ہند کی موٹی کتاب پکڑا دی۔ کہنے لگے۔ "اسے پڑھو"۔

میں نے تعزیرات ہند کی دفعات پڑھنا شروع کردیں......... مگر دل نہ لگا۔ وہ جو ناول اور افسانوں کی کتابیں پڑھنے کی مجھے لت پڑ گئی تھی' ان کے مقابلے میں جرائم کی دفعات میں ذرا بھی چاشنی نہیں تھی۔ مگر ایک دن اچانک کوہاٹ سے اطلاع آگئی انہوں نے مجھے بھرتی کے لیے بلایا تھا۔ میرے ابا نے جن کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ تھی کہ میں پٹواری بن جاؤں' بادل نخواستہ کوہاٹ جانے کی اجازت دے دی.........

اور یوں پولیس لائن کوہاٹ سے تین سو تین کا نمبر اور یونیفارم کی کٹ لے کر میں پولیس ٹریننگ سکول ہنگو پہنچ گیا......... ہنگو صوبہ سرحد کا پولیس ٹریننگ سنٹر تھا۔ یہاں نو مہینے کی ٹریننگ تھی' جس میں پریڈ کے علاوہ قانون کی کتابیں بھی پڑھنا پڑتی تھیں۔ ہر سہ ماہی قانون کے امتحان ہوا کرتے تھے۔ میں تقریباً" ہر امتحان میں فسٹ یا سیکنڈ آیا کرتا تھا.........



نو مہینے ٹریننگ کے بعد میں باقاعدہ فٹ کانسٹیبل بن کر کوہاٹ واپس آگیا۔ ٹریننگ کی کارکردگی کی وجہ سے جلد ہی نائب کورٹ لگا دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ مجھ میں پولیس والوں کی خو بو آنے لگی۔

اپنے عزیز تھانے دار کی رعایت سے دو چھوٹے چھوٹے کورسوں کے لیے مجھے دوسری اور تیسری بار ہنگو جانا پڑا۔ یہ کورس پولیس ملازمت میں شاندار مستقبل کے پیش خیمہ تھے۔ میرے ابا بہت خوش تھے' کیونکہ پولیس میں میری ترقی کا انہیں یقین ہو چلا تھا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میرا دل اس ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ پولیس کی نسبت مجھے آرمی کی نوکری زیادہ پسند تھی کیونکہ فوجی ملازمت میں گھومنے پھرنے اور دنیا دیکھنے کا زیادہ چانس تھا۔ دوسری جنگ عظیم چھڑ چکی تھی ہٹلر نے یورپ میں تباہی مچا رکھی تھی اور ادھر جاپان کی یلغار زوروں پر تھی۔

میں نے سوچا' یہ سنہری موقع ہے۔ پولیس میں رہ کر میں کوہاٹ اور زیادہ سے زیادہ فرنٹیئر کے سوا اور کہاں جا سکوں گا.........

چنانچہ میں نے پولیس کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا.........

رشتہ داروں کو معلوم ہوا تو سارے کے سارے کوہاٹ پہنچ گئے (ایک ابا نہیں آئے) اور مجھے استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کرتے رہے۔ میں سب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا......... مگر دل کی بات کسی کو نہ بتائی.........

انگریز ایس پی نے میرے سرٹیفکیٹ وغیرہ دیکھے تو انٹرویو کے لیے بلا لیا۔ استعفیٰ کی وجہ پوچھی۔ میں نے صاف کہہ دیا .........

"آرمی میں جانا چاہتا ہوں"۔

ایس پی نے ایک منٹ کے لیے سوچا۔ میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور دوسرے لمحے دستخط کر کے استعفیٰ منظور کر لیا......... میں خوش خوش پولیس لائن پہنچا' وردی جمع کرائی۔ ڈسچارج سرٹیفکیٹ اور دوسرے واجبات لئے بغیر سیدھا ریکروٹنگ افسر کے دفتر پہنچ گیا۔ نواب آف ٹیری ریکروٹنگ افسر تھے۔ میری قدو قامت اور عمر دیکھ کر بولے۔ "خنک

معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ نواب صاحب خود بھی خٹک تھے۔ کہنے لگے۔

"کہاں جانا پسند کرو گے' انفنٹری' آرمڈ کور' انجینئرنگ سگنل یا سپلائی.........؟"

میں نے فوراً" جواب دیا......... "ایم۔ ٹی!"

میں نے یہ محکمہ پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ پیدل مارچ کرنے کی نسبت سرکاری گاڑیوں میں گھومنا پھرنا زیادہ پسندیدہ بات تھی۔ ویسے آرمی کو بھی میں نے پولیس کی طرح مستقبل نہیں سمجھا تھا کہ تحقیق کی ضرورت پڑتی' محض سیر سپاٹے کی خاطر پولیس سے استعفیٰ دیا تھا۔

جنگ کا زمانہ تھا۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ فوراً" کاغذات تیار ہو گئے۔ بیس روپے نقد زادِ راہ کے طور پر اور ملتان تک کا ریلوے کا تھرڈ کلاس کا واؤچر میرے ہاتھ میں تھما دیا گیا......... نہ گھر والوں کو پتہ' نہ پولیس کے دوستوں کو علم۔ اگلے دن میں ایم۔ ٹی ٹریننگ سنٹر ملتان پہنچ گیا.........

دوسرے دن یونیفارم مل گئی اور میں لفٹ رائٹ کرتا ہوا ریکروٹوں کے سمندر میں گم ہو گیا۔ لیکن پولیس کی ٹریننگ کی وجہ سے جلد ہی اجاگر ہو گیا اور جونیئر افسروں کی نظر میں آ گیا۔ یوں عام ریکروٹوں کے مقابلہ میں خاص ریکروٹ کے سلوک کا مستحق گردانا گیا۔ پریڈ کے علاوہ چونکہ وہیکل ٹریننگ بھی تربیت کا لازمی حصہ تھا' اس لئے میں اپنے گروپ میں سے آگے نہ نکل سکا.........

ٹریننگ ختم ہوئی......... قسم پریڈ کے بعد میرے سارے ساتھی ہندوستان کے مختلف ٹرانسپورٹ یونٹوں میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ مجھے سنٹر میں انسٹرکٹر رکھ لیا گیا......... ایک دو ہفتے بعد مجھے ایک لوکل کورس کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کیڈر میں بھی فٹ آ گیا......... چنانچہ ابھی میری ملازمت کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ڈائرکٹ نائیک بنا دیا گیا۔ اس ہاتھوں ہاتھ پذیرائی سے میری تھوڑی بہت ڈھارس بندھی۔ گھر والوں کو بھی تسلی ہوئی.........



اب میں کچھ پر پرزے نکالنے لگا۔ سینما بھی جانے لگا۔ دوست احباب بھی بنا لیے' اور کچھ سوشل طور طریق بھی آ گئے۔ جونیئر اور سینئر سب افسر مہربان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چھ سات ماہ کے بعد فزیکل ٹریننگ (پی ٹی کورس) کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس کورس کے لیے مجھے شملہ کے قریب کسولی تین ماہ کے لیے جانا تھا۔ اس انتخاب پر میں بہت خوش تھا کیونکہ مجھے ہندوستان کے ایک بے حد خوبصورت' صحت افزا مقام دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

انبالہ سے ہوتا ہوا کالکا پہنچا تو یہاں کسولی ٹریننگ سکول کے ٹرک ہندوستان کے مختلف چھاؤنیوں سے آئے ہوئے کیڈٹوں کے لیے تیار کھڑے تھے.........

کالکا کی وادی میں میں نے پہلی بار زندہ مور دیکھے۔ اڑتے ہوئے اور چگتے ہوئے اور ہمالہ کے دامن کی یہ سرسبز وادی مجھے جادو نگری لگی.........

کسولی کی بلندیوں تک نو دس میل کا سفر خواب کی طرح خوبصورت سفر تھا.........

جون کا مہینہ تھا کہ ہم ملتان کی تپتی دوپہر کو الوداع کہہ آئے تھے اور اب کہ پی ٹی سکول کے احاطے میں داخل ہوئے تو سردی سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہماری رہائشی بیرکیں کسولی کی بلند ترین چوٹیوں پر واقع تھیں۔ بیرکوں کی انگیٹھیوں میں چیڑ کے تنوں کے سوکھے ٹکڑے جل رہے تھے اور بیرک معطر تھی۔

شام کو جب برانڈی کوٹ پہن کر کھانے کے لیے لنگر کی طرف نکلے تو سماں ہی کچھ اور تھا۔ ایک طرف سباتو کی روشنیاں اور سامنے شملہ کا جگمگ جگمگ کرتا ہوا شہر یہاں سے شملہ سڑک کے ذریعے چالیس میل دور تھا۔ لیکن سطح سمندر سے تقریباً" نو دس ہزار فٹ کی بلندی پر یہ دونوں شہر ایک دوسرے سے اتنے قریب نظر آتے تھے کہ ایک دوسرے کے جگمگاتے ہوئے قمقموں کو ہاتھ لگانے کو جی چاہتا تھا.........

دریائے گھاگرا یا جانے کون سا دریا تھا' کسولی کی چوٹیوں سے چاندی کی لکیر کی طرح چمکتا دکھائی دیتا تھا۔ ہر درخت پر لنگور اور بندر پھلانگ رہے تھے۔ دوپہر کھانے کے وقت تو وہ اودھم مچاتے کہ خدا کی پناہ.........

یہ تین مہینے نہایت شاندار تھے......... صبح صبح جب ٹریننگ کے لیے نکلتے تو سفید

سفید بدلیوں کے ٹکڑے آتے ہمارے جسموں اور روحوں کو چھوتے ہوئے نکل جاتے اور
کانوں کے رؤوں پر ننھے ننھے قطرے چھوڑ جاتے.........

ہفتے میں دوبار کسولی کے ارد گرد بنی ہوئی پکی سڑکوں پر تقریباً" دس میل کی دوڑ
لگاتے......... چاروں طرف گہری شاداب گھاٹیاں' حد نظر تک ترائیاں' چیڑ اور اخروٹ سے
بھرا ہوا جنگل اور دور دور تک ہمالہ کے لامتناہی سلسلے اور مرا کے خود روجھاڑیوں اور
پھولوں کی بہار آفرینیاں.........

سکول کے سینئر افسر سارے انگریز تھے۔ جونیئر افسروں میں ہندو' سکھ' مسلمان اور
ایک آدھ ہندوستانی عیسائی بھی تھا۔ مگر یہاں فوجی بھائی چارہ تھا.........ہمارا استاد ایک
گورکھا تھا۔چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا یہ زرد رونیپالی بے حد شریف اور نفیس آدمی
تھا......... جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو مجھے آواز دیتا۔ "اے پٹھان......... کلاس کو
سنبھالو' انہیں لیڈر شپ پر لیکچر دو۔"

میں وہی لیکچر شروع کردیتا جو استاد سے سن چکا تھا۔ اچھے کمانڈر کی خوبیاں ایک سے
دس نمبر تک بڑی تفصیل سے بیان کرتا.........

یہ تین مہینے خواب کی طرح گزر گئے......... کورس ختم ہو گیا.........

٥ ٥

ملتان واپس پہنچا تو مجھ سے پہلے ہمارے سنٹر کو سکول کی طرف سے میری شاندار
کامیابی پر مبارکباد کا پیغام موصول ہو گیا تھا۔ مجھے فوراً"حوالدار بنا دیا گیا۔

مگر اب ملتان میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں مڈل ایسٹ یا جرمن فرنٹ پر
جانے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے اپنی خواہش کا اظہار صوبیدار میجر سے کیا تو انہوں
نے بتایا.........

" تمہاری تو جونیئر کمیشن افسر بننے کے لیے سفارش چلی گئی ہے اور شاید بہت جلد
تمہیں لاہور کورس کے لیے جانا پڑ جائے۔"

اور وہی ہوا......... اگلے مہینے میں لاہور چلا گیا......... یہ کورس بھی میں نے اسی
اعزاز سے پاس کیا۔ ملتان واپس پہنچتے ہی میرا تبادلہ ایک سوستاون جی پی ٹی کمپنی جہلم ہو
گیا۔ عام خیال تھا کہ وہیں مجھے کمیشن مل جائے گا (جو بعد میں نہ مل سکا) لیکن مجھے زیادہ
خوشی جی پی ٹی کمپنی میں تبادلے کی تھی کیونکہ جی پی ٹی کمپنی میں تبادلے کا مطلب کسی فرنٹ پر
جانے کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔

میں خوشی خوشی جہلم پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک سو ستاون جی پی ٹی کمپنی جو ابھی نئی
نئی کھڑی ہوئی تھی' تمام سپاہی مدارسی ہیں۔ ہم چھ حوالدار پنجاب اور فرنٹیئر سے تعلق رکھتے
تھے۔ چھ جونیئر کمیشن افسروں میں دو پنجابی مسلمان دو مدارسی اور دو ہندو جاٹ تھے.........

چھ انگریز افسر تھے، جن میں میجر سینڈھرسٹ کمپنی کمانڈر، کیپٹن پکرنگ سیکنڈ اینڈ کمان، لیفٹیننٹ براؤن، لیفٹیننٹ کیف، لیفٹیننٹ سمتھ اور لیفٹیننٹ فلیچر پلاٹون کمانڈر تھے۔ تلگو، ملیالم اور تامل بولنے والے مدراسیوں کو دیکھ کر پہلے تو ہم لوگ گھبرائے لیکن آہستہ آہستہ ان لوگوں نے ہمیں اور ہم نے ان کو سمجھنا شروع کر دیا۔

میجر سینڈھرسٹ یہودی تھا۔ اس کی چال ڈھال زنانہ تھی مگر اس کی آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔ وہ نظر کا سنہری فریم کا نازک چشمہ لگاتا تھا اور صاف اردو بولتا تھا.........

کیپٹن پکرنگ اونچے قد کا وجیہہ آدمی تھا۔ خاموش طبع اور دفتری قسم کا، اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا.........

لیفٹیننٹ براؤن پینتالیس سال سے کچھ اوپر کا ہو گا۔ اس کے سامنے کے دو دانت مصنوعی تھے لیکن جسمانی طور پر سمارٹ تھا۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو وہ انگلستان میں زیادہ سے زیادہ ڈاکیہ ہوتا۔

لیفٹیننٹ کیف جوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ اپنے اردلی لکشمن سے اس کا پیار پوری کمپنی میں مشہور تھا۔ وہ خوبصورت لڑکیوں کی طرح لکشمن کے ناز نخرے اٹھاتا تھا.........

لیفٹیننٹ سمتھ لمبے قد کا باوقار انگریز تھا۔ اپنے سٹاف سے اس کا رویہ نہایت مشفقانہ ہوتا تھا۔ اس کے انداز اور اٹھنے بیٹھنے میں ایک خاص رکھ رکھاؤ تھا، جو مصنوعی نہیں فطری لگتا تھا.........

لیفٹیننٹ فلیچر جو میرا پلاٹون کمانڈر بھی تھا، بڑے مزے کا آدمی تھا۔ اس میں افسرانہ خو بو بالکل نہیں تھی۔ اس کی وردی ڈھیلی ڈھالی ہوتی تھی اور اس مزاج میں فنکارانہ لا ابالی پن تھا۔ وہ دوپہر کی روٹی اکثر ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا۔ لنگر کی دال کا بہت رسیا تھا۔ پلاٹون کے کام میں بھی کم کم دلچسپی لیتا تھا.........

گویا چھ نان کمیشن افسر، چھ جونیئر کمیشن افسر (وائسرائے کمیشن افسر) اور چھ سینئر



کمیشن افسروں (کنگ کمیشن افسر) کی ذمہ داری تھی کہ چھ ماہ کے اندر اندر تقریباً" ساڑھے تین سو مدراسی سپاہیوں کو کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کے معیار پر فرنٹ پر جانے کے لیے تیار کریں۔

ہماری کمپنی کو گاڑیاں، کیمو فلاج کے جال، ہلکا پھلکا اسلحہ اور دوسری ضروری چیزیں مل گئی تھیں۔ ہمارا تبادلہ سرگودھا ہو گیا۔ یہاں کھلے میدانوں میں اور پھر سڑکوں پر ہم نے سپاہیوں کو خوب تربیت دی۔ روزانہ مختلف سمتوں میں کانوائیاں نکلتیں۔ چھوٹے بڑے ایکسیڈنٹ بھی ہوتے لیکن یہ باتیں ٹریننگ کے دوران ناگزیر ہوتی تھیں.........

ریکروٹنگ سنٹروں میں انہوں نے جو کچی پکی ڈرائیونگ سیکھی تھی، اب آہستہ آہستہ اس میں پختگی آ رہی تھی اور ان کا اعتماد بڑھ رہا تھا......... تین مہینے سرگودھا رہنے کے بعد ہمارا تبادلہ چکوال کے نزدیک کلر کہار ہو گیا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور پہاڑی سڑکوں اور موڑوں پر گاڑی کی تربیت کے لیے نہایت موزوں۔

یوں تو یہ سارا علاقہ خشک تھا مگر چشموں کی وجہ سے کلر کہار کا قصبہ نہایت شاداب تھا۔ پہاڑ کے دامن میں جھیل تھی۔ جھیل سے اوپر پہاڑ کے بغل میں معلق باغات تھے، جن میں مور بکثرت پائے جاتے تھے۔

قصبے سے ذرا فاصلے پر ہمارا کیمپ تھا۔ یہاں پہلی بار ہمیں خیمے کی زندگی سے واسطہ پڑا۔ سپاہی اور افسر سارے کے سارے زمین پر بستر لگا کر سوتے تھے۔ حتیٰ کہ ہمارا ڈاکٹر جو ایم بی بی ایس تھا اور کلر کہار میں ہماری کمپنی سے آن ملا تھا، وہ بھی زمین پر بستر لگایا کرتا تھا۔ دراصل یہ ہماری تربیت کا ایک حصہ تھا۔

یہاں چاند راتوں کو بھی ڈرائیونگ کے لیے نکلتے اور اندھیری راتوں میں بھی ہیڈ لائٹ بجھا کر صرف سائیڈ لائٹوں کے ذریعے کانوائیاں چلتیں۔ مصنوعی بمباریاں ہوتیں تو ہم منٹوں میں گاڑیوں کو کیمو فلاج کرتے اور خود قدرتی مورچوں میں چھپ جاتے۔ خطرہ ختم ہو جانے کی وسل بجتی تو اسی تیزی سے جال لپیٹتے اور گاڑی سٹارٹ کر کے اسٹیرنگ پر بیٹھ جاتے.........

یہاں تین ماہ مزید تربیت کے بعد ہم واپس جہلم آ گئے۔ اب ہماری کمپنی جنگ کے کسی بھی فرنٹ پر جانے کے لیے تیار تھی۔

یہاں لگ بھگ ایک مہینے میں ہمیں تمام جنگی ضروریات مہیا کر دی گئیں۔ اس چھ سات ماہ کے عرصے میں اپنے ہم رینکس دوستوں کے علاوہ جو دو آدمی مجھے پسند آئے' وہ جمعدار حیات محمد اور صوبیدار گنگا پرشاد تھے......... جمعدار حیات محمد سیالکوٹ کے کسی گاؤں کا رہنے والا چٹا ان پڑھ تھا۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا مگر بے حد دلچسپ آدمی تھا۔ اپنی پلاٹون کے سامنے جب گلابی اردو میں تقریر کرتا تھا تو ایسی گل افشانیاں فرماتا تھا کہ بس مزہ آجاتا تھا.........

کچھ عرصہ بعد انہیں احساس ہوا کہ سپاہی ان کی تقریر سے اثر لینے کے بجائے محظوظ ہوتے ہیں تو وہ چوکس ہو گئے......... اب جس موضوع پر بولنا ہوتا' پہلے مجھے بتا دیتے میں ان کے لئے چھوٹی سی تقریر تیار کرتا۔ وہ خوب رٹا لگاتے۔ مجھے بار بار سناتے......... میں ان کے لہجے اور تلفظ کی غلطیاں درست کرتا۔ اس کے صلے میں وہ مجھے دودھ کے ڈبے دیتے اور ان کا اردلی میرے بوٹ صاف کرتا.........

صوبیدار گنگا پرشاد میرٹھ کا جاٹ تھا' کم گو مگر نڈر آدمی تھا۔ کتابوں کا رسیا تھا اور اسی لیے میرا دوست بن گیا۔ کبھی کبھار شراب کی چسکی لگاتا تھا۔ جس دن کوئی اچھی چیز پکاتا مجھے ضرور بلاتا۔ ایک دن کہنے لگا۔

"یار کسی دن گائے کا گوشت کھلاؤ"۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنسنے لگا.........

"ہاں یار تجربے کے طور پر' سنا ہے' بے حد لذیذ ہوتا ہے لیکن کھلانے سے پہلے نہ بتانا......... کہیں میں بدک نہ جاؤں"۔

میں نے جمعدار حیات محمد سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوا کہ یہ تو ثواب کا کام ہے' کراڑ کا بچہ کیا یاد کرے گا!"

چنانچہ ایک دن ہم نے باقاعدہ اہتمام کیا۔ بچھڑے کا نرم نرم گوشت لائے۔ شامی



کباب بنائے۔ دو تین طرح کا سالن بنا۔ جمعدار حیات محمد اردلی کے ساتھ خود بھی کام کررہا تھا......... شام کو میں گنگا پرشاد کو کسی بہانے لے آیا۔ تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ نو بج گئے تو پروگرام کے مطابق اردلی نے کہا.........

"صاحب کھانا تیار ہے"۔

جمعدار حیات محمد بے نیازی سے بولے.........

"لگا دو بھئی اور صوبیدار صاحب کے اردلی سے بھی کہہ دو' ان کا کھانا یہیں لے آئیں۔"

اردلی نے کھانا لگا کر ہمارے ہاتھ دھلوائے۔ میں نے اور جمعدار حیات محمد نے عمداً" ایک ایک شامی کباب اٹھایا......... صوبیدار گنگا پرشاد بھی کباب کھانے لگا......... کباب نہایت خستہ اور لذیذ تھے......... گنگا پرشاد کے لیے یہ بالکل نیا ذائقہ تھا۔ وہ تعریف پر تعریف کیے جا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو ذو معنی نظروں سے دیکھ لیتے تھے اور دل میں خوشی دبائے بیٹھے تھے کہ آج ایک کافر مسلمان ہو رہا ہے.........

گنگا پرشاد پانچ چھ کباب چٹ کر گیا۔ سالن کی باری آئی۔ بھنا ہوا نرم نرم گوشت اور چٹ پٹے مصالحے' بس مزہ آگیا.........

گنگا پرشاد کا اردلی بھی کھانا لے آیا تھا مگر کسی نے ہاتھ نہ لگایا......... دوبارہ تاش کھیلنے بیٹھ گئے تو صوبیدار گنگا پرشاد نے پھر کھانے کی تعریف شروع کر دی۔ جمعدار حیات محمد نے مجھے آنکھ ماری اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ میں بھی ہنسنے لگا تو صوبیدار نے حیرت سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ جمعدار حیات محمد قہقہے پر قہقہے لگا رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ بولا۔

"صوبیدار صاحب آج ہم نے آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو آپ کی ماں کا گوشت کھلادیا ہے!"

صوبیدار گنگا پرشاد کو فوری طور پر دھچکا سا لگا......... چند لمحے بوکھلایا بوکھلایا دیکھتا رہا مگر پھر شرارت سے مسکرا پڑا.........

"کوئی بات نہیں مسلو' میں کسی دن تمہیں سؤر کا گوشت کھلا کر چھوڑوں گا۔"

کافی دیر تک دل لگی ہوتی رہی۔ اب صوبیدار گنگا پرشاد ہفتے میں ایک بار ضرور ہمارے ساتھ گائے کے گوشت کا جشن منایا کرتا تھا اور پھر جب تک ہم اکٹھے رہے' گنگا پرشاد ہمیشہ ہمارا دوست رہا۔

پھر ایک دن اچانک ہم جہلم کے ریلوے سٹیشن سے سپیشل ٹرین کے ذریعے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

ایک ہفتے کا خشک راشن پوری کمپنی میں تقسیم کر دیا گیا اور سخت احکامات جاری کر دیئے گئے کہ کوئی سپاہی' کوئی عہدیدار کسی سٹیشن پر اپنے ڈبے سے اتر نہیں سکتا اور نہ ہی سٹیشن پر کھانے پینے کی کوئی چیز خرید سکتا ہے۔

وہ چار دن ہم پھیکے بسکٹوں پر جام انڈیل انڈیل کر گزارہ کرتے رہے مگر اب میٹھی چیزوں سے دل بھر گیا تھا اور نمکین چیزیں کھانے کو جی کر رہا تھا۔ لاہور' امرتسر' جالندھر اور دوسرے کئی سٹیشنوں پر ہماری سپیشل ٹرین رکتی' کوئلہ اور پانی لیتی اور پھر چل پڑتی۔ ہمیں ابھی تک اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ہم مڈل ایسٹ کی طرف جا رہے ہیں یا برما فرنٹ پر.........

دہلی ریلوے سٹیشن پر ہماری ٹرین رکی تو ہمارے ڈبے کے بالکل سامنے چھابڑی والا پوڑی چھولے بیچ رہا تھا۔ ہم چھ حوالدار انٹر کلاس کے ڈبے میں بیٹھے تھے۔ پوڑی چھولے دیکھ کر ہم سب کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن مسئلہ نیچے اترنے کا تھا۔ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا.........؟

ہم لوگ دروازے میں کھڑے تھے اور للچائی ہوئی نگاہوں سے چھابڑی والے کو دیکھ رہے تھے' جو سویلین گاہکوں کو پوڑی چھولے ڈال کر باری باری رخصت کر رہا تھا۔ حوالدر میجر سردار محمد نے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"یار ہمت کر گل.........؟"

میں نے حوالدار میجر کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے نوٹ جھپٹ کر چھابڑی والے کے پاس پہنچ گیا۔ چھابڑی والے نے سودا میرے ہاتھ میں تھمایا ہی تھا کہ عین اسی لمحے



لیفٹیننٹ براؤن میرے سر پر پہنچ گیا اور غصے سے چلایا۔

"وٹ از دِس۔"

میں کیا جواب دیتا۔ بوکھلایا ہوا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کے مصنوعی دانت میرا منہ چڑا رہے تھے۔ ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ دبک کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔

لیفٹیننٹ براؤن غصے سے مگر رک رک کر بولا۔

"جاؤ......... اور میجر صاحب کو......... یہ کھانا دکھاؤ اور بولو' لیفٹیننٹ براؤن نے بھیجا ہے!"

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا' پوڑی چھولے اٹھائے فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔ میجر سینڈھرسٹ اور کیپٹن پکرنگ کپڑے اتارے نکر اور بنیان میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ میں نے سلیوٹ کیا اور پوڑی چھولے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیفٹیننٹ براؤن نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

میجر سینڈھرسٹ اصل واقعہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ "تھینکس تھینکس" کرتے ہوئے اٹھا اور پوڑی چھولے میرے ہاتھ سے لے لئے۔ میں نے دوبارہ سلیوٹ کیا اور واپس اپنے ڈبے میں آ گیا.........

میرے ساتھیوں کے رنگ پیلے پڑ چکے تھے وہ گھبرائے اور سہمے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ سب کی زبانیں بند تھیں۔ کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ پوچھیں.........

"کیا بات ہوئی؟ کیا ہوا اور کیا ہونے والا ہے؟"

گاڑی چل پڑی۔ ہم سب خاموش بیٹھے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا' سب کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ سب فکر مند ہیں۔ حوالدار میجر سردار محمد جس کے ایما پر میں نیچے اترا تھا' سب سے زیادہ شرمندہ اور پریشان تھا.........

اگلے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میجر سینڈھرسٹ' لیفٹیننٹ براؤن کو لیے ہوئے ہمارے ڈبے میں آ گئے۔ میجر بے طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ براؤن سنجیدہ اور خاموش تھا۔ ہم حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"ویل ڈن حوالدار' ویل ڈن"۔ میجر نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ ہم نے تمہارا پوڑی چھولا کھا لیا تھا۔ بہت مزہ آیا لیکن زیادہ مزہ اس بات کا آیا کہ تم نے اپنے جرم میں مجھے اور کیپٹن پکرنگ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اب مسٹر براؤن پریشان ہیں کہ ان کی کارروائی کا کریڈٹ ضائع ہو گیا ہے!!"

اس غیر متوقع تبدیلی پر میں نے مسکرا کر لیفٹیننٹ براؤن کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی خفت مٹا رہا تھا اور لال پیلا ہو رہا تھا اور سر ہلا کر مجھے چیلنج کر رہا تھا۔ میجر سینڈھرسٹ نے ایک قہقہہ لگایا اور لیفٹیننٹ براؤن کو لے کر چلا گیا........

میرے ساتھی لپک کر مجھ سے لپٹ گئے اور میری کارکردگی کو سراہنے لگے۔ جو شعوری طور پر مجھ سے سرزد نہیں ہوئی تھی اور یوں آئی بلا ٹل گئی۔

جب ہماری ٹرین کا رخ صوبہ بہار کی طرف ہو گیا تو ہمیں احساس ہو گیا کہ مڈل ایسٹ کی بجائے ہم مشرقی فرنٹ پر جا رہے ہیں۔ اس طرح کبھی ریل اور کبھی سٹیمر میں سفر کرتے ہوئے ہم آسام کے شہر ڈیما پور پہنچ گئے۔ یہی ہماری منزل تھی۔

ڈیماپور ہماری فوجوں کا آخری ریلوے ہیڈ تھا اور آسام ریلوے کا آخری ریلوے سٹیشن۔ یہاں سے وہ مشہور سڑک شروع ہوتی تھی جو ناگاہل سے ہوتی ہوئی منی پور' امپھال اور آگے دریائے ایراوتی تک نکل جاتی تھی........ ایراوتی کے اس پار جاپانی فوج مورچہ زن تھی........

یہ واحد سڑک تھی' جس کے ذریعے سپلائی قائم تھی اور دریائے ایراوتی کے اِس طرف مورچہ زن برٹش انڈین آرمی کو راشن اور گولہ بارود پہنچایا جاتا تھا۔ یہ سارا علاقہ گھنے جنگلات سے اٹا پڑا تھا۔ اسی سڑک پر ناگاؤں کا خوبصورت شہر کوہیمہ بھی واقع تھا جو ڈیما پور سے چالیس میل دور تھا۔ کوہیمہ سے آگے ساٹھ ستر میل تک اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ناگاؤں کے گاؤں آباد تھے۔

ڈیما پور شہر سے آگے' سڑک کے دائیں بائیں جنگل میں بڑے بڑے بیس تھے۔ یہاں بڑے بڑے گوداموں میں راشن اور گولہ بارود کے ذخائر تھے۔ یہاں دن رات ٹرینیں



آتی۔ گوداموں میں برانچ لائن کے ذریعے ڈبے اندر چلے جاتے جاتے اَن لوڈ ہوتے۔ جی پی ٹی کمپنیوں کے ٹرک آتے' راشن اور گولہ بارود لے کر فرنٹ لائن پر پیدل فوجوں تک پہنچاتے۔ گوداموں کے باہر ایمونیشن اور اسلحہ کی پیٹیاں سٹور کر دی جاتیں اور بارش سے بچانے کے لیے ان ذخیروں پر ترپال بچھا دیئے جاتے۔ سیکورٹی کی پابندیاں اتنی سخت تھیں کہ بیس کے اندر جانے اور نکلنے میں ڈرائیوروں اور ٹرکوں کی دس بار چیکنگ ہوتی تھی........

ہمارا کیمپ شہر سے تین میل دور تھا۔ گھنے جنگل کے اندر تقریباً" آدھ میل کے ایریا میں بانسوں کے باشے بنے ہوئے تھے۔ یہی ہماری بیرکیں تھیں۔ یہاں جنگلی مرغی کثرت سے ملتی تھی۔ جنگل کی وجہ سے مچھروں کی اتنی بہتات تھی کہ ایک ماہ کے اندر اندر ہماری کمپنی کے ساڑھے تین سو کی نفری میں صرف اسی آدمی رہ گئے.باقی سب ملیریا کا شکار ہو کر ہسپتالوں میں داخل ہو گئے۔ ان اسی بد نصیبوں میں مَیں بھی تھا جو ملیریا سے بچ گیا تھا۔ سپاہیوں کی کمی کی وجہ سے ڈیوٹی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہم حوالدار لوگوں کو بھی گاڑیاں چلانا پڑ گئیں۔ دو چار گھنٹے مشکل سے سونے کو ملتے۔ روز صبح گاڑیاں لوڈ کر کے ناگاہل کے دشوار گزار راہوں سے منی پور ہوتے ہوئے امپھال پہنچتے۔ بعض اوقات فرنٹ لائن تک جانا پڑتا تھا اور پھر شام یا آدھی رات تک ڈیما پور واپس آتے........

میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح مجھے بھی ملیریا ہو جائے اور چند دن ہسپتال میں آرام کروں۔ ملیریا کی خاطر میں اکثر چہرہ اور ٹانگیں مچھردانی کے باہر نکال کر سوتا مگر وہ مچھر میرے قریب نہ آئے' جس نے اپنے جسم میں ملیریا کے جراثیم چھپا رکھے تھے۔ ایک ایک کر کے سپاہی تندرست ہو کر واپس آنے لگے۔ اب شام کی گنتی میں پلاٹون کمانڈر آتے اور ملیریا کی ایک ایک زرد گولی خود سپاہیوں کے منہ میں ڈالتے' پانی کا گھونٹ دیتے اور اپنے سامنے حلق سے اتراوتے تھے۔

یوں ملیریا کا مچھر بے اثر ہوتا چلا جاتا اور سپاہی ڈیوٹی پر واپس آتے گئے اور ہمیں کچھ آرام ملا........

ڈیما پور کے بازار میں مَیں نے پہلی بار ناگاؤں کو دیکھا۔ چند عورتیں اور مرد ٹولی کی

شکل میں گھوم رہے تھے۔ مردوں نے صرف ستر پوشی کر رکھی تھی۔ ان کے باقی جسم ننگے تھے۔ سروں پر رنگ برنگ کے پر اور چیتھڑے لٹک رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بلم اور نیزے تھے۔ عورتوں نے گھٹنوں تک لباس پہن رکھا تھا۔ ان کی پنڈلیاں یورپین بچوں کے رخساروں کی طرح سرخ اور نازک تھیں اور ان کے گول اور قدرے چپٹے چہرے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم اور سرخ تھے.........

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مرد سنولائے ہوئے گہری رنگت کے تھے' جبکہ کوئی لڑکی بھی ان جیسی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس فاصلے اور فرق پر حیرت ہوتی تھی کہ ایک ہی اب و ہوا میں پھلنے پھولنے والوں اور ایک ہی نسل کے لوگوں میں یہ تضاد کیسا ہے؟

کبھی کبھی فوجیوں کے دل بہلانے کے لیے فوجی دل خوش صبا پارٹیاں آتی تھیں۔ تین تین چار چار سال سے جنگ پر آئے ہوئے فوجیوں کے لیے ناچ گانے کے پروگرام گویا پیاسے کے حلق میں ایک قطرہ ٹپکانے کے مترادف ہوتا تھا......... ناچتی گاتی ہوئی عورت کو دیکھ کر سپاہی سارا ڈسپلن بھول جاتے تھے اور ہال میں سستے جنسی نعروں کے ساتھ ساتھ پیسوں کی بارش شروع ہو جاتی تھی۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے سرکاری طور پر بلاوا آتا اور ہم گاڑیوں میں بیٹھ کر پروگرام دیکھنے جاتے تھے لیکن جب کسی اور یونٹ کی باری ہوتی تو اکثر سپاہی چوری چھپے پانچ چھ میل کا سفر پیدل طے کر کے پروگرام دیکھنے جاتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ پھر کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور کھڑا ہو جاتا۔ سپاہی ایک دوسرے پر جنسی حملے کرتے۔ صبح ڈاکٹری معائنے ہوتے اور ایک آدھ سپاہی کوارٹر گارد کے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا.........

کچھ عرصہ بعد میری ڈیوٹی ایک پٹرول ڈپو پر لگ گئی۔ یہ ہوم سکیم کا نہایت اہم ڈپو تھا۔ ڈیما پور سے نکلنے والی ہر گاڑی اس ڈپو سے اپنی ٹینکی بھر کر نکلتی تھی۔ "ہوم سکیم" کرنل ہوم کی سوچی ہوئی سکیم تھی۔ ڈیما پور سے فرنٹ لائن تک تین چار سو میل لمبی سڑک پر ہر پندرہ بیس میل کے بعد ایک پٹرول ڈپو ہوا کرتا تھا۔ ان ڈپوؤں سے ساری جی پی ٹی کمپنیوں کے علاوہ آرمی کے ہر شعبے کی گاڑی پٹرول حاصل کر سکتی تھی۔ ہر ڈپو پر خاص



عملہ ہوتا تھا۔ گاڑی رکتی تو یہ لوگ پوچھے بغیر ٹینکی بھر دیتے۔ گاڑی اور یونٹ کا نمبر نوٹ کرتے اور گاڑی پاس کر دیتے.........

میری ڈیوٹی رات کی تھی اور ہر دوسرے تیسرے منٹ پر ایک گاڑی پٹرول لینے پہنچ جاتی۔ رات ڈھائی تین بجے کے بعد یہ وقفہ نو دس منٹ کا ہو جاتا۔ یہی وقت ہوتا تھا' جب ہم بنچوں پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتے۔ ایک رات لیفٹیننٹ براؤن کی ڈیوٹی تھی۔ وہ چیکنگ کے لیے آیا تو میں اونگھ رہا تھا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ میں لڑکھڑا کر بنچ سے نیچے گر پڑا۔ لیفٹیننٹ براؤن غرا رہا تھا اور غصے سے پاؤں زمین پر ٹپک رہا تھا.........

میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ تھپڑ لگنے سے ذلت کا احساس تو تھا ہی مگر اس بات پر نادم بھی تھا کہ ذرا دیر کے لیے سہی' بہرحال سویا' ہوا پایا گیا۔

لیفٹیننٹ براؤن چلا گیا تو سپاہی گالیاں دینے لگے......... "بڑا حرامی ہے' سالا ٹامی ہے' انڈین سے نفرت کرتا ہے۔ اس کی ایسی تیسی!"

سپاہیوں کی ہمدردی سے میری انا کو کچھ کچھ تسکین مل رہی تھی لیکن دل میں سوچ رہا تھا کہ لیفٹیننٹ براؤن نے بالآخر دہلی ریلوے سٹیشن کے پوڑی چھولے کا انتقام لے ہی لیا۔

تقریباً" ایک گھنٹہ بعد لیفٹیننٹ اگلی چوکیوں کو چیک کرتا ہوا واپس آ گیا۔ خوش قسمتی......... میں پھر اونگھ رہا تھا۔ سپاہیوں کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ مجھے خبردار کرتے۔ اس نے پہلے کی طرح دوبارہ مجھے تھپڑ مارا۔ میں پہلے کی طرح بجری کے فرش پر گر پڑا لیکن اب کے میں خاموش کھڑا نہ رہ سکا۔ سوچے سمجھے بغیر اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور زمین پر دے مارا اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور داہنے ہاتھ سے لگاتار اس کے منہ پر مکے رسید کیے۔ اتنے میں سپاہی آ گئے۔ انہوں نے کھینچ کر مجھے الگ کیا۔ دو سپاہیوں نے لیفٹیننٹ براؤن کو سہارا دے کر اٹھایا مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی سانسیں

لے رہا تھا اور اپنا نرخرہ سہلا رہا تھا۔

مکوں سے زیادہ تکلیف اسے میری ان انگلیوں سے پہنچی تھی جو اس کی گردن میں دھنس گئی تھیں.......... سپاہیوں نے اسے بنچ پر بٹھایا۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا۔ میرا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور میں اسے گھور رہا تھا.........

لیفٹیننٹ براؤن آرام سے اٹھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے میرے قریب آیا اور آہستہ سے بولا۔

"ویل حوالدار.........! تم بھی مارا' ہم بھی مارا' تم بھی رپورٹ نہیں' ہم بھی رپورٹ نہیں۔ وی آر فرینڈ.........!"

اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے بھی ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا

"یس' وی آر فرینڈ.........!"

لیفٹیننٹ براؤن ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے میرا کندھا تھپتھپایا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ سپاہیوں نے یا علیؑ کا نعرہ لگایا اور اسی وقت چائے بنا کر مجھے گرم گرم پلائی......... پھر صبح تک کسی کو نیند نہ آئی اور تازہ دم ہو کر گاڑیوں کی ٹینکیاں بھرتے رہے۔

اس کے بعد لیفٹیننٹ براؤن واقعی میرا دوست بن گیا تھا۔ مجھے دور سے دیکھ مسکرا پڑتا اور حوالدار کی بجائے مسٹر گل کہا کرتا تھا.........

انہی دنوں ہماری کمپنی کو ایک بہت اچھی آفر آئی۔ سٹیشن ہیڈ کوارٹر کو ایک ایسے عہدے دار کی ضرورت تھی جسے ایک انڈی پنڈنٹ جیپ کی کمان سونپی جانی تھی اس عہدے دار کا کام یہ تھا کہ صبح ڈیما پور سے امپھال تک جائے گا۔ رات امپھال میں ٹھہرے گا اور دوسرے دن امپھال سے واپس ڈیما پور آئے گا۔

اس روڈ پر جتنی گاڑیاں اور جس قسم کی گاڑیاں گزرتی ہیں' ان کی رفتار چیک کرے گا۔ جس گاڑی کی مقررہ رفتار سے زیادہ رفتار کی رپورٹ یہ عہدے دار متعلقہ یونٹ کو دے گا تو ڈرائیور کو بغیر کسی حیل و حجت کے اٹھائیس دن قید کی سزا دی جائے گی لہٰذا یہ



عہدے دار بہت اہم اور ذمہ دار قسم کا آدمی ہونا چاہیئے۔

قرعہ فال میرے نام نکلا......... یہ نہیں کہ میں بہت اہم اور ذمہ دار آدمی تھی۔ لیکن لیفٹیننٹ براؤن نے میٹنگ میں کچھ اس انداز سے میری صلاحیت کا ذکر کیا کہ یہ بیحد اہم ڈیوٹی میرے سپرد کردی گئی۔

چنانچہ اب میں روزانہ صبح ڈیما پور سے جیپ لے کر نکلتا اور لال جھنڈا لہراتا ہوا' مزے مزے مختلف یونٹوں میں رکتا ہوا شام تک امپھال پہنچ جاتا۔ رات آرام سے امپھال میں ٹھہرتا اور صبح امپھال سے ڈیما پور کے لیے روانہ ہوجاتا۔

مجھے یہ ڈیوٹی بہت پسند آئی کیونکہ اس میں انا کی تسکین کے بہت پہلو تھے اور ہزاروں ڈرائیوروں کے لیے میرا دبدبہ کرنل ہوم سے کم نہیں تھا.........

ناگاہل سے گزرتے ہوئے ناگا لوگ مختلف ٹولیوں میں سڑک پر کام کرتے ہوئے ملتے......... لڑکیوں کی ٹولیاں بھی ملتیں جو سر پر لکڑیوں کے گٹھے اٹھائے ہوئے ہوتیں اور کسی پگڈنڈی پر اوپر چوٹیوں کی طرف جاتی دکھائی دیتیں ان کے گاؤں وادیوں کی بجائے اونچی اونچی چوٹیوں پر آباد تھے۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر میں ہارن بجاتا وہ کھڑی ہو جاتیں' مڑ کر دیکھتیں۔ میں ہاتھ ہلا کر انہیں وِش کرتا' وہ قہقہے لگاتیں۔ ان میں سے ایک آدھ پتھر اٹھا کر مارتی اور میں ہنستا ہوا آگے نکل جاتا.........

کچھ عرصہ بعد وہ میری جیپ پہچان گئیں۔ جب بھی سڑک پر ملتیں' میں جیپ روک لیتا۔ وہ لپک کر اپنے گٹھوں سمیت جیپ میں بیٹھ جاتیں۔ یہ سب غیر قانونی کارروائیاں تھیں مگر میں تو اس سڑک کا بادشاہ تھا۔ بادشاہ سے قانون کی خلاف ورزی کی جواب طلبی کون کرسکتا تھا۔

ان کا گاؤں قریب آجاتا تو میں جیپ روک لیتا۔ وہ چھلانگیں لگا کر کود جاتیں اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رخصت کرتیں۔

کنواری لڑکیوں کا لہنگا سفید ہوتا تھا اور بلاؤز سیاہ۔ شادی شدہ لڑکیوں کا لہنگا کالا ہوتا اور بلاؤز سفید۔

میں نے ناگا عورت جیسی حسین عورت کہیں نہیں دیکھی۔ پیلی، گندمی اور سفید چمڑی کا حسن اپنی جگہ مگر ناگا عورت کا ہلکے گلاب کا سا رنگ جو اس کے رخساروں سے پاؤں کی انگلیوں کے پوروں تک ایک جیسا ہوتا ہے، آدمی کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اور پھر...... یہ نہیں کہ ایک آدھ ہی خوبصورت ہو...... وہاں تو نظر ہی نہیں ٹکتی تھی۔ انسان کسے دیکھے اور کسے نظرانداز کرے...... چھوٹی چھوٹی ناکیں، تنگ تنگ نتھنے، چھوٹا سا دہانہ، سرخ سرخ مسوڑھے اور ان میں چھوٹے بچوں کی طرح دودھ والے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی کلیاں......

آنکھیں بہت بڑی بڑی نہیں مگر مڑی ہوئی پلکیں، گلابی ڈوروں کا جال اور ان میں سیاہ پتلیاں سینے میں یوں اتر جاتی تھیں کہ آتما گدگدا جاتی......

انسان سوچتا...... کہ اگر انتخاب کا موقع مل جائے تو کس قدر مشکل پیدا ہو ...... کس کا ہاتھ پکڑے اور کس کا ہاتھ چھوڑے...... اور آسانی کا پہلو ایسا ...... کہ آنکھیں بند کر کے آگے بڑھے...... جو بھی ہاتھ آجائے وہی بے مثال ...... اور پھر ایک اور خوبی جو میں نے صرف ناگا نسل میں دیکھی ...... ان کی عورتیں بے حد عمرچور ہوتی ہیں ...... چار بچوں کی ماں جب ان کنواریوں میں مل جل کر چہلیں کرتی تو ماسوائے اس کے کہ اس کا لہنگا سیاہ ہوتا، کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور چار بچوں کی ماں ہے......

اس ڈیوٹی پر مجھے دو ماہ ہو گئے تھے۔ ایک صبح جب مجھے امپھال سے ڈیما پور کے لیے روانہ ہونا تھا، سی۔ ایم۔ ایچ کا عہدے دار ایک چٹھی لایا۔ ہسپتال کی ایک سسٹر کا تبادلہ امپھال سے ڈیما پور ہو گیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس سسٹر کو ساتھ لے کر ڈیما پور لے جایا جائے لیکن اس حکم میں فوجی لہجے کی استدعا بھی تھی کہ صبح کی بجائے بارہ بجے روانگی ہو، تاکہ سسٹر سارا نئی سسٹر کو چارج دے کر فارغ ہو سکے۔

چنانچہ میں رک گیا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ سی ایم ایچ کی ایمبولینس آگئی۔ سسٹر سارا ایک مختصر سا اٹیچی کیس لے کر ایمبولینس سے نکلی۔ ستائیس اٹھائیس سال



کی بلند قامت سسٹر نے مجھے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور تمکنت تھی اور اس کے انداز سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور وہ معاشی ضرورت کے لیے سسٹر نہیں بنی بلکہ اپنے خاندان کی اعلیٰ روایات کے مطابق جنگ میں اپنا فرض نبھانے آئی ہے۔

وہ خاموش اور سنجیدہ بیٹھی تھی۔ منی پور تک ہم بمشکل دو چار باتیں کر سکے لیکن جب ایک جگہ جیپ کھڑی کر کے میں نے اسے چائے پلائی تو اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا احساس باقی نہ رہا۔ اس نے میرا نام رجمنٹ اور وطن کے بارے میں پوچھا۔ خود اس نے بھی اپنا تعارف کرایا......

اس کا باپ پہلی جنگ عظیم میں کرنل رہ چکا تھا۔ خود وہ بے حد پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ تعلیم کے بعد وہ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنا چاہتی تھی کہ جنگ چھڑ گئی اور وہ خدمت کا جذبہ لے کر ہندوستان چلی آئی کہ یہ بھی جنگی کاموں میں ایک اہم کام تھا......

امپھال سے دیر میں روانگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہم رات کے گیارہ بجے سے پہلے ڈیما پور نہیں پہنچ سکتے تھے۔ زیادہ تر راستہ پہاڑی تھا اور رفتار محدود تھی مگر تقدیر شاید میری زندگی کا ایک نیا باب کھول رہی تھی ...... گاڑی کے انجن کا ایک اہم پرزہ ٹوٹ گیا۔

جیپ رک گئی۔ انجن دیکھا۔ میں اچھا خاصا مکینک تھا مگر ٹوٹا ہوا پرزہ میرے بس کا نہ تھا۔ سارا کو صورتِ حال کا علم ہوا تو بہت پریشان ہوئی کیونکہ نہ صرف شدید سردی تھی بلکہ رات کا وقت تھا اور جنگل میں رات کے دس بج رہے تھے۔ کوہیمہ ہم سے بیس میل اور ڈیما پور ساٹھ میل دور تھا۔ میں نے اپنا سفری بستر نکالا۔ جیپ کی پچھلی سیٹیں اٹھائیں۔ ایک کمبل اور دری نیچے بچھائی۔ ترپال اچھی طرح کھینچ لیا اور دو کمبل جوڑ کر سارا کو لیٹنے کے لیے کہا۔ وہ پیچھے چلی گئی اور کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا......

"وٹ اباؤٹ یُو سارجنٹ، تم کیا کرو گے......؟

میں نے ہنس کر کہا......

"میری فکر نہ کریں۔ مجھے یہ پرابلم پیش آتے ہی رہتے ہیں۔"

"مگر یہاں شدید سردی ہے اور تم صرف گرم یونیفارم پہنے ہو۔"

میں کوئی گاڑی روکتا ہوں۔ کوہیمہ پیغام بھیجتا ہوں کہ ورکشاپ سے ٹوٹا ہوا پرزہ بھیج دیا جائے۔"

سارا کو کچھ تسلی ہوئی اور لیٹ گئی۔ چونکہ اس روٹ پر دن رات کی سروس تھی، اس لئے مجھے امید تھی کہ کوہیمہ سے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں پرزہ آجائے گا۔

میں نے ایک دو گاڑیاں روکیں اور ان کے ڈرائیوروں کو کوہیمہ ورکشاپ کے لیے پیغام دے دیا اور خود اسٹیئرنگ پر آکر بیٹھ گیا...... سارا نے ایک آدھ بار سر اٹھاکر دیکھا اور پھر خاموشی سے کمبل اوڑھ لیے......

تقریباً بارہ بجے کوہیمہ کی طرف سے آنے والے ایک سکھ ڈرائیور نے پیغام دیا۔ کوہیمہ ورکشاپ میں متعلقہ پرزہ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے ڈیما پور فون کر دیا تھا...... اور دو تین گھنٹوں میں پرزہ متوقع تھا......

میں مایوس ہو کر دوبارہ اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد سارا نے دوبارہ سر اٹھایا اور تحکمانہ لہجے میں بولی......

"کم اِن سارجنٹ۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ترپال چاروں طرف سے بند تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ میں نے ماچس نکالی، تیلی جلائی ۔ وہ سر اٹھائے مجھے گھور رہی تھی۔ میرے جسم میں لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میں بوکھلایا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ جب تک تیلی جلتی رہی، وہ کچھ نہ بولی۔ حتیٰ کہ میری انگلیاں جلنے لگ گئیں اور میں نے جھٹک کر تیلی پھینک دی۔

اندھیرے میں ایک بار پھر اس کی آواز جگمگا اٹھی......

"یس...... کم اِن سار جنٹ بہت سردی ہے، آجاؤ ادھر!"

میں ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آگیا۔ اس نے کمبل ایک طرف سے اٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر مجھے کمبل کے اندر کھینچ لیا......

"ٹوکولڈ، ٹوکولڈ، تم ساری رات سیٹ پر بیٹھ کر کیسے گزار سکتے ہو؟"



میری زبان تالو سے لگ گئی تھی اور میں بری طرح کانپ رہا تھا۔ یہاں سوال جنسی اشتعال کا نہیں تھا۔ ایک غلام سپاہی کے احساس کا تھا جسے اپنی ملکہ نے شاید رحم کھا کر اپنے پہلو میں کھینچ لیا تھا......

لیکن یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہو رہا تھا، میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا...... وہ میری کیفیت محسوس کر کے ہنس پڑی......

"بوائے سارجنٹ!" وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ "کس می پلیز کس می !!"

مگر اس سے پہلے کہ میں اسے چومتا، اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے......

افروزہ پہلی لڑکی تھی کہ میرے سینے سے لگی تھی اور سارا بھی پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے ہونٹوں کے شہد آگیں لمس سے آشنا کیا تھا......! کیا ذکر اس رات کہ کیسے گزر گئی......؟

یہ اگر گناہ تھا تو میں نے دل کھول کر کیا۔ یہ اگر ثواب تھا تو میں نے جی بھر کر لوٹا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلی نیکی تھی جو میری روح نے محسوس کی تھی!

اور، پہلی مسرت تھی جو میری ہڈیوں تک میں سرایت کر گئی تھی......

صبح چار بجے ورکشاپ کی گاڑی ہماری جیپ کے پاس آکر رک گی۔ دو مکینک آئے، پرزہ ان کے پاس تھا۔ میں کپڑے پہن کر باہر نکلا تو وہ دونوں سر جوڑے ٹانگیں پھیلائے پرزہ فٹ کر رہے تھے۔ ایک گھنٹہ میں وہ اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔ جیپ اسٹارٹ ہوگئی...... میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ...... وہ واپس ڈیما پور کے لیے روانہ ہوگئے......

جنگل میں ابھی اندھیرا تھا۔ پَو پھٹنے میں ابھی دیر تھی اور ہمیں ڈیما پور پہنچنے کی اتنی جلدی نہ تھی۔

میں نے ماچس جلائی۔ سارا کمبل لپیٹے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھا تو اس نے کمبل جھٹک کر میری طرف دیکھا اور بے ساختہ ہنس پڑی۔

"کم اِن......."

اس نے مجھے کھینچ کر بازوؤں میں لے لیا۔ گردن اور چہرے کے دیوانہ وار بوسے لیے۔ پھر میرے کان کی لو منہ میں لے کر دھیرے دھیرے چبانے لگ گئی۔ میں ایسی وارفتگی سے پہلی بار دو چار ہوا تھا.......

یہ اس رات ہماری محبت کی دوسری لہر تھی.......

وہ ایک ہاتھ سے میری بالوں سے خالی چھاتی سہلا رہی تھی ....... ساری رات ہم نے بہت کم گفتگو کی تھی۔ جس طرح میری اور رام پیاری کی آنکھیں راز و نیاز کی عادی تھیں، بالکل اسی طرح یہاں ہمارے جسموں کا لمس سلام و پیام کا فرض پورا کر رہا تھا.......

صبح جانے کے لیے اٹھے تو اس نے پھر بوسوں کی بارش کر دی۔ اس کے رویے میں عجیب جنون اور دیوانگی تھی....... سارا راستہ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ میں ایک ہی ہاتھ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا.......

کوہیمہ میں چائے پی کر ہم پھر جیپ میں بیٹھ گئے اور اترائی شروع ہوگئی تو وہ بولی.......

"کنواری نہیں ہوں، پیارے اور فرض کیجئے ہوتی تو تم سے آج کی ملاقات کے بعد کنواری نہ رہتی۔ اس لئے کوئی فرق نہ پڑتا اگر میں تم سے کہوں کہ ایک زخمی کیپٹن جس کی میں نے بہت خدمت کی تھی اور اس سے بہت مانوس ہو گئی تھی، صحت یاب ہونے کے بعد میں نے اپنی دوشیزگی اس پر قربان کردی تھی مگر یہ تو زندگی میں ہوتا ہی ہے۔ بالکل اس طرح، جیسے آج میں نے تمہارا کنوار پن چھین لیا ہے۔"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا.......

"کوئی بھی لڑکی ہوتی۔ میرا کنوارپن چھین سکتی تھی۔ اس سے اچھا اور کیا کہ تم جیسی بے مثال عورت نے پہل کر دی۔"

وہ اس جواب سے بہت محظوظ ہوئی۔ میں نے بات آگے بڑھائی۔ "میں عمر کے اس



دور سے گزر رہا ہوں کہ موقع ملے تو پتھر کی مورتی سے بھی لپٹ جاؤں۔ تم تو بہت شاندار عورت ہو تم نے تو ایک رات میں مجھے محبت کے ننانوے گر بتائے ہیں۔"

"وہ ہنس پڑی........."

تم بہت اناڑی ہو مگر میں تم سے محبت کروں گی۔ تمہیں بہت زیادہ محبت دوں گی۔ تم جذبات سے بھرپور لڑکے ہو، نہایت شاندار۔ میں جنگ کے بعد تجھے انگلینڈ لے جاؤں گی۔ میں امیر لڑکی ہوں۔ میرے باپ نے میرے لیے بہت بڑا اثاثہ چھوڑا ہے۔ میں تمہیں تعلیم دلواؤں گی۔ میں تمہارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔"

اس کا یہ رویہ اور انداز دیکھ کر میں کچھ پریشان ہوگیا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن میں اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ ایک رات میں، صرف ایک رات میں زندگی ایسا تماشا بھی دکھا سکتی ہے.......؟

فرض کیجئے....... انجن کا پرزہ نہ ٹوٹتا۔ یہ رات ہماری زندگی میں نہ آتی تو یہ محبتیں کون نچھاور کرتا.......

یہ پرزہ اسی رات کیوں ٹوٹا۔ یہ حادثہ اسی رات کیوں پیش آیا، جب ایک بھرپور عورت میرے پہلو میں تھی؟ جیپ ایسی جگہ کیوں ناکارہ ہوگئی کہ رات ناگزیر ہو گئی ....... اور محبتوں کے موتی برس برس پڑے.......؟

گویا ایک حادثے کے بطن سے دس اور حادثے جنم لیتے ہیں.......

مجھے سوچوں میں ڈوبا، ہوا پاکر اس نے دوسرا ہاتھ بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور پیار سے سہلاتے ہوئے بولی.......

"پیارے، میری عمر تم سے بڑی ہے مگر ابھی تک یہ نہیں ہوا کہ محبتوں اور عنائتوں سے بھی کوئی شخص خوف زدہ ہو سکتا ہے ۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔ میری عمر اتنی بڑی نہیں ہے کہ شوہر کی تلاش میں ہندوستان آنا پڑ گیا ہو۔ ہاں البتہ محبت کی تلاش ہر عورت کو ہوتی ہے۔ مجھے بھی تھی۔ اور شاید میں نے پالی ہے۔"

میں نے شوق اور عقیدت سے اس کی طرف دیکھا ....... غیر ارادی طور پر میرا

پاؤں بریک پر دب گیا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں جذبات کے دیئے روشن تھے۔ اس کے سرخ ہونٹ کھلے تھے اور اس کے خوبصورت دانت ذرا ذرا سے نظر آ رہے تھے۔

میں نے پہلی بار کی اور اس کے خوب صورت ہونٹ چوم لیے........ اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر رخسار پر رکھ لیا۔ میں نے بریک سے پاؤں اٹھالیا..... گاڑی چل پڑی تو میں نے ہولے سے کہا........

"کیا محبت میں یہی ہوتا ہے کہ انسان والدین کو اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دے اور سارے رشتوں کو بھول جائے۔ ہاں غالباً" یہی ہوتا ہے۔ کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ پرزہ ٹوٹتا ہے تو گاڑی رک جاتی ہے۔ انسان کے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی ہے تو زندگی بکھر جاتی ہے........ اس لیے لازم ہے کہ جن پرزوں سے زندگی عبارت' ہے' اس کی تلاش میں دور دور تک سفر جاری رکھا جائے........!"

سارا نے میرا ہاتھ چوم لیا.........

تقریباً" دس بجے ہم ڈیما پور پہنچ گئے۔ پہلے اسے سی ایم ایچ پہنچایا۔ اس نے ہماری کمپنی کا فون نمبر نوٹ کر لیا اور کمپنی تک پہنچنے کی سب باتیں سمجھ لیں۔ میں آئندہ ملاقاتوں کے لیے کمپنی کی بجائے ہسپتال کو بہتر سمجھا تھا مگر چونکہ ابھی اس کی ڈیوٹی اور رہائش کا مسئلہ طے نہیں ہوا تھا' اس لئے اس نے ہسپتال آنے کو منع کر دیا........

میں کیمپ پہنچا تو جمعدار حیات محمد اور صوبیدار گنگا پرشاد کو باری باری یہ خبر سنائی۔ دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہفتے کو جب میں امپھال کے لیے روانہ ہو گیا تھا اور رات بھی وہیں ٹھہرنا تھا' اسی شام کو سارا ہمارے کیمپ میں پہنچ گئی۔ وہ سیدھی آفیسر میس گئی۔ افسروں کے ساتھ چائے پی ........ میرے متعلق پوچھا۔ جب اسے علم ہوا کہ میں ڈیوٹی پر ہوں تو واپس چلی گئیں۔ میں اتوار کو واپس پہنچا تو لیفٹیننٹ فلیچر میرا منتظر تھا۔ وہ تنبیہہ کے طور پر انگلی ہلا رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ میں نے اسے سلیوٹ کیا تو اس نے دوستوں کی طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھا........

"اے حضرت' وہ تمہاری مس سارا آئی تھی۔"



میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لیفٹیننٹ فلیچر میرا پلاٹون کمانڈر تھا مگر میں اس کی بے ضرر طبیعت سے واقف تھا۔ وہ میرا اچھا خاصا دوست بن گیا تھا۔ مجھے حیران دیکھ کر بولا۔

"ہاں آئی تھی ........ کل اس نے ہمارے ساتھ چائے پی تھی۔ آپ کی دوستی کا دعویٰ کر کے اس نے سب افسروں کو حیران کر دیا تھا.........!"

"تو گویا اب خیر نہیں' شاید میجر سینڈھرسٹ مجھے اس ڈیوٹی سے ہٹا دیں۔"

"اوہ لیس" وہ ہنس پڑا۔ سب جیلس ہو گئے ہیں۔ خود میں بھی ہو گیا ہوں۔ فرنٹ پر ایسی خوبصورت لڑکی کی دوستی قسمت سے ملتی ہے۔ تم نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے؟"

دیر تک لیفٹیننٹ فلیچر میرے ساتھ اسی کے متعلق باتیں کرتا رہا وہ کھرا اور صاف ذہن کا آدمی تھا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے ہسپتال میں مس سارا سے ملنے کے اوقات اور رہائشی کمرے کا پتہ دیا.........

دوسرے دن مجھے میس کے ہیڈ ملیا لم خانساماں نے بتایا کہ اس سلسلے میں میجر سینڈھرسٹ اور لیفٹیننٹ فلیچر کی باقاعدہ جھڑپ ہو چکی ہے۔ میجر سینڈھرسٹ سٹیشن ہیڈ کوارٹر کو شکایت کر کے فوری طور پر مجھے اس ڈیوٹی سے ہٹا دینا چاہتے تھے مگر لیفٹیننٹ فلیچر نے انہیں کھری کھری سنائیں.........

"یعنی کیا........"؟ میں نے پوچھا۔

"یہی کہ تم لوگ ایک انگریز لڑکی سے ایک انڈین کی محبت برداشت نہیں کر سکتے۔ تم لوگ عورت کے سلسلے میں حیوانی رویہ رکھتے ہو کہ جو اسے طاقت سے زیر کر لے' اسی کی ہے........ سب افسر خاموش رہے مگر لیفٹیننٹ فلیچر بولتا۔ مسلسل وہی بولتا رہا........ حتیٰ کہ میجر سینڈھرسٹ بھی خاموش ہو گیا تھا.........!"

لیفٹیننٹ فلیچر کی عزت میرے دل میں اور بڑھ گئی.........

اس شام کو جب میں امپھال پہنچا تو سارا سے ٹیلی فون پر بات ہو گئی۔ میں نے میجر سینڈھرسٹ اور لیفٹیننٹ فلیچر کی جھڑپ کا تفصیل سے ذکر کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔

کہنے لگی..........

" میں اس یہودی کے بچے کو ایسا سبق پڑھاؤں گی کہ یاد رکھے گا۔ اس کو پتہ نہیں کہ میں میجر کی طرح تنخواہ نہیں لیتی۔ میں بغیر کسی معاوضے کے ہزاروں میل سے چل کر آئی ہوں۔ میرے لیے سسٹر ہونااس لئے اعزاز ہے کہ یہ فرض اور خدمت ہے۔ میجر سینڈھرسٹ کو شاید اس فرق کا علم نہیں ہے!"

وہ اس قدر جوش میں تھی کہ میں ٹیلی فون پر بھی گویا ایک طرح سے اس کے بپھرے ہوئے چہرے کا ردعمل دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید تسلی دیتے ہوئے بولی۔

" تم فکر مت کرو پیارے لڑکے' سٹیشن ہیڈ کوارٹر اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں میرے مرحوم باپ کو میجر سینڈھرسٹ سے زیادہ لوگ جانتے ہیں۔ میں اسے بتادوں گی کہ جنگ پر آیا ہوا ایک انڈین سولجر اتنا ہی قابلِ احترام ہے' جتنا کوئی انگریز افسر کیونکہ وہ برٹش ایمپائر کے بقا کی جنگ لڑ رہا ہے!"

دوسرے دن ڈیما پور پہنچا تو فورا" ہی میجر سینڈھرسٹ کا بلاوا آگیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اس کے باشے میں گیا۔ اردلی نے اطلاع کی تو فورا" اندر بلا لیا۔ ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ کوئی تمہید باندھے بغیر اس نے بات شروع کی۔

" مجھے مس سارا اور تمہاری دوستی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم جب چاہو اس سے مل سکتے ہو.......... لیکن میں نے مس سارا سے بھی درخواست کی تھی۔ تم سے بھی کہوں گا کہ یہ ملاقاتیں یہاں ہمارے کیمپ میں نہیں ہونی چاہیں کیونکہ ہر دوسرے تیسرے دن عورت کی آمد سے کمپنی کا ڈسپلن ختم ہو جائے گا۔ آج اس کا آف ڈے ہے۔ وہ ہسپتال میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم جانا چاہو تو میری طرف سے اجازت ہے!"

میں عجیب و غریب احساس لے کر باہر نکلا۔ بے چارے میجر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ خدا جانے اس پر کیسا دباؤ پڑا تھا اور مس سارا کس بلا کی عورت تھی۔ اس نے اپنے مالکانہ احساس کا جس دیدہ دلیری سے مظاہرہ کیا تھا۔ خود میں بھی کسی حد تک سہم گیا تھا..........



سرکشی اور احتجاج کی جو لہر کل میرے سینے میں لہرائی تھی' جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ جو لوگ طاقت ور ہوتے ہیں' کیسے درندہ صفت بن جاتے ہیں اور وہ جو کمزور پڑ جاتے ہیں' کس طرح سمجھوتوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اور اس تیسرے آدمی کی تو ابھی تلاش ہی جاری رکھنا ہو گی' جو طاقت ور ہو تو طاقت کا استعمال نہ کرے اور کمزور ہو تو سمجھوتے کی ذلت سے بچ جائے!

* *

سارا سے ملاقات ہوئی تو اس کی گرم جوشی میں اس کی کامیابی کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کی آنکھوں کی یقین افروزی بتا رہی تھی کہ وہ میری آمد کی منتظر تھی......... گویا مجھے تو آنا ہی تھا.........

مگر جانے کیوں مجھے اس کا یہ نازاں رویہ بھلا نہ لگا۔ کافی تیار تھی۔ ہم دونوں بیٹھ گے۔ اس نے پہلا گھونٹ لیا تو بولی.........

"آج رات تم یہیں رہو گے......... ڈنر بھی میرے ساتھ کرو گے۔ یہ پھولوں کا گلدستہ میں نے خود سجایا ہے.........

"میرا کمرہ تمہیں پسند آیا؟ اور اس تمہارے یہودی نے تو ایک ہلے میں ہتھیار پھینک دیئے.........

"اور تم رات کے کپڑے ساتھ لائے ہو۔"

"اتنی بہت ساری باتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف" میں ہنس پڑا۔

وہ اٹھ کر میری گود میں بیٹھ گئی اور اور ہاتھ میری گردن میں حمائل کر دیئے۔ "کیا بات ہے، آج تمہارا رویہ پُرجوش نہیں ہے؟ وہ تمہارا والہانہ مشرقی انداز بھی غائب ہے۔ کیا جیپ والا لڑکا امپھال میں رہ گیا ہے؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا.........





" تم نے مجھے معشوق بنا دیا ہے اور میں تمہاری قبضہ کرنے کی اہلیت سے ڈر گیا ہوں۔"

"ہاں میں تم سے بڑی جو ہوں۔ تجربے میں بھی تم سے بڑی ہوں۔ میری پناہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں تمہاری گارڈ ہوں۔"

" مگر یوں میری مینٹل آزادی ختم ہو جائے گی۔ میری بغاوت کی خوبو کو نقصان پہنچے گا۔ میں اللہ میاں کی گائے بن جاؤں گا کہ جب کسی کا دل چاہا......... دودھ دھولیا.........!"

" لیکن سماجی تحفظ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مینٹل آزادی تو حیوانی رویّے کا نام ہے......... پھر اگر ایسا ہوا ہی ہے تو سماجی جانور بننے میں آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"یعنی میں کتے کی طرح دم ہلاتا جاؤں اور دودھ پیتا جاؤں اور وفاداری کا طوق پہنے رہوں.........؟"

اس نے شرات سے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں.........

"اوہ انڈین بوائے، تم اس قدر ذہین ہو اور ان خیالات کے ساتھ جنگ لڑنے آگئے ہو!"

اس کے جسم کی گرمی میرے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"میں گولی چلانے نہیں آیا تھا۔ جس مقصد کے لیے گھر سے نکلا تھا، وہ کچھ کچھ پورا ہو رہا ہے۔ تم جیسی بے مثال عورت کی دوستی گھر بیٹھے کیونکر حاصل ہو سکتی تھی۔"

"تو تم جنگ لڑنے نہیں آئے۔" اس نے پیار سے میرا کان کاٹ کھایا۔" تو پھر میرے فارم پر چلے جاؤ۔ وہاں سے مجھے پیارے پیارے خط لکھتے رہو۔ مجھے احساس تو ہو گا، کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔"

" میں مستقل انتظار نہیں کرسکتا۔ مجھے آگے بڑھ جانے کی عادت ہے۔ میں ہمیشہ سفر میں رہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے مصنوعی غصے سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

وہ جان چھڑا کر اٹھ گئی۔

"اچھا، تم یہ گرم کھردرے کپڑے اتار دو۔ میں تجھے اپنا پاجامہ دیتی ہوں، لو یہ ٹھیک رہے گا۔آپ کو ذرا سا اونچا ہے مگر کیا حرج ہے میں تمہارے لیے سلیپنگ سوٹ سلوا لوں گی۔"

"مگر ابھی تو ہم نے ڈنر بھی نہیں کیا۔"

"ڈنر میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ کیا میں تمہیں کھردرے یونیفارم میں برداشت کر سکتی ہوں۔ ہاں ہاں اتار دو، ڈنر کے لیے پھر پہن لینا۔"

" تم نے جیپ میں بھی آرڈر دے کر مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ تم آج بھی مجھے حکم دے رہی ہو۔ کیا محبت میں ایسے احکام صادر کیے جاتے ہیں؟"

وہ ہنس پڑی.........

" تنگ نہ کرو پیارے، میری کیفیت تو دیکھو، کتنی جذباتی ہو رہی ہوں ۔ یہ باتیں تسلی سے کریں گے۔ میں تم پر حکومت نہیں کروں گی۔ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس یہودی بچے کی خبر لی تھی۔ ہاں یہ سچ ہے۔ میں تم پر ہر چیز قربان کر سکتی ہوں۔"

وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی۔ یہ سچ اس کی آنکھوں میں موجود تھا۔ اس کے لہجے میں بھی اس سچ کا ارتعاش گونج رہا تھا۔

میں اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا.........

اور میں اس کا ہر حکم مانتا ہی چلا گیا.........

جمعدار حیات محمد کو حیرت تھی کہ میں کورٹ مارشل سے کس طرح بچ گیا ہوں۔ وہ پکا فوجی ذہن کا آدمی تھا اور اس طرح کے واقعات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتا رہا اور حلق میں پھنسی ہوئی آواز کے ساتھ راز کی باتیں پوچھتا تھا۔

اور جب میں اسے سارا کے بوسوں کی گنتی سناتا تھا تو وہ غیر ارادی طور پر اپنی



مونچھ دانتوں میں دبا کر کاٹتا اور توبہ توبہ کرتے ہوئے وضو کرنے چلا جاتا تھا۔

البتہ صوبیدار گنگا پرشاد بہت خوش تھا۔ اس نے سارا کو اس دن دیکھ لیا تھا، جب وہ ہمارے کیمپ میں پہلی بار آئی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

" یار وہ تمہاری میم ہم نے دیکھ لی ہے۔ سسری خوب عورت ہے اس کا قد کاٹھ اور جسم دیکھ کر واقعی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ عیش کر پٹھان عیش کر۔ جنگ تو تمہیں راس آئی!"

لیفٹیننٹ براؤن کی خبر بھی کمپنی کے سارے سپاہیوں میں پھیل چکی تھی۔ گنگا پرشاد اس واقعہ پر بھی بہت ہنستا تھا۔ جب میری اور سارا کی ملاقاتیں عام ہو گئیں تو گنگا پرشاد کہنے لگا.........

" بھئی تیرے ستارے کام کر رہے ہیں۔ نہ سسرے براؤن کی پٹائی کرتے، نہ تجھے یہ ڈیوٹی ملتی اور نہ میمنی سے ملاقات ہوتی اور نہ یہ ٹھاٹ ہوتے۔"

تقریباً" تین ماہ یہ سلسلہ چلتا رہا.........کبھی کبھی خیال آتا۔

ایک رام پیاری کا تقدس تھا جو میری روح کو تھپکی دیتا رہا تھا۔ زرینہ کی دیوانگی تھی، جس نے لڑکیوں میں مجھے مقبول بنادیا تھا۔ افروزہ کی لپک تھی، جس نے صنف مخالف کے لمس کا پہلا ذائقہ دیا تھا اور ایک سارا تھی جو محبت کے بھربھر جام لٹاتی تھی.........

سارا سے ہفتے میں دو بار ملاقات ہوتی......... اگرچہ اسے میرا شدید انتظار ہوتا تھا لیکن خود وہ بھی میرا احتیاج بن چکی تھی......... امپھال سے روانہ ہوتا تو راستے میں اسی کے بارے میں سوچتا.........کیمپ پہنچتا تو سخت بے چینی ہوتی کہ ہسپتال کس وقت پہنچوں گا!

فارم کی سالانہ آمدنی، مکان کا ایک ایک کمرہ اور بنک کا فکسڈ ڈیپازٹ اور اس کا سود یہ سب باتیں وہ مجھے پوری تفصیل سے بتاتی۔اس کے کارندے ہر مہینے حساب بھیجتے۔ وہ ایک شاندار مستقبل کے خواب دیکھتی اور نہایت خلوص سے مجھے گوشوارے بتاتی.........

مجھے یقین آتا جارہا تھا کہ یہ عورت دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتی ہے اور یہ کہ

بنیادی طور پر وہ اچھی عورت ہے اور اس کے کردار میں استقامت ہے.......... اور وہ جو اس کے والہانہ پن نے مجھ میں ایک بے ضرر سی شوخی پیدا کی تھی اور میں اترانے لگا تھا، خود بخود ختم ہوگئی تھی اور میں اس کی عزت کرنے لگ گیا تھا..........اس نے بھی اس چیز کو محسوس کر لیا تھا،یہی وجہ تھی کہ ہمارے رویوں میں پختگی آگئی تھی اور باہمی اعتماد بڑھتا جا رہا تھا..........

یہ ایسے عجیب وغریب دن تھے کہ ان میں مفاہمت بھی تھی' بے قراری بھی اور لذت آفرینیاں بھی..........

سب کچھ اپنا تھا اور نہیں بھی تھا.......... محبت نے جو وقار مجھے دیا تھا۔ ایک سپاہی کے ناتے وہ خطروں میں گھرا ہوا! تھا یا کم از کم مجھے اس کا احساس ہوتا تھا۔ تین ماہ بعد اچانک ہماری کمپنی کا تبادلہ مئو ہوگیا۔ مئو ڈیما پور سے تقریباً" ساٹھ میل اور کوہیمہ سے بیس میل آگے تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ناگا بل کا یہ علاقہ سطح سمندر سے کتنا اونچا تھا مگر یہاں شدید سردی تھی' جب کہ ڈیما پور میں اب موسم خوشگوار ہوگیا تھا۔

ہمارا کیمپ سڑک سے ذرا اوپر دو سربفلک پہاڑوں کے درمیان ایسی تنگ سی گھاٹی میں واقع تھا' جہاں سورج بارہ بجے طلوع ہوتا تھا اور تین بجے نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہاں شدید نمی تھی اور سردی کی وجہ سے راشن کے بکرے ٹھٹھر کر مر جاتے تھے..........

خیموں کے اندر دونوں طرف سبز بانسوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر تختے بنا دیئے گئے تھے۔ یہ تختے زمین سے دو فٹ اونچے ہوتے تھے تاکہ سپاہیوں کے بستر نمی سے محفوظ رہیں۔ لیکن چھ چھ کمبل اوڑھنے کے باوجود سپاہیوں کی ٹھوڑیاں بجتی رہتی تھیں..........
جنوبی ہند کے مدراسیوں نے ایسی سردی بھلا کاہے کو دیکھی ہو گی۔ سپاہیوں نے منہ ہاتھ دھونا چھوڑ دیئے تھے۔ بس وہ تیل مل مل کر چہرے چپکا لیا کرتے تھے..........

کمپنی کے تبادلے کے ساتھ مجھ سے وہ تپچیلی ڈیوٹی چھن گئی اور کمپنی کے ساتھ مئو آنا پڑ گیا..........



شاید یہ غلط ہوگا. لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ہاتھ ہے' جس نے کمپنی کا تبادلہ اس لئے مئو کرا لیا ہے کہ میں سارا سے دور چلا جاؤں۔

سارا کو علم ہوا تو اسے تقریباً" سکتہ ہوگیا۔ اس کے لیے یہ خبر بالکل غیر متوقع تھی۔ جس دن ہم ڈیما پور چھوڑ رہے تھے۔ وہ ہمارے کیمپ آئی تھی اور میس میں بہت دیر تک لیفٹیننٹ فلیچر سے باتیں کرتی رہی تھی۔ جب کمپنی کا سارا سامان گاڑیوں میں لوڈ ہوگیا تو لیفٹیننٹ فلیچر کا بلاوا آگیا۔

میس میں اس سے ملاقات ہوئی تو مسکراتے ہوئے بولی..........

"مجھے خوشی ہے کہ اس کمپنی میں تمہارے دوست بھی موجود ہیں۔ مجھے امید ہے' میجر سینڈھرسٹ تمہیں چھیڑیں گے نہیں۔ میں تم سے ملتی رہوں گی۔ یہاں نہیں تو مئو آؤں گی' خط بھی لکھو گی' میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں!"

لیفٹیننٹ فلیچر ہنس پڑے تھے..........

ہماری کانوائی روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنی ایمبولینس میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ مئو میں ہمیں ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک تلگو سپاہی نے ناگا لڑکی کو جنگل میں پکڑ لیا اور زبردستی اس کی عزت لوٹ لی..........

شام تک ہزاروں ناگا نیزے اور بلم لے کر پہنچ گئے اور ہمارے کیمپ کو گھیرے میں لے لیا.......... ہم لوگ بھی سٹین گنیں اور رائفلیں لے کر چاروں طرف پھیل گئے۔ ناگا شور مچا رہے تھے' نعرے لگا رہے تھے کہ ملزم ان کے حوالے کیا جائے۔

ناگا عورتیں بھی سینکڑوں کی تعداد میں پہنچ گئی تھیں۔ وہ چلا رہی تھیں۔ دانت بھینچ رہی تھیں اور اپنی زبان میں ہمیں کوس رہی تھیں..........

سپاہی سونا ریڈی جس نے یہ کام کر دکھایا تھا' کوارٹر گارڈ میں بند تھا اور اس پر سخت پہرہ تھا۔ جس لڑکی کی عزت لوٹی گئی تھی' اس کی ماں بھوکی شیرنی کی طرح مٹھیاں بھینچ رہی تھی،وہ کئی بار ملزم پر حملے کے لیے آگے بڑھی لیکن رائفلوں پر ننگی سنگینیں چڑھائے مسلح سپاہی اسے روکتے رہے۔ چند ناگے اسے قابو کر لیتے۔

میجر سینڈھرسٹ نے ناگاؤں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ سپاہی کا کورٹ مارشل کیا جائے گا۔ اسے سزا دی جائے۔ لیکن انہوں نے کوئی بات نہ سنی اور ملزم کی واپسی کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہورہے تھے.........

ساری رات وہ شور مچاتے رہے۔ شدید سرد رات میں نہ خود سوئے اور نہ ہمیں سونے دیا......... صبح ان کے سردار کیمپ پہنچ گئے اور ان کو سمجھا بجھا کر واپس لے گئے.........

سپاہی کا کورٹ مارشل ہوا۔ دو سال کی سزا ہوگئی اور اسے کلکتہ جیل بھیج دیا گیا لیکن اس واقعہ کے فوراً بعد ہماری کمپنی کا تبادلہ "مرم" ہوگیا۔ مرم مؤ سے بیس میل اور آگے تھا۔ یہ شاندار جگہ تھی۔ ہمارا کیمپ ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ مؤ کے مقابلہ میں یہاں سورج دیوتا صبح صبح درشن دے جاتا تھا اور شام کو بھی دیر تک اپنی نرم نرم شعاعوں سے نوازتا۔

چاروں طرف پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے تھے۔ یہاں آس پاس ناگاؤں کے بڑے بڑے گاؤں آباد تھے۔

مگر یہاں ڈیوٹی بھی سخت تھی۔ سپاہی تو حسبِ معمول گاڑیاں چلاتے' روڈ پر رہتے۔ پانچ چھ گھنٹے ریسٹ کرنے کے لیے کیمپ میں آ جاتے مگر حوالدار' جے سی او اور پلاٹون کمانڈر بری طرح پھنس گئے تھے۔ ڈیما پور سے فرنٹ لائن پر جانے والی ساری گاڑیاں ہمارے کیمپ میں رکتیں۔ ان کا تیل' پانی اور ہوا چیک کرنا ہماری ذمہ داری تھی۔ ہم نے ڈانگریاں پہنے ہوتیں اور ایئر گیج اور گریس پمپ ہمارے ہاتھ میں ہوتے۔ گاڑیوں کی لائنیں لگ جاتیں۔ ہم اپنے ہاتھوں سے گریس کرتے' ہوا کم ہوتی تو بھرتے اور پھر گاڑی پاس کرتے.........

آٹھ نو گھنٹے کی ڈیوٹی میں ہمارا بھرکس نکل جاتا۔ ہم ہی نہیں انگریز پلاٹون کمانڈروں کے ہاتھوں اور چہروں پر جگہ جگہ گریس کے دھبے لگے ہوتے۔ صرف کیپٹن پکرنگ اور میجر سینڈھرسٹ دو آدمی ایسے تھے جو صاف ستھرے یونیفارم میں نظر آتے تھے۔



ہماری حالت یہ ہوتی کہ ڈیوٹی سے آف ہوتے ہی ڈانگریوں سمیت اپنے اپنے خیموں میں یوں گر جاتے گویا قیامت سے پہلے نہیں اٹھیں گے!

پھر دھیرے دھیرے کام کا دباؤ کم ہونے لگا۔ پلاٹون کمانڈر بے چارے بھی تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ اُن کے کہنے پر نائیک اور لانس نائیک بھی ہمارا ہاتھ بٹانے لگ گئے.........

انہی دنوں ایک سکھ لیفٹیننٹ بلدیو سنگھ اور کوارٹر ماسٹر حوالدار گورنام سنگھ ہماری کمپنی میں تبدیل ہو کر آگئے۔ انڈین افسر کو اپنی کمپنی میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اب آہستہ آہستہ ناگا لڑکیاں ہمارے کیمپ میں آنے لگ گئیں یہ لڑکیاں ٹماٹر' ادرک اور مرغیاں بیچنے آتی تھیں مگر ان کے سودے عجیب ہوتے تھے۔ دس روپے کے عوض ایک ٹماٹر نہیں دیتی تھیں لیکن نمک کا چھوٹا سا ٹکڑا یا پاؤ بھر چاول پکڑا دو تو ٹماٹر اور ادرک ڈھیر کر دیتی تھیں۔ کاغذی نوٹوں کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ جنس کے بدلے جنس کی بات سمجھتی تھیں۔

ایک رات میں اور لیفٹیننٹ فلیچر ڈیوٹی پر تھے۔ مگر فارغ بیٹھے تھے کیونکہ مؤ کے قریب منوں ٹنوں کے حساب سے مٹی کے تودے سلپ کر کے سڑک پر آگئے تھے اور نیچے سے آنے والی گاڑیاں رک گئی تھیں۔ اس طرح کے واقعات اس روڈ پر اکثر پیش آیا کرتے تھے لیکن یہ اتنی اہم سڑک تھی کہ ہزاروں مزدور اس کام پر مامور تھے۔ اس لئے دن رات کام کر کے صاف کردیا جاتا تھا۔

لیفٹیننٹ فلیچر پائپ پی رہا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے شراب کی چسکی بھی لے لیتا تھا۔ شراب وہ مجھے ہمیشہ آفر کرتا تھا مگر میں تو ان دنوں سگریٹ تک کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا اور اپنی خاندانی روایت کا پورا پورا احترام کرتا تھا۔

لیفٹیننٹ فلیچر کے نزدیک یہ بات عجیب تھی کہ میں مس سارا سے جنسی تعلقات کو تو معیوب نہیں سمجھتا تھا مگر سگریٹ اور شراب سے بدکتا تھا۔ اس دن بھی جب میں نے شراب سے معذرت کا اظہار کیا تو اس نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں بھئی' مس سارا کی کچھ خیر خبر کوئی خط وط........"

"نو سر.........!" میں نے جواب دیا۔ "میں تو خود حیران ہوں کہ نہ وہ خود آئی اور نہ خط بھیجا........"

وہ ذو معنی انداز میں مسکرایا۔ شراب کی چسکی لی اور بولا..........

"اس نے آپ کی خبرلی تھی۔ ایک بار نہیں، تین بار اس کا فون آیا تھا۔ ایک بار مئو میں دوبار یہاں، مگر میجر سینڈھرسٹ نے اسے آنے کی اجازت نہیں دی کہ یہ کمپنی کے ڈسپلن کا معاملہ ہے۔"

مجھے اس خبر سے شدید دکھ ہوا۔

"مگر پوری کمپنی کو میری اور مس سارا کی دوستی کا علم ہے سر۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" لیفٹیننٹ فلیچر تحمل سے بولا........ "مگر میرا خیال ہے، یہ ٹھیک ہی ہوا۔ مس سارا اور تم دونوں کے لیے ٹھیک ہوا۔ خصوصاً" تمہاری بہتری اسی میں ہے!"

لیفٹیننٹ فلیچر کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔

"میری اس میں کیا بہتری ہے سر؟"

"تم نہیں جانتے، مس سارا تم سے بہت متاثر ہے۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے بلکہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے"۔

"تو اس میں کیا حرج ہے سر؟" میں نے دکھ اور تحیر سے پوچھا۔

"حرج یہ ہے کہ دوستی میں جو بے ساختگی ہوتی ہے۔ وہ شادی کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جو مس سارا تمہاری جستجو میں ہے، تمہارے لیے پریشان ہے اور تمہاری خاطر میجر سینڈھرسٹ سے ٹکر لیتی ہے اور سٹیشن ہیڈ کوارٹر کے افسروں کے ساتھ رابطہ پیدا کرتی ہے تو یہ سارا چارم اسی میں ہے کہ تم اس کے نہیں ہو اور جب تک اس کے نہیں ہو، مزے لوٹتے رہو۔ کیونکہ یہ مزے تم صرف اس وقت تک لوٹ سکتے ہو، جب تک ایک دوسرے کے کھو جانے کا احتمال ہو۔ اس احتمال کو زندہ رکھو، جتنی دیر زندہ رکھ سکو۔ تمہاری جیت ہے۔ تم سکھی رہو گے۔ یہ سکھ تمہیں شادی نہیں، دوستی دے سکتی ہے!"



میں لیفٹیننٹ فلیچر کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

"لیکن سر، شادی کے بعد یہ سکھ ختم ہو جائے گا۔ اس کا یقین کس طرح ہو۔"

"اس کا یقین تمہیں شادی کے بعد ہوگا۔ چھ ماہ یا سال بعد ہمارا معاشرہ ہو یا تمہارا، روئے زمین کے ہر انسان کا یہی مقدر ہے کہ شادی کے بعد کی ملامتیں اور نفرتیں اس کے حصے میں آئیں۔ لیکن پھر بھی لوگ شادیاں کرتے ہیں، دکھ پاتے ہیں۔ بلکہ محبت کے دھوکے میں دکھ خریدتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے.........ایک وقت تھا، جب زمین کی سب سے حسین ہستی میری محبوبہ تھی۔ اس کے وجود سے آگے کائنات کا کوئی وجود نہیں تھا........ ہم دونوں سمجھتے تھے کہ یہ زمین ہم دونوں سے عبارت ہے۔ اگر حالات ایسے ہوتے کہ ہمیں رومیوجولیٹ جیسے واقعات سے دو چار ہونا پڑتا تو ہم ان سے زیادہ حسین موت مرنے کی ہمت رکھتے تھے ......... یہ واقعہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ جو سال ڈیڑھ سال کورٹ شپ کا عرصہ ہے، ہماری زندگی کا حاصل ہے......... ہم سوچتے تھے کہ اگر محبت یہ ہے اور ہماری مسرتوں کا یہ عالم ہے تو شادی کے بعد گویا جنت میں بسیرا کریں گے۔۔۔

"بدقسمتی یا خوش قسمتی کہ ہم نے اس جنت میں داخلے کا ٹکٹ لے لیا۔ درِ جنت وا ہوا۔ ہم اس میں داخل ہوگئے۔ چار چھ مہینے میں اس جنت کا کونہ کونہ چھان مارا۔ معلوم ہوا کہ بات ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم جنت سے اکتا گئے تھے۔ میری بیوی کی کئی عادتیں مجھے کھٹکنے لگیں......... مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر کام غلط کر رہی ہے۔ میں اسے ہر بات پر ٹوکنے لگ گیا......... مجھے زکام بھی ہو جاتا تو قصور اسی کا گردانتا......... گھر میں کرسی یا ٹیبل سے ٹکراتا تو بھی الزام اسی پر دھرتا۔ انڈا کچا رہ جاتا تو اسے پھوہڑ ٹھہراتا......... ذرا زیادہ پک جاتا تو بھی چلانے لگتا۔ غرض ہر کام میں، ہر بات میں اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا......... شروع شروع میں وہ حیرت کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتی رہی مگر آہستہ آہستہ جواب آنے لگا۔ پھر ترکی بہ ترکی جواب آنے لگا۔ وہ میرے ہر کام میں کیڑے نکالنے لگی اور مجھے نکما ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی تھی......... اب اس کی نظر میں میری ناک بھی پسندیدہ نہیں تھی اور میرے جبڑوں کی ساخت بھی نہایت بے ہودہ تھی۔

میری چال میں مردانہ پن بھی نہیں رہا تھا اور عورتوں کے لیے میری شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی........ اور میں فطرتاً" نہایت گندہ اور لیزی آدمی تھا۔ میں اسے کہتا........ ' تمہیں انتخاب کرتے وقت میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا'........ وہ جواب دیتی........ ' تم کو پسند کرتے وقت میری آنکھوں پر جنس کی پٹی بندھی ہوئی تھی'........ میں کہتا........ ' تم نہایت ذلیل عورت ہو'........ ! وہ کہتی........ ' تم انتہائی کمینے آدمی ہو'........ میں کہتا........ ' تمہاری ماں کی شہرت بھی تم جیسی تھی'........ وہ کہتی........ ' تمہارا تو حسب نسب ہی نہیں ملتا'........!!"

اس نے ہنستے ہوئے بات جاری رکھی........

"مسٹر گل یہ سب باتیں سچ ہیں........ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود ماحول جب بھی سازگار ہوتا........ تو ہم بستری بھی کر لیتے۔ ہم بالکل جانور تھے.....جانوروں کی طرح سینگ پھنساتے تھے اور جانوروں کی طرح سمجھوتے کر لیتے تھے۔ آخر جب نفرت بہت بڑھ گئی تو بات عدالت تک جا پہنچی اور ہم نے ایک دوسرے سے طلاق لے لی!"

میں حیرت سے لیفٹیننٹ فلیچر کی باتیں سن رہا تھا........ وہ مسکرا رہا تھا........

" اب اور سنو........ تم مشرق والے شاید ایسا نہ کر سکو........ الگ ہونے کے بعد میں نے اس کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا تجزیہ کیا........تو سرا سر قصور اپنا نظر آیا۔ ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ میں اس کی ضرورت پھر محسوس کرنے لگا۔ اس سے رابطہ کیاتو معلوم ہوا کہ اسے بھی میری شدید ضرورت ہے۔ اس نے حالات بگاڑنے کا سارا الزام اپنے سر لے لیا اور کہنے لگی۔' مجھے تم سے محبت ہے........ پہلے سے بھی زیادہ' بہت زیادہ'۔خطوط کا تبادلہ ہوا' پھر ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ان ملاقاتوں میں رومانس کی وہی گرمی تھی۔ وہی آب و تاب اور وہی بے تابی ........ مجھے جنگ کے لیے ہندوستان بھیجا گیا تو اس نے سچی محبوباؤں کی طرح آنسوؤں کے موتی لٹائے اور مجھے اس کی جدائی شاق گزری۔ ہندوستان آئے ہوئے بھی دو سال گزر گئے ہیں مگر میں اسے نہیں بھولا ہوں۔ ہر



ہفتے اسے خط لکھتا ہوں۔ ہر ہفتے اس کا خط آتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو ان خطوط کے سہارے زندہ ہوں۔ رومانس انسان کو بے حد تقویت پہنچاتا ہے۔ رومان انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا........

" تو کیا اب آپ ساری زندگی دوستی پر اکتفا کریں گے........؟"

" اگر اس نے پسند کیا تو........ مگر عورت دوستی پر ذرا کم بھروسہ کرتی ہے۔ دراصل اس پر بچہ جننے کا خوف سوار ہوتا ہے اور وہ سماجی تحفظ چاہتی ہے۔ میں رومانس کی مدت کو طول دوں گا۔ زیادہ مجبوری ہوئی تو پنتالیس سال کے بعد شادی بھی کر لوں گا، جس طرح اب ہمارے ہاں فیشن ہو چلا ہے۔ شاید اس عمر میں پہنچ کر جذبات میں تندی اور تیزی نہیں رہتی اور مفاہمت کا شعور بڑھ جاتا ہے اور عام طور پر اس عمر کی شادیاں کامیاب رہتی ہیں۔"

لیفٹیننٹ فلیچر کی باتیں بہت دلچسپ تھیں مگر میری عمر وہ نہ تھی کہ ان کی تہہ تک پہنچ سکتا۔ میں مس سارا سے شادی کرنے اور اس کے ساتھ انگلینڈ جانے میں حرج نہیں سمجھتا تھا۔ میرے سادہ دل باپ نے مجھے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ اس سے بچ نکلنے کا بھی یہ ایک ذریعہ تھا........ اور پھر یہ کہ سارا جس یقین اور حوصلے سے میرے لئے لڑ بھڑ رہی تھی۔ قدرتی بات تھی کہ اس کی قدر میرے دل میں بڑھ گئی اور سینہ جذبات تشکر سے معمور تھا۔

اب تو میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سارا نے مجھے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ جو سنسر ہوئے ہوں گے........ اور اب مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اسے خط لکھوں اور صورتِ حال سے آگاہ کروں........

جمعدار حیات محمد سے ذکر کیا تو اس نے کہا........

"اچھا ہوا بلا سر سے ٹل گئی۔ دو چار مہینے عیش کیا۔ اب اسے بھول جاؤ۔"

لیکن مجھے اُس کی رائے اچھی نہ لگی۔ صوبیدار گنگا پرشاد کو ساری بات کا علم ہوا تو

اسے بہت دکھ ہوا۔ کہنے لگا.........

"اُس سسرے میجر کو دیکھو' سالا مدعی بن کر بیٹھ گیا ہے۔ زنخے سے خود تو کچھ ہوتا نہیں' دوسروں کے روڑے اٹکاتا ہے۔ وہ ہیڈ کلرک سالا تو تمہارا مسلا ہی ہے مگر تمہارے لیے رسک کیوں لے گا۔ سُسرا پنشن پوری کر رہا ہے۔ ورنہ تو خط کھسکانے میں کیا مشکل تھی۔"

"دو چار دن کی چھٹی بھی تو نہیں ملے گی؟" میں نے آسرا لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی۔ وہ تمہیں چھٹی کیوں دینے لگے۔ صاف ظاہر ہے کہ تم ان کی فرنگن سے ملنے جاؤ گے۔ نہیں بھئی یہ خیال چھوڑ دو۔ البتہ میری کوئی ڈیوٹی ڈیماپور کے لیے نکل آئی تو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا......... یہی کہو گے نا کہ میجر بہت حرامی ہے؟"

گنگا پرشاد صحیح کہتا تھا چھٹی کی بات لیفٹیننٹ فلیچر سے ہوئی تو اس نے بھی وہی جواب دیا.........

"میجر سینڈھرسٹ تمہیں چھٹی نہیں دے گا۔ میں اس کی نیچر کو جانتا ہوں' وہ کینہ ور آدمی ہے مگر مجھے مہینے میں ایک آدھ بار تو ڈیما پور جانا ہی پڑتا ہے۔ اب کی جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے چلوں گا!"

مجھے لیفٹیننٹ فلیچر بہت اچھا لگا.........

کچھ دنوں سے چار پانچ لڑکیوں کی ایک ٹولی مستقل ہمارے کیمپ آتی تھیں۔ یہ ناگا لڑکیاں حسبِ معمول تھوڑے سے چاول یا نمک کی ڈلی لے کر مرغیاں پھینک جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی ایسی بھی تھی' جو دو چار قدم دوسری لڑکیوں سے پیچھے رہتی تھی۔ بے حد شرمیلی اور سہمی ہوئی لڑکی تھی۔ شکل وصورت میں بھی منفرد' بغل میں مرغی دبائے ہونٹ کاٹتی رہتی تھی۔ سب کے سودے ہو جاتے تو آخر میں دوسری لڑکیوں کے توسط سے اس کا سودا بھی بک جاتا.........

ایک دن چار کی بجائے دو لڑکیاں آئیں۔ ایک ان میں وہی سہمی ہوئی لڑکی تھی۔ سکھ کوارٹر ماسٹر حوالدار' راشن والے خیمے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ نمک کے ٹکڑے اس کے



ہاتھ میں تھے۔ وہ اشارے سے لڑکیوں کو بلا رہا تھا۔ ان میں ایک لڑکی ہنس رہی تھی۔ اس کے انداز میں نیم دلانہ رضا مندی تھی مگر وہ سہمی ہوئی لڑکی بدستور اپنی جگہ کھڑی تھی.........

سکھ حوالدار برابر ترغیب دے رہا تھا۔ وہ کبھی چاول کی مٹھیاں بھر بھر کر دکھاتا اور کبھی نمک کی ڈلیاں۔ آخر وہ لڑکی ایک قدم اٹھاتی' ہنستی' اپنی ساتھی لڑکی کی طرف مڑ کر دیکھتی اور پھر ایک قدم اور بڑھاتی.........

میں یہ سارا تماشا اپنے پندرہ پونڈ کے خیمے میں لیٹا دیکھ رہا تھا.........

بالآخر لڑکی خیمے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ سکھ حوالدار نے تقریباً آدھ سیر چاول اور نمک کے دو ٹکڑے اس کے لہنگے میں ڈال دیئے۔ اب حوالدار نے اسے اشاروں اشاروں میں سمجھایا کہ تم جاؤ اور دوسری لڑکی کو بھیج دو.........

پہلی لڑکی دوسری لڑکی کے قریب آکر بہتیرا اچکتی رہی۔ مگر وہ نہ مانی اور اپنی جگہ پر اٹل کھڑی رہی۔

حوالدار گورنام سنگھ کی شہرت بہت اچھی تھی۔ اس لئے میں یہ سب کچھ بے حد تجسس سے دیکھ رہا تھا کیونکہ لڑکیوں کو بلانے میں جس انداز کی ترغیب تھی وہ کچھ شریفانہ نہ تھی.........

تنگ آکر لڑکی نے اپنے لہنگے سے چاول دوسرے لڑکی کے لہنگے میں انڈیل دیئے. اور نمک کے ٹکڑے بھی اسے تھمادیئے۔ مرغی اس سے لے کر دوبارہ خیمے تک آئی۔

حوالدار گورنام سنگھ نے شرارت سے پوچھا۔

"وہ نہیں آتی.........؟"

لڑکی نے اس کا مطلب سمجھ کر نفی میں سر ہلایا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ گورنام سنگھ خیمے کے اندر ہوگیا۔ اس نے لڑکی کو اندر آنے کے لیے کہا۔ لڑکی نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ گورنام سنگھ اس کی ہنسی کا مطلب جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر آیا اور لڑکی کو کلائی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ لڑکی شور

مچاتی.......... باہر کھڑی لڑکی زور سے چیخی..........

میں کمبل پھینک کر ننگے پاؤں اس طرف بھاگا۔ سکھ حوالدار نے اسے سینے سے لگا کر مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔ لڑکی اس کے بازوؤں میں تڑپ رہی تھی اور جان چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے سکھ حوالدار کو گردن سے دبوچ لیا اور اس زور سے دبایا کہ اس کا جنسی دم خم نکل گیا۔ اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

"چھڈ دے یار، چھڈ دے..........!"

لڑکی اس زور سے پیچھے ہٹی تھی کہ خیمے کی دیوار کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑی۔ اتنے میں دوسری لڑکی بھی پہنچ گئی تھی اور اسے سہارا دے کر اٹھا لیا تھا..........

میں نے گورنام سنگھ کو چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کرکے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ لیا.......... میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا، وہ سہمی ہوئی اور تشکر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہم تینوں اکٹھے باہر نکلے۔ دو چار قدم چلے۔ میں خیمے کی طرف مڑا تو وہ دونوں رک گئیں۔ میں بھی رک گیا..........

وہ جو سہمی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ جو ہمیشہ ڈری ڈری سی پیچھے کھڑی رہتی تھی اور دوسروں کے توسط سے سودا بیچتی تھی۔ اس وقت بالکل مختلف لڑکی نظر آ رہی تھی۔ وہ آنکھ جھپکائے بغیر ایک طلسمی تسلسل کے ساتھ مجھے تکے جا رہی تھی!

یہ پہلا موقع تھا کہ میں اسے اتنا قریب سے دیکھ رہا تھا..........وہ نو شگفتہ کلی کی طرح بے داغ تھی۔ اس کا چہرہ ہلکے گلاب کی پنکھڑی کی طرح تر و تازہ تھا۔ میں اس کی چمک دار آنکھوں کی طلسمی تب و تاب کے معنی ڈھونڈ رہا تھا کہ یہ جذبہ تشکر ہے یا پہچان کا کوئی نیا سلسلہ؟

یہ ایسی تابدار نگاہیں تھیں کہ میرا کلیجہ دہل گیا اور میری نگاہیں جھک گئیں۔

جب میں نے دوبارہ نظریں اٹھائیں تو ان کی میری طرف پشت تھی۔ وہ ایک دوسری کے کندھوں پر ہاتھ ڈالے نیچے اتر رہی تھیں۔ میں خیمے کے اندر بستر میں بیٹھ گیا۔ ان دنوں کا رخ مرم گاؤں کی طرف تھا، جو ہمارے کیمپ سے چھ میل اوپر ایک اونچے پہاڑ



کی سطح پر واقع تھا۔

میں سوچ رہا تھا..........

گورنام سنگھ کا اشارے کرنا۔ لڑکی کا آنا، دبوچا جانا، میرا اٹھ کر پہنچنا، گورنام سنگھ کا گلا دبانا، لڑکیوں کے ساتھ باہر آنا اور غیر متوقع نگاہوں کا ٹکرانا۔ یہ ساری کارروائی پندرہ بیس منٹ سے زیادہ کی نہ تھی۔ مگر یہ پندرہ بیس منٹ کیا تھے..........

کہ فطرت اپنی راہ چلی..........

ضمیر نے اپنی راہ پائی..........

اور دل اپنی ڈگر پر چل پڑا..........

یہ ساری غیر شعوری حرکتیں تھیں اور مجھے خیال آ رہا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، جذباتی سطح پر ہوتا ہے۔ شعور دیکھتا رہ جاتا ہے اور زندگی اتھل پتھل ہو جاتی ہے۔ ابھی میں پوری طرح خالی الذہن نہیں ہوا تھا کہ کوارٹر ماسٹر حوالدار آ گیا اور مجھ سے لپٹ گیا..........

"یار اچھا ہوا، تم پہنچ گئے، ورنہ گورو جانے کیا ہوتا۔ تم نے مجھے مصیبت سے بچا لیا۔"

میں ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا..........

"میں تو پاگل ہی ہو گیا تھا۔" گورنام واقعی کانپ رہا تھا.......... "یہ میری زندگی کی پہلی بھول تھی۔ گورو کا واسطہ کسی سے ذکر نہ کرنا.......... میں تمہارے پاؤں چھوتا ہوں!"

میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے..........

"مٹی ڈالو یار، بات ختم ہو گئی.........."

"گورو کی سوں۔" وہ گڑگڑایا۔ "کورٹ مارشل سے بچ گیا ہوں۔ قید تو ہونا ہی تھا مگر باپ کا سامنا کیسے کرتا کہ میں نے ایک لڑکی کی عزت لوٹی تھی!"

مجھے اپنی کمپنی کا سپاہی سونا ریڈی یاد آ گیا، جو ناگا لڑکی کی عزت لوٹ کر قید ہو چکا تھا۔ وہ بھی ہماری کمپنی کا نہایت شریف سپاہی تھا۔ جانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا کہ وہ سب

کچھ بھول گیا تھا اور جنگل میں منگل منا بیٹھا..........

ایک کمزور لمحے کی قیمت، کورٹ مارشل، قید اور رسوائی........

گورنام سنگھ میرے رویے کو جان گیا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا..........

میں رات کی ڈیوٹی کر کے آیا تھا اور اس وقت مجھے گھوڑے بیچ کر سونا چاہیے تھا مگر اس واقعے کے بعد نیند اڑ گئی تھی.......... میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ حتیٰ کہ شام ہو گئی اور میں دوبارہ ڈیوٹی پر چلا گیا..........

رات کو چار بجے ڈیوٹی سے آف ہوا تو خیمے میں آتے ہی ڈانگری سمیت سو گیا۔ شام کے چار ساڑھے چار بجے آنکھ کھلی۔ پلاٹون کا لنگر میرے خیمے کے بالکل قریب تھا۔ میں نے لانگری کو چائے کے لیے آواز دی..........

"آتا ہوں سر.........." نارائن کی آواز آئی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد لانگری چائے کے ساتھ روسٹ مرغی بھی لے آیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ راز دارانہ لہجے میں بولا۔

"سر.........ایک ناگا لڑکی لایا تھا۔ بہت صبح صبح آپ سو گیا تھا۔ وہ چوروں کی طرح آپ کے خیمہ کے گرد گھوم رہا تھا۔ ہم سو کر اٹھا تھا۔ آگ جلا رہا تھا۔ نظر پڑی تو اس کو ٹوکا۔ وہ گھبرا گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ وہ ڈرا ڈرا ہم کو دیکھ رہا تھا۔ ہم نے پوچھا، کیا بات ہے؟ تو اس نے ہم کو مرغی پکڑا دیا اور آپ کے خیمے کی طرف اشارہ کیا؟ ہم نے پوچھا، صاحب کے لیے ہے؟ تو اس نے سر ہلا کر ہاں کیا!"

میں نے بے تابی سے پوچھا.........."پھر.........؟"

"پھر وہ چلا گیا سر۔ آپ کے خیمہ کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا رہا.........."

"پھر.........؟"

"پھر سر......... ہم نے مرغی حوالدار میجر سے ذبح کرایا اور آپ کے لیے روسٹ کر دیا.........."

مجھے مدراسی لانگری بہت پیارا لگا..........



"اچھا! تو تم نے اسے غور سے دیکھا ہو گا کیسی تھی وہ.........."

"بیوٹی فل سر! بالکل کنوارا تھا، ورجن۔ اس کا لنگا وائٹ تھا......... اور بلاؤز بلیک!!"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا..........

"اچھا ٹھیک ہے۔ کسی سے ذکر نہ کرنا.........."

"نہیں سر نہیں، ہم نے حوالدار میجر کو بھی نہیں بتایا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ہم نے ڈنڈوت مار دیا.........لیفٹیننٹ براؤن بھی لنگر کا معائنہ کرنے آیا تھا۔ اس وقت ہم مرغی روسٹ کر رہا تھا۔ بولا.........کس کا ہے، ہم نے کہا، حوالدار گل کا، سالا چپ ہو گیا اور بھاگ گیا۔"

میں ہنس پڑا......... وہ گپ مارنے کو ڈنڈوت مارنا کہتا تھا......... مجھے موڈ میں دیکھ کر چہکنے لگ گیا تھا..........

"سر.........وہ ڈیما پور والا سسٹر بھی بہت ہینڈسم تھا۔ مگر صبح والا ناگا گرل کا بھی جواب نہیں۔ آپ بہت لکی ہیں سر!"

"اچھا۔ اب تم جاؤ۔ اگر میں سو گیا تو سات بجے اٹھا دینا۔"

"اچھا سر.........."

وہ چلا گیا۔ مگر مجھے امتحان میں ڈال گیا.........مرغی بے حد لذیذ روسٹ ہوئی تھی........ مگر اس سے زیادہ خیال انگیز تو یہ اطلاع تھی، جو وہ ناگا لڑکی کے بارے میں دے گیا تھا.........

کیا وہ، جسے گورنام سنگھ کھینچ کر لے گیا تھا؟

اور یا وہ، جس کی سہمی سہمی خاموشی میں قیامت کی گویائی تھی؟

میرے سینے میں ہلچل مچی تھی۔ میں جذباتی ہو رہا تھا اور یہ جاننے کے لیے بیتاب تھا کہ یہ لحہ میں نے نیکی یا فرض کے زور سے جیتا ہے یا اپنی شخصیت کی وجہ سے مسخر کیا ہے؟

کم از کم دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ جیت میری شخصیت کی ہو۔ کیونکہ نیکی اور فرض کے زور سے تو ہر آدمی میدان مار سکتا ہے.........!

رات کی ڈیوٹی پر بھی میں سرشار رہا......... مسرت بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ خوشی کا کوئی تازہ جھونکا سوچوں میں در آتا تو انسان پچھلی ساری مسرتیں بھول جاتا ہے......... سب کچھ خواب و خیال ہو جاتا ہے اور تازہ حقیقت اصل حقیقت بن جاتی ہے.........!!!

❀ ❀

اگلی صبح چار بجے ڈیوٹی سے آف ہو کر خیمے میں لیٹ گیا۔ آج میں نے خیمے کے سامنے والے پردے گرانے کے بجائے، الٹا کر خیمے پر ڈال دیئے تھے۔ اس امید پر کہ وہ آج بھی آئے گی اور میں اس کی حرکات و سکنات کا بخوبی جائزہ لے سکوں گا.........

ایک تجربہ مجھے ہوا ہے کہ عشق و محبت کے جذباتی دَور میں انسان جن ناممکنات کو عملی شکل میں دیکھنے کا متوقع ہوتا ہے وہ اکثر ممکنات میں بدل جاتے ہیں.........

نیند نہیں آرہی تھی......... میں کمبل اوڑھے، ذرا سا منہ ننگا کیے، ڈھلوان پر نظریں جمائے بیٹھا......... میرا خیمہ، سڑک اور کوارٹر گارد کے خیمے کے بالکل مخالف سمت، پلاٹون کے آخری سرے پر لگا ہوا تھا۔ اس لئے یہ میرے نقطۂ نگاہ سے محفوظ علاقہ تھا.........

تقریباً" پانچ بجے کا وقت ہو گا۔ پَو پھٹنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں تھی کہ میں نے ڈھلوان پر ایک سایہ سا رینگتا ہوا محسوس کیا......... میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگ گیا۔

ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح ایک سوال میرے ذہن میں آیا اور نکل گیا.........

کہ ایک لڑکی جو تقریباً" چھ میل کی پہاڑی مسافت کے بعد، صبح کا ذب کے وقت یہاں موجود ہو......... وہ رات کو گھر سے کس وقت نکلی ہوگی.........؟ اور وہ کتنا طاقت ور

جذبہ ہو گا جو اسے گھور اندھیروں میں کشاں کشاں یہاں لایا ہو گا؟

وہ اوپر پہنچ گئی تھی اور اب دائیں بائیں آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا.........

یہ وہی لڑکی تھی' جو ڈری ڈری پیچھے پیچھے رہتی تھی.........

یہ وہی لڑکی تھی' جس کی سہمی سہمی خاموشی میں قیامت کی گویائی تھی.........

یہ وہی لڑکی تھی' جو دوسری لڑکیوں کے توسط سے سودا بیچتی تھا.........

ہاں......... یہ وہی لڑکی تھی کہ سماں آیا تو ہر خوف جاتا رہا.........

آج وہ سودا بیچنے نہیں آئی تھی.........

من ڈھونڈنے آئی تھی.........

ہارے ہوئے من کی تلاش میں نکلی تھی.........

وہ دھیرے دھیرے' قدم قدم' آہستہ آہستہ' خیمے کے قریب آ گئی اور بانس کے ڈنڈے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ چپ چاپ خاموش۔ میں نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا سفید لہنگا نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف چہرہ اور ننگے پاؤں نظر آ رہے تھے' جن سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور میرے چہرے کے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے آنکھیں موندھ لیں' اور نہایت ضبط کے ساتھ اس کی نگاہوں کی تجلی اپنے چہرے پر برداشت کرتا رہا۔ کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا کہ اس کے بدکنے کا اندیشہ تھا۔

پکڑ بھی نہیں سکتا کہ یہ انوکھی پوجا تھی۔

دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ تجسس کا خون ہو جاتا.........

یہ بے حد ولولہ انگیز کیفیت تھی.........

تقریباً" پندرہ منٹ بعد جب صبح کاذب میں صبح صادق نفوذ ہو رہی تھی' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پلکوں کے چھید میں سے پھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ میرے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ پھر وہ دبے پاؤں چل دی.........



جب ڈھلوان سے اتر گئی تو میں اپنے بستر میں اٹھ بیٹھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن خیمے میں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے اس نے نہ دیکھا ہو گا کہ میں جاگ رہا ہوں اور سب کچھ دیکھ رہا ہوں.........

پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی.........

میری وہ کیفیت کہ پہلے سنی نہ دیکھی تھی۔ ایسی ترنگ کہ ہواؤں میں اڑا جا رہا ہوں.........

ایسی سرشاری کہ رُوں رُوں پر قلب کا گماں ہو رہا تھا.........

اب صبح ہو گئی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ مگر میرا خیمہ روشن ہو چکا تھا۔ میں نے نارائن کو چائے کے لیے آواز دی.........

" آتا ہوں' سر"......... نارائن کی آواز آئی.........

تھوڑی دیر بعد وہ چائے کا مگ بھر کر لے آیا۔ کہنے لگا۔

" سر' آپ تو صبح چار بجے ڈیوٹی سے آف ہوا ہے۔ آج آپ سویا نہیں؟"

" نہیں نارائن"۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا.........

"کیوں سر' طبیعت تو ٹھیک ہے.........؟"

" ہاں ٹھیک ہے' بس تھوڑی دیر میں سو جاؤں گا۔"

" یہ کیا ہے سر.........؟" اس نے میری چارپائی نما بانس کے تختوں کے نیچے سے ایک پوٹلی اٹھائی۔ میں نے حیرت سے پوٹلی کو دیکھا۔ نارائن نے جلدی جلدی گانٹھ کھولی۔ پوٹلی میں سے ڈھائی تین درجن کے قریب انڈے نکلے۔ نارائن کی آنکھیں چمکنے لگ گئیں.........

"سر' وہ ناگا لڑکی آج پھر آئی ہوگی۔ ہم نے دیکھا نہیں مگر یہ اسی کا کام ہے۔ سر' بائی گاڈ اُسی کا ہے........."

" ہاں نارائن' لگتا ہے۔ لگتا تو ہے!" میں نے خوشی دباتے ہوئے کہا.........

"سر' وہ آپ کو لَو کرتی ہے۔ بائی گاڈ اس کی آنکھ میں لَو تھا۔ ہم نے کل دیکھا

تھا۔"

"ناراض۔" میں نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "یہ بات کمپنی میں پھیلنا نہیں چاہیئے۔ تم جانتے ہو' میجر سینڈھرسٹ مس سارا کی وجہ سے مجھے پسند نہیں کرتا۔"

"حوالدار سر!" وہ جذباتی ہو گیا۔ "ہم ایسا گندہ آدمی نہیں ہے۔ ہم کو اپنی ماتا کا قسم' ہم سچ بولتا ہے۔ اس کمپنی میں سب سے زیادہ لو ہم آپ کو کرتا ہے!"

وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں خلوص کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ غلط آدمی نہیں ہے۔ وہ میرا ماتحت تھا۔ وہ میری پلاٹون کا لانگری تھا۔ لیکن اِس سب کے باوجود میں یہ بات جانتا تھا کہ وہ دل سے میری عزت کرتا ہے اور اس کی خدمت گزاری میں جذبے کا عنصر نمایاں ہے.........

اس کے بعد وہ ہر رات آتی رہی۔ کوئی نہ کوئی تحفہ لاتی رہی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ مجھے جگائے۔ مجھ سے بات کرے اور اپنی طلسمی نگاہوں کا راز افشا کرے مگر وہ تو گویا پھول چڑھانے آتی تھی.........

درشن کر کے چلی جاتی.........

گو اس میں بھی ایک مزہ تھا۔ اس میں بھی ایک جذبہ تھا مگر میں اب وہ لڑکا تو نہ تھا جو رام پیاری کی راہ دیکھتا تھا۔ مجھے تو مس سارا نے راہ لگا دیا تھا۔

پانچویں دن جب وہ اٹھ کر جا رہی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا مگر اس نے جھٹک کر ہاتھ چھڑا لیا اور ہرن کی طرح نکل بھاگی۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگ نکلا.........

اب وہ آگے اور میں پیچھے۔ وہی پو پھٹنے کا سماں تھا۔ وہ ہوا سے باتیں کر رہی تھی مگر میں نے بھی پہاڑوں میں جنم لیا تھا اور خرگوشوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے لڑکپن گزارہ تھا۔ میں اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا.........

لیکن ایک ترجیح اسے حاصل تھی کہ راستے سے واقف تھی اور مجھے نچ دے جاتی تھی......... مگر اس چال بازی میں جو دو چار گز کا فرق پڑ جاتا تھا' میرے مردانہ گام اسے



سمیٹ لیتے تھے.........

اب چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ روشنی بڑھ گئی تھی۔ اس کی سیاہ چادر اڑ رہی تھی۔ اس کی گلابی پنڈلیاں انجن کے پسٹن کی طرح متحرک تھیں.........

ایک آدھ بار اس نے مڑ کر دیکھا مگر نہ دیکھنے کے برابر' کیونکہ میں بہت قریب تھا۔ پکڑے جانے کے اندیشے سے وہ آگے بڑھ گئی تھی.........

تقریباً" ایک میل کے بعد جب وہ ایک پودے کے ساتھ ذرا سا الجھ گئی تھی۔ میرا ہاتھ پشت کی جانب سے اس کے سیاہ بلاؤز پر جا پڑا......... وہ آہ کر کے مڑی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی......... ہم دونوں ہانپ رہے تھے۔

ہماری آنکھیں ایک دوسرے میں گڑ کر رہ گئیں.........!

وہ جو ایک سہا ہوا انداز' ایک سہمی ہوئی سپردگی' اس کے خمیر میں تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں موجود تھی۔ مگر ان شفاف جھیلوں کی گہرائیوں میں کہیں دور ایک معصوم سی شرارت جگمگا رہی تھی.........

کاش......... ! زندگی یہیں رک جاتی۔ کائنات یہیں جام ہو جاتی......... زندگی اس سے زیادہ خوبصورت لمحہ تخلیق نہیں کر سکتی تھی.........!!

کچھ دیر بعد میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا......... وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی مگر بھاگی نہیں.........

وہ اُسی تیکھے انداز میں دیکھے جا رہی تھی.........

اس کی نگاہیں سیدھی میری روح میں اتر رہی تھی اور وہاں ایک قیامت برپا تھی ......... نہ اس کا نام جانوں' نہ ماں باپ کا' میرا شجرہ نسب بھی وہ کب جانتی ہے۔ نہ وہ میری زبان جانے اور نہ میں اس کی۔ مگر پھر بھی.........

ہم کس قدر واضح مفہوم کے ساتھ ایک دوسرے کو جان رہے تھے!

یہ ہوتی ہے محبت۔!!

ایک وہ بھی محبت تھی۔ جو مجھے مس سارا نے دی تھی.........

"کم اِن سارجنٹ۔ یس کم اِن!"

اور ایک یہ بھی محبت تھی کہ آسمانوں سے اتری اور روح میں اُجالا کر گئی۔

اب سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرنوں سے ہمارے کیمپ کے خیمے جگمگا رہے تھے۔ یہاں سے ہمارا کیمپ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میرا خیمہ جس کے سامنے کے پردے اٹھے ہوئے تھے' کیمپ کی آنکھ معلوم ہوتا تھا۔

چاروں پلاٹونوں کے خیموں سے دھوُاں اٹھ رہا تھا.........

میں جو ٹرانسپورٹ کمپنی کا سپاہی تھا' انفنٹری کے سپاہی کے مقابلہ میں کتنا خوش قسمت تھا۔ ہم دونوں محاذ پر تھے مگر میرے محاذ اور اس کے محاذ میں کتنا فرق تھا۔ وہ اس وقت مورچے میں بیٹھا تھا اور میں ایک بے مثال لڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مورچہ نہیں چھوڑ سکتا تھا......... مگر میں کیمپ سے ایک میل دور تھا۔ یہاں تک تو میں سیر کے لیے بھی آسکتا تھا۔

ایک خوبصورت لڑکی کے۔ قرب نے مجھے احساس برتری سے دو چار کر دیا تھا۔ گویا ٹرانسپورٹ کمپنی میں بھرتی ہو کر میں نے بے حد دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا کہ اپنے لیے مواقع فراہم کیے یعنی یہ خوشی میں نے زورِ بازو سے جیتی تھی!

میں جو اپنی مسرت کے ردِ عمل کے طور پر چند لمحوں کے لیے کیمپ اور مورچے سے ہو آیا تھا......... دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی تھی......... مجھے خیال آیا......... کہ میری ناک ناگاؤں کے مقابلہ میں بڑی اور کھڑی ناک ہے۔ اس لڑکی کو اسی طرح پسند آئی ہوگی' جس طرح مجھے اس کی چھوٹی سی ناک' ستواں نہ ہونے کے باوجود اچھی لگی ہے.........!

ایک بات جو مجھے عجیب لگی' وہ اس کی مسلسل ٹکٹکی تھی۔ وہ آنکھ بہت کم جھپکتی تھی۔ میں نے اس طرح کی شیفتگی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس کے سہمے سہمے انداز میں بےباکانہ محویت چیز ہی دوسری تھی......... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذرا سا لحظہ بھی جو آنکھ جھپکنے میں ضائع ہو سکتا تھا' اسے گوارا نہ تھا.........



لیکن یہ بھی عجب تھا کہ میں زیادہ دیر تک اس طلسمی ٹکٹکی کی تاب نہ لا سکا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس کی آنکھوں سے ہٹ کر اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگ گیا تھا.........

اس کی خوبصورت پنڈلیاں' اس کے گول شانے اور اس کا کسا ہوا جسم۔اس کی ٹکٹکی سے بھی زیادہ دلفریب اور اثر آفرین تھا.........

میں نے اس کا ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی ہتھیلی انار کے سرخ سفید دانوں کی طرح رنگ بدل رہی تھی۔ میں نے ریشم کی طرح نرم ہتھیلی میں انگلی ڈبوئی تو چاروں طرف سے خون کی دھاریں لپک کر منے سے کنوئیں میں گر پڑیں۔ انگلی اٹھائی تو کنوئیں کی جگہ سفید چاند نظر آیا۔ دھاریں اسی بے تابی سے لپک کر غائب ہو گئیں!

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ کھٹ کھٹ ہنس پڑی اور میں دیکھتا رہ گیا' اس شگوفے کو جو اچانک کھل گیا تھا۔ یہ ہنسی نہیں تھی۔ وہ انمول راز تھا جو خدا نے غلطی سے زمین پر بھیج دیا تھا.........!

اور یہ میں تھا......... میری تقدیر تھی کہ اس راز کا والی تھا!

میں اسے کھینچ کر ایک چٹان پر لے آیا۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ اب وہ بھی مسکرا رہی تھی' میں مسکرا رہا تھا' یہ عجیب خوشی تھی۔ عجیب کیفیت تھی۔ میں نے بے حد لگاوٹ سے اسے آغوش میں لے لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی مگر وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی......... عین قریب تھا کہ میں اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیتا کہ ایک نسوانی چیخ نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ بدک کر کھڑی ہو گئی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم سے صرف چند گز کے فاصلے پر وہ لڑکی کھڑی تھی' جسے پچھلے ہفتے گورنام سنگھ زبردستی پکڑ کر خیمے کے اندر لے گیا تھا.........

میں نے مڑ کر دیکھا تو میرا ساتھی بھی غائب تھا۔ وہ ہرن کی طرح پلانگیں مارتی ہوئی پہاڑ پر چڑھ رہی تھی۔ میں ہنس پڑا۔ اس کا پیچھا بھی نہ کیا۔ اب وہ دوسری لڑکی بھی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ حتیٰ کہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئیں.........

میں بھی کیمپ میں واپس آ گیا۔ نارائن کو آواز دی اور بستر میں لیٹ گیا۔ اس وقت میں خالی الذہن تھا، جیسے کوئی خوبصورت خواب دیکھ کر انسان کو افسوس ہوتا ہے کہ آنکھ کیوں کھل گئی۔ مگر کچھ دیر بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے اور خالی الذہن ہونے کا احساس باقی نہیں رہتا.........

نارائن چائے لے آیا اور بولا.........

"سر ہم نے دو تین بار خیمہ میں دیکھا، آپ نہیں تھا۔ صبح صبح کدھر چلا گیا تھا؟"

میں ہنس پڑا.........

"سیر کو گیا تھا نارائن۔ بہت مزہ آیا۔"

"سر گرم گرم پوڑی لاؤں؟ سپاہی لوگ ناشتہ کر رہا ہے۔"

"ہاں لے آؤ۔"

نارائن چلا گیا......... میں ناشتہ کر کے جمعدار حیات محمد کے خیمے میں گیا تو وہ بھی ناشتہ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر گپ شپ ہوئی، پھر میں نے پچھلے ہفتے کی ساری روئداد سنائی۔ وہ مجسمۂ حیرت بنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ حسب معمول کانوں کو ہاتھ لگائے......... اور بولے.........

"تم نوکری کرنے نہیں آئے گل۔ میں سچ کہتا ہوں، کسی دن پھنس جاؤ گے۔"

اردلی کو بھیج کر اس نے صوبیدار گنگا پرشاد کو بھی بلوالیا اور فوراً رام کہانی شروع کر دی.........

"صوبیدار صاحب اپنے یار کو سمجھاؤ۔ ایک نیا گل کھلا بیٹھا ہے اس شخص کا ضرور کورٹ مارشل ہو گا........."

صوبیدار گنگا پرشاد مسکرایا۔ وہ جمعدار صاحب کے مزاج سے واقف تھا۔

"بات کیا ہے بھئی۔ کچھ پتہ تو لگے۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی مسکرا رہا تھا مگر جمعدار حیات محمد نے نہایت سنجیدگی سے جو کچھ مجھ سے سنا تھا، لفظ بہ لفظ کہہ سنایا.........



صوبیدار گنگا پرشاد حسبِ عادت مسکرا پڑا اور مزے لے لے کر جمعدار حیات محمد کی باتیں سنتا رہا.........

"بات یہ ہے۔" صوبیدار گنگا پرشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر اس پٹھان کی تقدیر میں حرام لکھا ہوا ہے تو میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔ اب دیکھئے کوشش گورنام سنگھ نے کی، پانسہ اس کے نام پڑا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ جو چانس پٹھان کو ملے مجھے ملتے تو میں بھی فائدہ اٹھاتا!"

"کمال ہے۔" جمعدار حیات محمد حیرت سے بولا۔ "آپ اسے سمجھاتے نہیں الٹا اس کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں اگر لڑکی کیمپ میں پکڑی گئی تو.........؟"

"کون پکڑے گا لڑکی کو، میجر سینڈھرسٹ خود تو رات ڈیوٹی دینے سے رہا۔ گورنام سنگھ پہلے ہی بھیڑ بن چکا ہے۔ اس کا خیمہ قریب ہے نا اور پھر ہم مرم اس کے پیچھے نہیں جاتے، خود لڑکی ہمارے پاس آتی ہے۔ بس تھوڑی بہت احتیاط کی ضرورت ہے وہ پٹھان کرتا رہے گا۔ کیوں بھئی؟"

"کیوں نہیں صاحب وہ تو بہر حال ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بھئی وہ سسرے اپنے پلاٹون کمانڈر کو بھی اعتماد میں لے لینا، قلندر آدمی ہے۔ تمہارا پکا دوست ہے۔ ہر موقع پر مدعی بن جاتا ہے۔"

صوبیدار صاحب کی رائے مجھے پسند آئی۔ خود میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی کہ لیفٹیننٹ فلیچر سے بات کی جائے، وہ کھلے ذہن کا آدمی تھا۔ اس کا رویہ ہمیشہ اپنا ہی ہوتا تھا۔ البتہ جمعدار حیات محمد خاموش ہو گیا تھا کہ اس کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

رات کو گیارہ بجے جب میں نے ایک گاڑی کا تیل پانی اور ہوا چیک کر کے لیفٹیننٹ فلیچر کو "او کے" کی رپورٹ دی تو وہ بولا۔ "ٹھیک ہے جانے دو۔"

میں نے گاڑی پاس کر دی تو وہ بولا۔

"مسٹر گل اگلے ہفتے ڈیما پور کے لیے سرکاری کام نکل آیا ہے، تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔"

میں جان گیا کہ وہ مجھے مس سارا سے ملنے کی خوشخبری سنا رہا ہے مگر میں نے خاص گرم جوشی کا اظہار نہ کیا اور مسکرا کر کہا۔

"سر آپ ہی نے کہا تھا کہ میری بہتری اسی میں ہے کہ مس سارا سے تعلقات ختم ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے مگر میں تم دونوں کی دوستی پر اعتراض نہیں کرتا۔"

"سر اگر آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاؤں گا' ویسے میں یہاں رہنا پسند کرونگا۔"

"واٹ.........!" وہ حیرت سے بولا۔ "یہاں کیا دلچسپی ہے۔ ساری رات گاڑیوں میں گریس بھرتے ہو' دن کو سو جاتے ہو' رات کو پھر گریس بھرنے پہنچ جاتے ہو۔ اس جنگ نے ہمیں حیوانوں کی سی زندگی کا عادی بنا دیا ہے۔ شاید اس لئے تم یہاں رہنا پسند کرتے ہو؟"

"سر جنگ نے مجھے وہ تجربہ نہیں دیا جو آپ کو دیا ہے۔ میرے لیے تو جنگ مسرت ہی مسرت ہے۔"

"اگر تم مس سارا کی محبت کو مسرت کہتے ہو تو میں مانتا ہوں مگر وہیں تو تجھے لے جارہوں اور تم جانے سے انکار کرتے ہو۔ پھر آخر مرم کیمپ میں کون سی دلچسپی ہے؟"

"سر.........." میں ہنس پڑا۔ "میں ایک نئی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں!!"

لیفٹیننٹ فلیچر نے چونک کر میری طرف دیکھا.........

"ہاں سر.......... مس سارا کی محبت جسمانی تجربہ تھا۔ یہ تجربہ مجھے پسند آگیا تھا۔ مگر جو تجربہ اب ہوا ہے پہلے سارے تجربوں سے بازی لے گیا ہے۔ میری روح نے اس تجربے میں جو توانائی محسوس کی ہے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی!"

"یعنی کوئی اور لڑکی ہے۔" وہ حیرت سے بولا۔ "مگر کون' اس ویرانے میں ایسا محبت بھرا دل کہاں سے ملا.........؟"

"سر وہ ایک ناگا لڑکی ہے۔" میں نے دھیرے سے بتا دیا۔

"ناگا گرل........" اس نے حیرت اور جوش کے لہجے میں کہا......... "کہاں ملی؟



کیسے ملاقات ہوئی اس سے؟"

میں اسے دھیرے دھیرے گذشتہ دنوں کی تفصیل سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی چمک بتدریج بڑھ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ سارا راز خود اس کا راز ہے اور جو کچھ بیتی ہے......... اس پر بیتی ہے.........

اس نے مسکراتے ہوئے پائپ بھرا آگ جلائی۔ ایک دو کش لیے پھر اسی مُسکان کے ساتھ میری طرف دیکھا.........

"مسٹر گل تمہیں ایک فن کار کی فطرت ملی ہے اور ہماری طرح ایک جگہ رکنے کی عادت نہیں ہے۔ تم ہمیشہ محبت ہی کرتے رہو گے اور ہر محبت سے نئی زندگی شروع کرو گے۔ ہر محبت تمہیں نیا ولولہ دے گی اور ہر محبت تمہیں نئی توانائی بخشے گی۔"

"سر میرا خیال تھا کہ یہ میرے کردار کی کمزوری ہے کیونکہ ان دو لڑکیوں کے علاوہ میں اپنے گاؤں کی تین اور لڑکیوں سے محبت کر چکا ہوں؟"

"یہ ایک ہی کہانی ہے......... بالکل ایک سی۔ جو لوگ کردار کے کچے ہوتے ہیں' دراصل وہی کردار کے پکے لوگ ہوتے ہیں کیونکہ یہی ان کا فطری کردار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ تہذیبی دباؤ قبول نہیں کرتے اور شیر کی طرح ان کی فطرت گرجتی رہتی ہے۔ اس گرج کو کوئی کنٹرول نہیں کر سکتا۔"

لیفٹیننٹ فلیچر کی باتیں ذہن میں ایک نئی کھڑکی کھول دیتی تھیں.........

"سر مگر میں تو ایک معمولی سپاہی ہوں۔"

"تم اپنی سطح پر وہی ہو' جن کے متعلق میں نے پڑھا ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا اگر وہ بڑے شاعر تھے' بڑے موسیقار یا بڑے مصور اور تم ایک سپاہی ہو۔ تمہاری فطرت میں وہ لچک موجود ہے جو ایک محبت سے دوسری محبت کی طرف پلانگتی ہے۔ یہ ایک قوت ہے' ایک جوہر ہے جو کسی کسی کے خون میں ہوتا ہے۔"

میں خاموشی سے اس درویش صفت انسان کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے پھر پائپ بھرا' تیلی جلائی۔ نیلے دھوئیں کا مرغولہ اٹھا اور میری طرف دیکھا.........

"تم نے جس انداز میں ناگا گرل کی کہانی سنائی' یہ کسی ادب پارے سے کم نہیں تھی۔ اس موضوع سے تمہارا قلبی تعلق اور اس موضوع کے نفسیات کو تم جس خوبصورتی سے بیان کرتے ہو یہ تمہارا حق ہے۔ میرا ایمان ہے قدرت تجھے خود مواقع دے گی۔ تمہاری فطرت یہ مواقع ڈھونڈ نکالے گی' جس طرح آج تم ڈیما پور جانا پسند نہیں کرتے' ایک دن آئے گا یہ مرم کیمپ بھی یہیں رہ جائے گا اور پھر تم کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے کیونکہ تم فطری طور پر فن کار ہو اور ایسے لوگ انتظار کرنے کی بجائے آگے بڑھنے کے عادی ہوتے ہیں!"

"تو گویا کوئی لڑکی مجھ سے وفا کی توقع نہیں رکھ سکتی۔"

"وفا کرنے والوں سے دنیا بھری پڑی ہے مسٹر گل' جو لوگ خوبصورت ٹائیاں باندھتے ہیں۔ اچھی تراش خراش کے قیمتی سوٹ پہنتے ہیں' ایسے ہی لوگوں کو وفا کے معنی بھی آتے ہوں گے کیونکہ تہذیب کے معنی بھی یہی ہیں لیکن جو لوگ خون کی سچائی کے قائل ہوتے ہیں' وہ لفظوں کے معنی عموماً" بھول جاتے ہیں کیونکہ جو فطرت تربیت کا کہنا مان لیتی ہے' مذہب اور سماج سے ڈر جاتی ہے۔ وہ کسی فن کار کی فطرت نہ ہوگی!"

"لیکن سر' ایسی فن کاری میرے کس کام کی کہ دنیا والوں سے کاٹ کر رکھ دے؟"

"یہی تمہارا مقدر ہے۔" لیفٹیننٹ فلیچر اعتماد سے بولا۔ "اس چھوٹی عمر میں بھی پانچ لڑکیوں سے محبت کر چکے ہو مگر دعویٰ وفا کا کرتے ہو اور دنیا والوں سے تعلق کے دھوکے میں گرفتار ہو۔ ایک لڑکی سے دوسری لڑکی کی طرف پلٹتے ہو' پھر بھی اس یقین کو لئے چلتے ہو کہ تمہیں مذہب کا بھی پاس ہے.......... تم ہمیشہ محبتیں کرتے رہو گے' اس مغالطے کے ساتھ کہ تم ایک بااصول انسان بھی ہو۔ مگر ایک بات تمہیں بتادوں مسٹر گل کہ تم وہی رہو گے جو تم ہو اور اس پر تمہیں شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ تم سارے جالے توڑ کر باہر آجاؤ گے اور وقت آئے گا کہ لوگوں کی تنقید تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی..........!!

"لیکن سر جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں' اس کی بنیاد کیا ہے؟ ان خیالات کا سرچشمہ



کہاں سے پھوٹتا ہے؟ میں کیسے یقین کر لوں کہ میرے کردار کے تجزیے میں آپ صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں اور میں جو اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوں کہاں تک اسے حق بجانب بھی کہہ سکتا ہوں..........؟"

لیفٹیننٹ فلیچر ہنس پڑا۔

"تم جب اپنی فطرت کی مجبوری کا ذکر کرتے ہو تو یہ ذکر بھول جاتے ہو کہ اس مجبوری نے تمہیں کتنا پریشان کیا یا اس مجبوری نے تمہارے ضمیر پر کتنا بوجھ ڈالا یا تمہاری انا کو ٹھیس پہنچائی..........؟ ظاہر ہے کہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم نے ساری تبدیلیاں نہایت سبک انداز میں قبول کی ہیں۔ گویا تم حق بجانب ہی تھے کہ محبت کے پیمانے بدلتے رہے' کوئی خارجی اور اندرونی سرزنش نہ ہوئی۔ کسی مادی یا روحانی قوت نے بھی تنبیہہ نہ کی یعنی وہ راہ صحیح تھی جو تم نے دانستہ' یا نا دانستہ ارادی یا غیر ارادی طور پر اختیار کر لی تھی.......... اس کے لیے جواز ڈھونڈنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں جو اس کمپنی میں تمہیں دوست کہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں تو اس کے لیے مجھے کہیں سے احکام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ سب کچھ بالکل قدرتی طور پر ہوا۔ مجھے تمہارا لب و لہجہ پسند آیا۔ تم سادگی میں فراست کی باتیں کرتے ہو۔ سپاہیوں سے تمہارا سلوک مجھے بہت بھایا۔ تم مجھے عام آدمیوں کے مقابلے میں نہایت اور یجنل لگے۔ میں نے کمپنی کے انگریز افسروں کی باتوں میں وہ گہرائی نہ پائی جو تم ہنستے کھیلتے سادگی اور روا روی میں کہہ جاتے تھے۔ پھر تم نے نہایت بے باکی سے عشق کیا۔ میں پھڑک اٹھا کہ تم بالکل اسی ڈگر پر چل نکلے تھے جس کی میں توقع رکھتا تھا۔ تم نے مس سارا کو بھی ویسا ہی متاثر کیا جیسا کہ مجھے کیا تھا۔ وہ تمہاری ذہانت کی مجھ سے بھی زیادہ قائل تھی اور تمہیں نہایت پسندیدہ اور یجنل بوائے کہتی تھی۔ اب تم نے دوسرا عشق کیا تو اس میں بھی ویسی ہی تازگی ویسی ہی شگفتگی ہے۔ مسٹر گل لوگ یونہی گرویدہ نہیں ہو جاتے۔ لڑکیاں یونہی دل نہیں دے بیٹھتیں۔ تم میں کچھ خوبیاں ہیں کہ میں تمہارا دوست بن بیٹھا ہوں۔!"

لیفٹیننٹ فلیچر کے جذبات وخیالات سن کر مجھے حیرت اور خوشی ہوئی۔ مجھے پہلی بار

احساس ہوا کہ مجھ میں کچھ صلاحیتیں ہیں جو مجھے اُجاگر کرتی ہیں۔ کچھ خامیاں بھی ہیں جو لیفٹیننٹ فلیچر کے زورِ بیان تلے دب کر رہ گئی ہیں۔

مجھے متذبذب پاکر لیفٹیننٹ فلیچر بولا۔

"کردار بنانے سے نہیں بنتا۔ جبلت میں ترمیم و اضافہ بے معنی شے ہے۔ اسے ترکھان کے تیشے سے تراش خراش کر خوبصورت نہیں بنایا جا سکتا۔ اب مثلاً "تم نے اپنی انا کی خاطر لیفٹیننٹ براؤن کا گلا دبوچا تھا تو یہ تربیت کا کمال نہیں تھا' تمہاری فطری خود داری کا مظاہرہ تھا۔ اور اب تم نے ایک اجنبی لڑکی کی عزت کی خاطر حوالدار گورنام سنگھ کی گردن دبائی' تو یہ کوئی شعوری کوشش نہیں تھی کہ جس میں انعام و احسان کا پہلو نکلتا ہو بلکہ یہ ایک اچھی سرشت کا فوری ردِ عمل تھا جو سامنے آگیا!"

لیفٹیننٹ براؤن کے ذکر پر میں مسکرا پڑا تھا کیونکہ یہ بات میں نے لیفٹیننٹ فلیچر کو نہیں بتائی تھی۔

"سر لیفٹیننٹ براؤن کی بات میں نے تو آپ کو نہیں بتائی تھی؟"

"ہاں......... مگر سب کو معلوم ہے میجر سینڈھرسٹ اور کیپٹن پکرنگ کو بھی اس واقعے کا علم ہے مگر کسی نے آپ کو نہیں پوچھا کہ ایک سینئر افسر پر ہاتھ کیوں اٹھایا کیونکہ غلطی لیفٹیننٹ براؤن کی تھی۔ مسٹر براؤن نے تو خود اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی کہ قانونی کارروائی کی بجائے اس نے ہاتھ اٹھایا۔ پہلی بار تم نے اس کا لحاظ کیا دوسری بار تم نے اسے سزادی یہ بالکل ٹھیک فیصلہ تھا.........!"

صبح حسبِ معمول چار بجے ڈیوٹی سے آف ہوگئے۔ لیفٹیننٹ سمتھ دوسرے سٹاف کے ساتھ ڈیوٹی پر آگیا تھا۔ خیمے میں پہنچا۔ پردہ اٹھایا تو دنگ رہ گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک خوبصورت منظر دیکھا۔ تن تارارا زمین پر بیٹھی چارپائی سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس کا انگ انگ کھلی کتاب کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ ٹارچ کی تیز روشنی کے باوجود اس کی آنکھ نہ کھلی۔ در اصل وہ کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔

جانے کس سے آئی تھی اور کتنی دیر سے سو رہی تھی؟



کچھ دیر تو ٹارچ جلائے میں اس خوابیدہ فتنے کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے اس کے سرخ ہونٹوں پر انگلی پھیرنے لگا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ میں ہنس پڑا۔ وہ فوراً" سمٹ گئی......... میں نے اسے پکڑ کر اوپر بٹھا لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگا۔ کل کی طرح وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی تپی۔ جب اسے آغوش میں لے کر چومنے لگا تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر وہ حیران ہو رہی تھی۔ میں نے اسی وار فتگی میں اس کے منہ پر منہ رکھ دیا......... وہ تڑپی کسمسائی۔ اس کے جسم میں تناؤ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ لکڑی کی طرح سخت ہوگئی تھی.........

مگر اگلے ہی لمحے ایسا محسوس ہوا کہ تناؤ کی شکل بدل رہی ہے اور میں اس سخت جسم کی گرفت میں آ رہا ہوں اور وہ گرم سیسے کی طرح پگھلتی ہوئی میرے جسم میں گھلی جا رہی ہے یہ اس کی کنواری شخصیت کا عجیب اظہار تھا۔ کہاں تو یہ احساس کہ وہ جان چھڑا رہی ہے اور کہاں یہ کہ وہ مجھ سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ یہ کھچاوٹ اور لگاوٹ کا عجیب امتزاج تھا.........

مگر نہیں اس خوبصورت جسم پر میرا اختیار بس اتنا ہی تھا' بس اتنا۔ وہ مسلسل دو مہینے کبھی پوری پوری رات اور کبھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے میری آغوش میں رہتی مگر یہ اس کی شکتی تھی کہ بات بوسے سے آگے نہ بڑھی۔

مس سارا کے ہاں عصمت کا کوئی تصور نہ تھا اور یہاں عصمت کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہ تھا اور میں جان رہا تھا کہ اس معصوم لڑکی کے ساتھ شادی کا کوئی امکان نہیں۔ فیلڈ سروس میں کون کسی کو شادی کی اجازت دیتا ہے۔ گویا یہ سب ناممکنات کی باتیں تھیں۔

مگر اس کے باوجود میں بے بس تھا۔ تن تارا را کی شیفتگی میں ایسی گرمی بے ساختگی اور مسرت تھی کہ حقیقت پسند بننے کی صلاحیت مجھ میں نہ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ کو سمجھانا بہت مشکل ہو رہا تھا.........

میں سوچ رہا تھا جب یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ تن تارارا یہاں رہ جائے گی۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تو کیا میرے لئے ممکن ہو گا کہ زندہ رہ سکوں اور تن تارارا کو بھلا سکوں ؟

اس کی چھوٹی بہن جسے گورنام سنگھ نے پکڑا تھا۔ ہمزاد کی طرح تن تارارا کے ساتھ رہتی۔ وہ دونوں اکٹھی گھر سے نکلتیں۔ تن تارا را جب تک میرے پاس رہتی' وہ نیچے گھاٹی میں بیٹھی اس کا انتظار کرتی۔ اس لڑکی کا رویہ اپنی جگہ پر خود ایک امتحان تھا کیونکہ وہ بھی تن تارارا کی طرح مکمل جوان تھی۔

اور پھر یہ کہ ایک طرح سے اس کی نگرانی میں اس کی بڑی بہن کا افسانہ لکھا جا رہا تھا۔ وہ بہن سے کیا کیا نہ پوچھتی ہوگی اور انتظار کی وہ گھڑیاں کتنی کٹھن ہوں گی' جب تن تارارا میری آغوش میں ہوتی ہوگی تو نیچے گھاٹی کے اندھیروں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کی سوچوں کا دھارا کہاں کہاں ٹکراتا ہوگا؟

دراصل ہم تینوں کٹھن مراحل سے گزر رہے تھے......... ہماری روحیں پگھل رہی تھیں اور اس کے لاوے سے ضبطِ نفس کا مضمون رقم ہو رہا تھا.........

جمعدار حیات محمد مجھ سے سخت بیزار تھا۔ اسے ہر لمحے میرے پکڑے جانے کا خطرہ لاحق رہتا تھا مگر اس کی بیزارگی میں بھی خاص اپنائیت تھی۔

صوبیدار گنگا پرشاد مجھے دیکھتے ہنس پڑتا تھا۔

"عیش کر بچے عیش کر!"

بس ایک لیفٹیننٹ فلیچر ہی تھا جو ذہنی غذا فراہم کرتا تھا۔ ایک طرح سے اسے بھی مجھ سے گفتگو کرنے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ وہ روزانہ مجھ سے تازہ رپورٹ سنتا تھا۔ تن تارارا کو اس نے دیکھ بھی لیا تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ مس سارا کو بھول جانے میں میرا کوئی دوش نہیں ہے اور یہ عین قدرتی بات ہے۔

انہی دنوں کمپنی کو احکام ملے کہ سپاہی ڈیوٹی پر جائیں تو سٹین گن یا رائفل سے مسلح ہوں اور ڈرائیور ایک کے بجائے دو ہوں۔ ڈرائیونگ کے متعلق بھی ہدایات موصول



ہوئیں کہ دائیں بائیں آگے پیچھے کا نہایت ہوشیاری سے جائزہ لیا جائے اور ندی نالوں کے پل عبور کرتے وقت خاص احتیاط برتی جائے۔

کمپنی کے سارے لوگ چوکس ہوگئے تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لیے فوراً" کانٹے دار تار بچھا دی گئی اور رات کو چاروں پلاٹونوں کے ایریئے میں الگ الگ گاردیں مقرر کر دی گئیں۔ اب رات بھر سنتری ٹہلتے رہتے۔

میں نے تن تارارا کو بھی کیمپ آنے سے منع کردیا.........

رفتہ رفتہ سپاہیوں میں افواہیں پھیلتی چلی گئیں کہ جاپانیوں کی ایک ڈویژن فوج جس میں انڈین نیشنل آرمی (آزاد ہند فوج) کی رجمنٹیں بھی شامل ہیں' خفیہ راستے سے ناگاہل میں داخل ہوگئی ہیں اور وہ بہت جلد اس شاہراہ کو جو ہماری فوجوں کے لیے شاہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے' کاٹ کر رکھ دیں گی۔

یوں منی پورا مپھال اور برما تک پھیلی ہوئی کئی ڈویژن فوج گھیرے میں آ جائے گی۔ ہر روز ان افواہوں میں شدت بڑھتی جارہی تھی۔جو سپاہی منی پورا مپھال اور اس کے آگے کے بیسوں میں گاڑیاں اَن لوڈ کر کے واپس آتے تھے بے حد گھبرائے ہوئے اور پریشان ہوتے تھے۔ یہ گھبراہٹ وہ فرنٹ لائن کے پیچھے سیکنڈ لائن کے لوگوں سے ادھار لاتے تھے اور پھر پیچھے ایل آف سی ایریا (لائن آف کمونیکیشن) میں مفت بانٹتے تھے۔

جب افواہیں بہت بڑھ گئیں اور سپاہی مختلف بہانوں سے ہسپتالوں کا رخ کرنے لگے اور گاڑیاں روڈ کی بجائے کیمپ میں اسٹینڈبائی نظر آنے لگیں تو کمپنی کمانڈر نے دربار لگایا اور نہایت سختی سے تمام افواہوں کی تردید کی۔ ہر چند سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کی گئی لیکن اکثر سپاہی جو دل ہار بیٹھے تھے' میجر سینڈھرسٹ کی باتوں میں نہ آئے۔ چنانچہ ڈیوٹی سے گریز کا پہلو نمایاں ہوتا گیا۔ خصوصاً" ڈیما پور کی طرف ڈیوٹی پر جانے والے ڈرائیور تو دو دو تین تین دن تک واپس نہیں آتے تھے اور راستے میں گاڑیاں خراب کر کے پڑے رہتے تھے۔ بعض سپاہی تو بے حد قیمتی پرزے توڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔

دوسری کمپنیوں کے ڈرائیوروں کا رویہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا مگر ہماری کمپنی تو

سب سے نمبر لے گئی تھی۔ چنانچہ اس شہرت کی بنیاد پر ہماری ساری کارکردگی خاک میں مل گئی تھی کیونکہ ٹرانسپورٹ کمپنی کے لیے اس سے زیادہ باعث عار دوسری بات نہیں ہوسکتی تھی کہ اس کی گاڑیاں سڑک کی بجائے برلب سڑک یا کیمپ میں کھڑی ہو جائیں۔

میجر سینڈھرسٹ کے وقار کو بھی دھچکا پہنچا کیونکہ ایک اچھے کمان کرنے والے افسر کے لیے یہ بات باعثِ افتخار نہیں ہوسکتی تھی کہ فیلڈ سروس میں اس کے سپاہی ڈیوٹی سے پہلو تہی کریں۔

غالباً" یہی وجہ تھی کہ ایک شام اچانک ہمیں آرڈر مل گئے کہ اسی وقت کیمپ چھوڑ دیں اور راتوں رات اپنے سازوسامان کے ساتھ ڈیما پور پہنچ جائیں۔

اور یا شاید ہائی کمان کو اطلاع ہو چکی تھی کہ جاپانی عنقریب شاہراہ کاٹنے والے ہیں۔ اس لئے ٹرانسپورٹ کمپنیوں اور سپلائی یونٹوں کو پیچھے دھکیل کر محفوظ کر دیا جائے تاکہ ایل آف سی ایریا میں مواصلات کا سلسلہ قائم رہے۔

بہر حال رات گیارہ بجے تک کمپنی کی ایک ایک چیز پیک کر کے گاڑیوں میں لوڈ کردی گئی۔

اور ہم نے مرم کیمپ کو الوداع کہہ دیا۔

اس مرم کیمپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا' جہاں مجھے روئے زمین کی ایک بے مثال لڑکی کی محبت ملی تھی۔

جب کانوائی کی پہلی گاڑی چل پڑی تو میری نظریں مرم گاؤں کے پہاڑ کی چوٹی پر تھیں جہاں ناگاہل کی ایک مضطرب روح خوابیدہ تھی.........

میں سوچ رہاتھا......... صبح صبح مرم گاؤں کے لوگ اٹھیں گے اور اُجڑا ہوا کیمپ دیکھیں گے تو اس لڑکی کے دل پر کیا گزرے گی.........؟

وہ کیا کہے گی دل میں کہ پردیسی یوں بھی کرتے ہیں.........!

اور یہ کہ محبت کا انجام ایسا بھی ہوتا ہے ........

وہ کیا سمجھے گی کہ سپاہی فریب بھی دیتے ہیں.........؟



مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ جنگ اگر مواقع پیدا کرتی ہے تو اسی بیدردی سے مواقع کچل کر بھی رکھ دیتی ہے......... کانوائے اژدھے کی طرح رینگ رہی تھی اور سیاہ سڑک کو آہستہ آہستہ نگل رہی تھی۔ مرم بہت پیچھے رہ گیا تھا.........!

ڈیما پور کے پرانے کیمپ میں کوئی اور کمپنی ڈیرہ جما بیٹھی تھی ہمیں ڈیما پور سے پانچ میل پیچھے سڑک کے کنارے جنگل میں پہنچا دیا۔ یہاں تین دن تو ہم جھاڑیاں اور درخت کاٹتے رہے لیکن چوتھے روز ڈیڑھ سو کے قریب سویلین لیبر بھی پہنچ گئی۔ چھ سات دن اس میں لگ گئے۔ ہم خشک راشن کھاتے رہے۔ خیمے لگنے سے پہلے کیمپ کے چاروں طرف کانٹے دار تار بھی بچھا دی گئی۔

سٹیشن ہیڈ کوارٹر سے پانی کی گاڑی بھی آگئی تھی جو دن بھر لنگروں کے لیے پانی مہیا کرتی۔ سپاہی بھی اپنی ضرورت کے لئے اپنے اپنے لنگر سے پانی حاصل کرتے تھے۔

کانٹے دار تار بچھ جانے سے سپاہیوں میں پھر سے سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کے خیال میں ڈیما پور محفوظ علاقہ تھا۔ فرنٹ لائن سے بہت دور.........

لیکن جس دن ہم گاڑیاں لے کر ڈیوٹی پر نکلے تو ڈیما پور شہر کی ہوا ہی کچھ دوسری تھی یہاں سے قافلے کے قافلے نکل رہے تھے اور لوگ شہر چھوڑ رہے تھے۔ گھر کے گھر بیل گاڑیوں پر لدے ہوئے تھے۔

ہر طرف ایک ہی آواز اٹھ رہی تھی۔"جاپانی آگئے' جاپانی آگئے!"

اب تو یہ عالم تھا کہ ذرا سا کھٹکا ہوتا تو سارا کیمپ سٹینڈ ٹو ہو جاتا۔ ہم لوگ رات کو بھی مسلح رہتے اور اپنا اسلحہ لوڈ کر کے سوتے۔ شام کے پانچ بجے کھانا کھلا دیا جاتا اور رات کو سختی سے بلیک آوٹ کی پابندی ہوتی۔

❖ ❖

ایک دن اچانک افواہ پھیل گئی کہ جاپانیوں نے کوہیمہ پر قبضہ کر لیا ہے اور انہوں نے منی پور امپھال روڈ کو بلاک کر دیا ہے۔ گویا ہماری بہت بڑی فوج گھیرے میں آ چکی تھی اور اس سڑک کے ذریعے اگلی فوجوں کو راشن ایمونیشن اور اسلحہ نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ لیفٹیننٹ فلیچر سے ان افواہوں کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے تصدیق کر دی اور بتایا۔

"کوہیمہ پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا ہے وہ کسی خفیہ راستے سے جنگل جنگل وہاں تک پہنچ گئے لیکن ان کی تعداد کا ابھی صحیح اندازہ نہیں ہوا کیونکہ جس دشوار گذار راستے سے وہ آئے ہیں، ان کی تعداد ایک بریگیڈ سے زیادہ نہیں ہو سکتی اگر ان کی مزید کمک روکنے میں ہماری کمان کامیاب ہو گئی تو پھر ہماری گھیرے میں آئی ہوئی فوج کو نقصان نہیں پہنچ سکتا!"

"لیکن ان کے راشن پانی کا کیا بنے گا؟" میں نے پوچھا۔

"فکر کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "امپھال اور منی پور میں اسلحہ اور راشن کے بڑے بڑے بیس ہیں۔ وہ کم از کم چھ ماہ تک لڑ سکتے ہیں اور پھر ان سے ہمارا ہوائی رابطہ قائم ہے۔ ہم وہاں راشن ایمونیشن کے علاوہ وہ چھاتہ فوج بھی اتار سکتے ہیں۔"

"کوہیمہ کا کیا بنے گا سر؟"

"کوہیمہ میں کیزولٹی ضرور ہو گی۔ ہمارے بہت جوان مریں گے لیکن جیسا کہ میں





نے بتایا اگر ان کو کمک نہ پہنچ سکی تو دو تین ماہ میں ہم جاپانیوں کا صفایا کر لیں گے۔ دو تین ماہ بھی اس لئے کہ انہوں نے اونچی اونچی چوٹیوں پر مورچے بنا لیے ہیں اور کوہیمہ کی طرف جانے والی سڑک ان کی چھوٹی توپوں کی زد میں ہے۔"

"سر میں نے سنا ہے کہ آزاد ہند فوج بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"ہاں۔ انڈین نیشنل آرمی کے کچھ لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ وہ شدید پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے لاوڈ سپیکر لگا رکھے ہیں اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں وقفے وقفے سے اعلان کرتے رہتے ہیں کہ جاپانی ہمارے ایشائی بھائی ہیں، جو ہندوستان کو انگریزوں سے آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سبھاش چندر بوس انڈین نیشنل آرمی کا کمانڈر ہے۔ اس لئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہتھیاروں سمیت ہماری طرف آجائیں اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے دوش بدوش لڑیں۔ ہم اپنے انڈین بھائیوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں، ہندو ہوں یا سکھ خوش آمدید کہتے ہیں۔"

"تو سر پھر کیا ہوگا۔ انڈین آرمی پر اس پروپیگنڈے کا اثر ضرور ہوگا۔ اس کا ثبوت یہ ہے جو انڈین آرمی جاپانیوں کی قید میں آگئی تھی، وہ بلا تخصیص مذہب آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئی ہے۔ آخر یہ تو سچ ہے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں وہ ایشیائی ہونے کی بنا پر ہندوستان کے زیادہ نزدیک ہیں۔"

"ہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" لیفٹیننٹ فلیچر سوچتے ہوئے بولا۔ "جہاں تک مجھے علم ہے ہماری ہائی کمانڈ کو اس کا احساس ہے اور وہ کوہیمہ میں انڈین رجمنٹ کو استعمال نہیں کرے گی۔"

اس لمحے مجھے خیال آیا کہ لیفٹیننٹ میرے متعلق کیا سوچتا ہوگا کیونکہ میں بھی آخر انڈین سولجر ہوں۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اگر وہ مجھ سے سوال کرے کہ ایسے موقع پر میرا رویہ کیا ہوگا تو جواب دوں گا کہ اگر میں جاپانیوں سے مل بھی گیا تو اس کی وجہ انگریزوں سے باغی ہونا نہیں ہوگی بلکہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ایسا کروں گا کیونکہ جاپان

دیکھنے میں بھی تو بڑا چارم ہے!

اب سپاہیوں نے خبریں دینا شروع کردیں کہ ریلوے سٹیشن پر ہزاروں کی تعداد میں لاشیں اور زخمی آ رہے ہیں۔ کوہیمہ میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے اور جاپانی فوج ہماری گوری رجمنٹوں کو تہس نہس کر رہی ہیں۔ کوہیمہ سے پانچ میل نیچے تک ہماری ٹینک رجمنٹیں پہنچ جاتی ہیں مگر اوپر سے آگ برس رہی ہے۔

جب زخمیوں اور لاشوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو ہماری کمپنی کی گاڑیوں پر بھی عارضی طور پر ایمبولینس کا نشان لگا دیا گیا۔ ہم سے پہلے بھی بہت سی جی پی ٹی کمپنیاں یہ کام کررہی تھیں.........

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب ہم نے اپنی آنکھوں سے لاشوں کے ڈھیر دیکھے اور زخمیوں کی آہ و بکا سنی۔ سٹیشن پر ٹرک آکر رکتے تھے اور ٹیل بورڈ کے گوشوں سے خون ٹپکتا تھا......... زخمیوں کو ایک نظر دیکھنا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی' کسی کا بازو غائب' کسی کا کان اور جبڑا اڑا ہوا' کسی کی انتڑیاں باہر اور کسی کے سر سے مغز اُبل کر گیند کی طرح باہر آگیا ہے۔

کوئی چلا رہا تھا......... ''مجھے گولی مار دو مجھے گولی مار دو!''

لاشوں کو مال گاڑی کے ڈبوں میں ڈال دیا جاتا اور گاڑی نا معلوم منزل کی طرف روانہ کردی جاتی......... زخمیوں کے لیے ایمبولینس ٹرین کھڑی رہتی۔ ڈیماپور سے ہر گھنٹے کے بعد ایک ایمبولینس ٹرین روانہ کر دی جاتی جو زخمیوں کو گوہاٹی شیلانگ اور دوسرے شہروں کے ہسپتالوں میں پہنچاتی.........

راستے میں بہت سے زخمی فوری فرسٹ ایڈ نہ ملنے سے یا زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مرجاتے۔ بہت کم خوش نصیب ہسپتالوں تک پہنچ پاتے.........ڈیما پور کے ہسپتال بھی زخمیوں سے اٹے پڑے تھے.........

یہ ساری لاشیں اور زخمی گورا رجمنٹوں کی تھیں.........

پتھر دل آدمی بھی ان زخمیوں کی چیخیں سن کر رو پڑتا تھا۔



خود میری کئی دن تک یہ کیفیت رہی کہ کھانے پر بیٹھتا تو کسی کھوپڑی سے اُبلا ہوا مغز سامنے آجاتا اور پھر نوالہ حلق سے نہ اترتا۔

ہمارے دو سپاہی پاگل ہو گئے تھے اور بہت سے بھاگ گئے تھے دوسری یونٹوں سے بھی سپاہی بھاگ گئے تھے۔ مگر اکثر پکڑے جاتے کیونکہ سارے آسام میں ملٹری پولیس کا جال بچھا ہوا تھا اور پھر آسام کے لوگوں سے ہماری شکلیں بہت مختلف تھیں۔

اگر کوہیمہ میں جاپانیوں کو کمک پہنچ جاتی اور ان کی سپلائی لائن بن جاتی تو جنگ عظیم دوم کا نقشہ شاید کچھ اور ہوتا۔ پھر شاید ناگا ساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم نہ گرتے۔ ہندوستان فتح ہو جاتا اور اتحادی جنگ ہار چکے ہوتے۔ لیکن برٹش ہائی کمانڈ نے وہ راستہ معلوم کرلیا تھا جس سے جاپانی کوہیمہ میں داخل ہوئے تھے۔ بیس بیس جہازوں کا سکواڈرن آتا اور ہزاروں پونڈ بم برسا کر نکل جاتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد دوسری ٹولی آتی اور اندھا دھند بم برسا کر چلی جاتی۔

ڈھائی تین مہینے جاپانی بے جگری سے لڑتے رہے۔ ہزاروں کی تعداد میں کیزولٹی کے باوجود یہ مورچہ سر نہ ہوسکا۔ لیکن سپلائی لائن کے بغیر کوئی فوج کب تک لڑسکتی ہے۔ ان کے پاس گولہ بارود ختم ہو چکا تھا اور راشن کی شدید کمی ہوگئی تھی اور کمک پہنچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی.........

چنانچہ اکا دکا جاپانی جنگلوں میں چھپ گئے زیادہ تر محاصرے میں مارے گئے اور کچھ نے خود کشی کرلی۔ البتہ آزاد ہند فوج کے کچھ لوگ پکڑ گئے اور کوہیمہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا.........

کوہیمہ امپھال روڈ کھل گئی تو ہماری کمپنی کی گاڑیاں پھر چلنی شروع ہوگئیں۔ ڈیما پور کے جنگلوں میں گولہ بارود' راشن اور اسلحہ کے جو زیر زمین بیس بنے ہوئے تھے' اس ڈھائی تین ماہ کے عرصے میں کئی بار وہاں جانا پڑا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جنگ میں اشیائے خوردنی اور دوسری چیزیں غائب یا مہنگی کیوں ہو جاتی ہیں۔

یہاں تیار مال خام مال کے ایسے بڑے بڑے ذخائر تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

دنیا کی تمام پیداوار اور وسائل جنگ کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ انسان تو پہلے ہی ایندھن بن چکا ہوتا ہے۔

اس عرصے میں سارا کا خیال بار بار آیا۔ وہ میرے بہت قریب تھی۔ اس کا ہسپتال راستے میں پڑتا تھا لیکن ایک تو لاشوں اور زخمیوں کی آہ و بکا کی وجہ سے طبیعت عموماً مکدر رہتی تھی' دوسرا یہ احساس کہ تن تارا را سے تعلقات کے بعد سارا سے اظہارِ خلوص یا تجدیدِ ملاقات انتہائی منافقت ہوگی۔

مجھے یہ بھی خیال تھا کہ لیفٹیننٹ فلیچر نے بھی اس کا ذکر عمداً نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس بات کی اہمیت تقریباً ختم ہوگئی ہے.........

انہی دنوں امپھال سے آگے ایک بڑی جھڑپ کی اطلاع ملی۔ جاپانیوں نے ہماری پوری پلٹن کاٹ کر رکھ دی۔ زخمی بہت زیادہ تھے۔ منی پور کے سی۔ ایم۔ ایچ میں اتنی جگہ نہ تھی اور نہ ہی وہاں اپریشن وغیرہ کے وافر انتظامات تھے۔

سٹیشن ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس کے ذریعے مطلع کر دیا گیا کہ زخمیوں کو ڈیما پور پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔

فوراً ہی مختلف کمپنیوں سے بیس گاڑیاں بک کر لی گئیں۔ دو ڈاکٹر اور دس نرسنگ سپاہیوں کی ڈیوٹی بھی لگ گئی۔ صوبیدار گنگا پرشاد اس کانوائی کے انچارج مقرر ہوئے۔ میں اور شیر بہادر بھی اس کانوائی کے ساتھ تھے۔

ایک بار پھر مجھے مرم سے گزرنے کا موقع مل گیا تھا مگر وہاں اب کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے ان مورچوں کے جو ہم کھود کر چھوڑ گئے تھے۔ مرم کا گاؤں سڑک سے چھ میل اوپر تھا......... میری خواہشوں سے بہت دور.........

منی پور پہنچے تو وہاں سینکڑوں زخمی سٹریچروں پر لیٹے کانوائی کے انتظار میں کراہ رہے تھے۔ زخمیوں میں انڈین کے علاوہ نیپالی گورکھے اور انگریز افسر بھی شامل تھے اگرچہ انہیں فرسٹ ایڈ پہنچا دی گئی تھی۔ جن کی حالت زیادہ خراب تھی' زخم گہرے تھے' انہیں فوراً ٹیکے لگا دیئے گئے.........



بیس گاڑیوں میں اسی زخمیوں کی گنجائش تھی کیونکہ ہر گاڑی میں چار چار سٹریچر لگا دیئے گئے تھے مگر زخمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ عجیب وغریب منظر تھا ہر زخمی کی آنکھوں میں التجا تھی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کا نمبر پہلے آئے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو دوسرے سے زیادہ اہم سمجھتا تھا.........

یہ لوگ ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے' جیسے ہم آسمان سے اترے ہوئے لوگ ہیں اور ان کے لیے کوئی آسمانی پیغام لائے ہیں۔ ہر ایک ہمدردی کا متوقع تھا۔ بہرحال جنہیں زیادہ شدید تکلیف تھی' انہیں گاڑیوں میں پہنچا دیا گیا۔ ایک ڈاکٹر صوبیدار گنگا پرشاد کے ساتھ اگلی گاڑی میں بیٹھ گیا اور دوسرا میرے ساتھ سب سے پچھلی گاڑی میں......... ایک نرسنگ سپاہی کے ذمے دو دو گاڑیاں آئیں تاکہ راستے میں زخمیوں کی دیکھ بھال ہو سکے۔

کانوائے کی رفتار دس میل فی گھنٹہ مقرر ہوئی۔ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی کا فاصلہ بیس گز طے ہوا۔ ہر دس میل کے بعد کانوائی کو پندرہ منٹ کے لیے رکنا تھا تاکہ ڈاکٹر راؤنڈ کر سکیں اور اگر کسی زخمی کو خاص فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہو تو مہیا کی جاسکے۔

لیکن جب بھی کانوائی رکتی تقریباً ہر زخمی چلانے لگ جاتا اور ڈاکٹر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا.........

ایک زخمی کہہ رہا تھا.........

" میرے سات بچے ہیں ڈاکٹر صاحب پورے سات اگر میں مرگیا تو ان کا کیا بنے گا؟ نہیں بالکل نہیں' مجھ جیسی محبت انہیں کوئی نہیں دے سکتا!"

ایک نوجوان وائسرائے کمیشن افسر رو رو کر کہہ رہا تھا.........

"کوئی فائدہ نہیں میری زندگی کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں ایک ٹانگ لے کر بملا کے سامنے کیسے جاؤں گا اسے کیا پڑی ہے کہ ایک لنگڑے کے ساتھ شادی رچائے!"

ایک انگریز کیپٹن ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔

" جنگ سے بڑی لعنت کوئی اور نہیں ہوتی ڈاکٹر کہ اس میں ایک اجنبی دوسرے اجنبی کو وجہ بتائے بغیر مار دیتا ہے۔ زندگی میں ایک بار ہی انکا آمنا سامنا ہوتا ہے اور پھر ان

میں سے ایک مرجاتا ہے۔ ڈاکٹر مجھے ایک جاپانی سارجنٹ نے سنگین ماری تھی اور جب میں لڑکھڑا کر گر پڑا تو وہ چند لمحے ساکت مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا......" کیپٹن میں تجھے نہ مارتا تو تم مجھے مار دیتے!" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ ہمارے ایک سپاہی نے اس پر حملہ کردیا مگر جاپانی سارجنٹ نے نہایت مہارت سے وار بچا لیا اور دوسرے لمحے اس نے سپاہی کا کام بھی تمام کردیا۔ وہ چند لمحے اس سپاہی کو بھی تڑپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ ٹھنڈا ہوا تو اسی طرح بھرائے ہوئے لہجے میں اس کی لاش سے بولا۔

"بھائی میں تجھے نہ مارتا تو تم مجھے مار دیتے!"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے انگریز کیپٹن کو تھپکی دی' جو اپنے سینے کے زخم پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا...... خون آلود پٹی سے اس کا ہاتھ نم تھا۔ جب کانوائی روانہ ہوئی تو ڈاکٹر نے صوبیدار گنگا پرشاد سے کہا۔

"ہم گولیوں اور سنگینوں کے گھاؤ کا علاج کرسکتے ہیں مگر ہم ان کے احساس کے زخم کس طرح بھرسکتے ہیں......؟"

کانوائی سو میل سفر کر چکی تو معلوم ہوا کہ پانچویں اور تیرھیوں گاڑی کا ایک ایک زخمی چل بسا ہے!

صبح ناشتے کے لیے رکے تو میں نے دیکھا صوبیدار گنگا پرشاد جیسا نچنت اور بے فکرا اداس اور گھمبیر بیٹھا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے ایک گاڑی کے ٹائر کی طرف اشارہ کیا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ٹائر کے نیچے سے جیتے جیتے خون کی ایک ٹیڑھی سی لکیر رس رہی تھی۔

یہ خون ایک زخمی سپاہی کے کولہے سے رس رہا تھا اور سٹریچر کے موم جامے سے ہوتا ہوا گاڑی کے فرش کے ایک درز میں سے ٹائر پر ٹپک رہا تھا۔ سپاہی بے ہوش پڑا تھا۔

اور زندگی دبے قدم رخصت ہو رہی تھی۔

کون جانے کہ یہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہوگا......

اور اُس کو کھ جلی کا انتظار کبھی ختم نہ ہوگا!



پھر ایک دن اسے اطلاع مل جائے گی کہ...... تمہارا بیٹا بہادری سے لڑتا ہوا جنگ میں کام آگیا ہے۔ چونکہ فوجی قانون کے مطابق اب وہ تنخواہ کا حق دار نہیں رہا' اس لئے اس کا ماہوار وظیفہ جو تمہارے نام تھا بند کر دیا گیا ہے۔ البتہ قریبی وارث کی حیثیت سے تم اس کے پنشن کی حق دار ہو۔ چنانچہ مرحوم کے ریکارڈ آفس کو لکھ دیا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد کاغذات تیار کرکے پنشن جاری کردے۔ ہمیں تمہارے بہادر بیٹے کی موت کا سخت افسوس ہے!

بڑھیا چند روز روئے گی' دھوئے گی لیکن اس کے سینے کے کسی گوشے میں ایک موہوم سی کرن اسے سہارا دیتی رہے گی کہ شاید تار کی اطلاع غلط ہو۔ شاید اس کا بیٹا زندہ ہو' شاید وہ دشمن کا قیدی بن گیا ہو؟

وہ جنگ ختم ہونے تک برابر انتظار کرے گی۔ کسی معجزے کی متوقع ہوگی۔ وہ خواب دیکھتی رہے گی حتیٰ کہ جنگ ختم ہو جائے گی اور اسے پنشن بک مل جائے گی اور پھر ہرماہ پنشن وصول کرتے وقت بیٹے کا ماتم کرے گی۔

کہ اس کے سوا جنگ کا دوسرا ماحصل نہیں ہوتا......

تقریباً" ایک ماہ بعد ہماری کمپنی کا تبادلہ گوہاٹی ہوگیا۔ گوہاٹی دریائے برہم پتر کے کنارے آسام کا دارالخلافہ بھی تھا۔ یہ شہرایل آف سی ایریا سے بہت پیچھے تھا اور ہوائی حملوں کی زد سے بہت دور...... یہاں شہروں والی گہما گہمی تھی اور فلموں کے تینوں شو ہوتے تھے۔ یہاں ڈیوٹی بھی ہلکی پھلکی تھی۔ شام کو سٹیشن ہیڈ کوارٹر سے اگلے دن کے لیے ڈیمانڈ رپورٹ موصول ہو جاتی۔ صبح سات بجے ہم گاڑیاں کیمپ سے مختلف ڈیوٹیوں پر روانہ کر دیتے اور پھر شام کو ان کی واپسی کا انتظار کرتے۔ گوہاٹی کے آس پاس پہاڑیوں میں بھی اسلحہ ایمونیشن اور خشک راشن کے انڈر گراؤنڈ بڑے بڑے ذخائر تھے۔

کلکتہ کی طرف سے سٹیمر آتے گوہاٹی میں اَن لوڈ ہوتے۔ تمام اشیا ان ذخائر میں پہنچ جاتیں۔ پھر حسب ضرورت یہ سامان ان ذخائر سے ہوائی جہازوں یا ریلوے کے ذریعے مختلف فرنٹوں پر بھیجا جاتا......

یہاں مجھے فلموں کا ایسا چسکہ پڑا کہ تقریباً" روزانہ کوئی نہ کوئی فلم دیکھتا.........
ہمارا کیمپ شہر سے دو میل باہر تھا اور ہم خیموں میں رہتے تھے۔ ہمارے بالکل قریب ری ان فورس منٹ کیمپ تھا۔ اس لئے یہاں چیانگ کائی شیک کے تھکے ہوئے چینی سپاہی، پلے ہوئے امریکن سولجرز سات سات فٹ کے لمبے نگرو اور سیاہ گھنگھریالے بالوں والے حبشی فوجی بھی دیکھنے کو مل جاتے تھے.........

انہی دنوں ایک امریکن یونٹ نے ہمارے بالکل قریب کیمپ لگایا۔ان کے خیمے، سفری چارپائیاں کٹ بیگ اور دوسرا سامان دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ ہمارے افسروں کو بھی وہ راشن نصیب نہیں تھا جو ان کے سپاہیوں کو ملتا تھا چاکلیٹ، امریکن مٹھائیاں اور اعلیٰ سگریٹ اس کے علاوہ تھے۔ پانی کے بجائے بیئر پیتے تھے اور رات کو خرمستیاں کرتے تھے۔
پریڈ یا ڈیوٹی پر جاتے تو خیمے کھلے چھوڑ جاتے۔ ان کے اٹیچی اور بکس کھلے ہوتے۔ ہمارے سپاہی ان کی بہت سی قیمتی چیزیں چُرالاتے تھے مگر بے نیازی کا یہ عالم کہ کبھی شکایت نہ آئی۔

خود میرے ایک سپاہی نے ان کے کیمپ سے سفری چارپائی اٹھا کر میرے خیمے میں لگا دی تھی۔ میں بہت دن تک ڈرتا رہا مگر ہفتہ دس دن کے بعد وہ وہاں سے چلے گئے اور پھر جنگ ختم ہونے تک میں کبھی زمین پر نہ سویا.........
جنگ کی غالباً" یہ آخری نشانی ابھی تک میرے گھر میں محفوظ ہے۔
یہاں صوبیدار گنگا پرشاد کی کوششوں سے ہمارا الگ میس بھی بن گیا۔ جس میں ہم شمالی ہند کے رہنے والے جمعدار، صوبیدار اور حوالدار بلا تفریق مذہب ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ ہمارا باورچی ایک بنگالی مسلمان تھا جو چاول کے مختلف ذائقے بنانے کا ماہر تھا۔
یہ چوڑا چکلہ پستہ قد آدمی تھا۔ ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور فرداً" فرداً" ہر ایک کو خوش رکھنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ ہم میں سے ہر آدمی اسے اپنا دوست سمجھتا تھا۔
صوبیدار گنگا پرشاد کبھی کبھی میرے کان میں شامی کبابوں کے لیے سرگوشی کرتا۔
میں باورچی سے سرگوشی کرتا اور وہ مسکرا کر حکم کی تعمیل کرتا۔



شروع شروع میں وہ بہت چونکا تھا لیکن جب میں نے اسے سمجھایا کہ ہم دونوں جنت کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں تو اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ چنانچہ اس لالچ میں وہ پیدل شہر جاتا اور وہاں سے بڑے گوشت کا قیمہ بنا کر لاتا اور جب شام کو سب لوگ شامی کبابوں کے چٹخارے لے رہے ہوتے تو بنگالی مجھے آنکھ مار کر چپکے چپکے ہنستا۔ میں کبابوں کی تعریف کرتا تو اس کا مٹکے جیسا جسم پھول جاتا۔
ایک دن سٹیشن ہیڈ کوارٹر میں جونیئر اور سینئر افسروں کی دعوت تھی۔ ہم حوالدار لوگ میس میں کھانا کھا کر خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ باورچی دوڑا آیا اور کہنے لگا۔
" سر، صاحب لوگ واپس آ گئے ہیں۔ جمعدار حیات محمد کے خیمے میں ہنس کھیل رہے ہیں۔ جمعدار حیات محمد نے شراب پی رکھی ہے۔ وہ انٹ شنٹ اردو انگریزی میں تقریر کر رہا ہے۔ میجر صاحب اور کیپٹن صاحب اور دوسرے صاحب لوگ قہقہے لگا رہے ہیں!"

ہم میں سے کسی کو بھی یقین نہ آیا۔ جمعدار حیات محمد پانچوں وقت کا نمازی تھا۔ انتہائی سیدھا اور معصوم فوجی لیکن باورچی ایسا آدمی نہ تھا، جس کی بات کا اعتبار نہ کیا جاتا۔ ہم دوڑے دوڑے ان کے خیمے پہنچے تو وہاں سچ مچ مجمع لگا ہوا تھا۔ سپاہی اپنے اپنے خیموں سے جھانک رہے تھے اور اس انہونی پر حیران ہو رہے تھے۔
میجر سینڈھرسٹ بچوں کی طرح بے ساختہ قہقہے لگا رہا تھا اور تو اور کیپٹن پکرنگ جیسا سنجیدہ آدمی بھی کھلے لبوں ہنس رہا تھا۔
ہم لوگوں کو دیکھ کر جمعدار حیات محمد ایک ایک سے گلے ملا اور سب کے پٹاخ پٹاخ بوسے لیے۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ شراب کی اہمیت مجھ پر واضح ہو رہی تھی کہ وہ کس آسانی سے آدمی کو خول سے باہر نکال کر ننگا کر دیتی ہے۔ اگرچہ یہ شراب کی طاقت کا منفی پہلو تھا۔ لیکن سچ یہ ہے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے شراب پینے کی ترغیب ہوئی.........
میں اپنا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا.........
جب مجمع چھٹ گیا۔ سب لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے تو میں دوبارہ جمعدار

حیات محمد کے خیمے میں پہنچ گیا۔ وہ کپڑے اتار چکا تھا اور دھوتی باندھ کر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے سلام کیا تو وہ اٹھ بیٹھا اور مجھ سے لپٹ کر زار وقطار رونے لگ گیا.........

میں خاموش تھا وہ روتے ہوئے بولا۔

" میرا کوئی قصور نہیں گل' میجر صاحب کے اصرار پر پی لی۔ سب افسر خوش ہو رہے تھے' پھر میں نے اور پی لی۔ تم ناراض نہ ہونا۔ میرے رشتہ داروں کو بھی خط نہ لکھنا۔ رب کا واسطہ' یہ کام نہ کرنا' تمہارے پاس میرے گھر کا ایڈریس ہے نا' ہاں ہاں ضرور ہے۔ دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں اگر میرے معصوم اکلوتے بیٹے کو پتہ لگ گیا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی کہ اس کا باپ شرابی ہو گیا ہے!"

میں حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑے ہوئے تھے۔ میں خاموش تھا۔ وہ اس خاموشی سے اور زیادہ گھبرا گیا۔ اس نے سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ میں نے اسے پکڑ کر بٹھا لیا تو وہ میرے سینے سے لگ گیا۔

"خدا کی قسم اب نہیں پیوں گا۔ یہ دیکھو" اس نے خیمے کے سائیڈ پاکٹ سے بوتل نکالی۔ "اس میں چار پیگ ہیں۔ یہ میجر صاحب نے مجھے "تحفتہ" دیئے ہیں لیکن میں اسے پھینک دوں گا' توڑ دوں گا۔ بوتل کو تم چکھنا چاہو تو لے جاؤ ساتھ' تھوڑی سی کڑوی ہوتی ہے مگر بعد میں معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

میرا دل چاہا کہ بوتل لے لوں لیکن دوسرے لمحے یہ خیال خود بخود رد ہو گیا۔ جو شخص اپنے کئے پر اس قدر نادم ہو رہا تھا۔ میں اپنی ایک کمزوری اس کے ہاتھ میں کیسے دے سکتا تھا.........

کچھ دیر بعد میں چلا گیا......... صبح ہوئی۔ گاڑیاں ڈیوٹی پر چلی گئیں۔ میں "او کے" کی رپورٹ دینے لیفٹیننٹ کے خیمے میں گیا۔ وہ سو رہا تھا۔ باقی تمام پلاٹون کمانڈر صبح گاڑیاں ڈیوٹی پر بھیجنے کے لیے خود آتے تھے لیکن لیفٹیننٹ فلیچر میرے بھروسے پر سویا رہتا تھا۔ آن روڈ اور ورکشاپ میں کھڑی گاڑیوں کی تفصیل لکھ کر اس کے اردلی کو دے دی اور خود جمعدار حیات محمد کی طرف چلا گیا۔ ان کے اردلی سے معلوم ہوا کہ وہ آج اپنی پلاٹون کی



گاڑیوں کی چیکنگ کے لیے صبح صبح نکل گئے ہیں۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ سامنا کرنے سے گھبرا رہے ہیں۔

دراصل میرا مقصد بھی اس سے ملنا نہ تھا۔ مجھے وسکی کے وہ پیگ کھینچ کر لے آئے تھے جو اُس کے خیمے میں پڑے تھے۔ اُس کی غیر موجودگی میں تجربہ کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ اردلی کو کسی کام سے بھیج کر میں نے خیمے کے سائیڈ پاکٹ سے بوتل نکالی' چائے کے مگ میں تھوڑی سی شراب انڈیلی۔ سونگھی تو بیزاری کا احساس ہوا مگر اگلے لمحے آنکھیں بند کر کے پی گیا۔ اب میں اکڑ کر بیٹھ گیا اور اس لمحے کا انتظار کرنے لگا' جس کے لیے دنیا شراب پر دولت لٹاتی ہے۔ پانچ منٹ گزرے دس منٹ گزرے۔ میں ہوش وحواس میں تھا اور کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

سوچا۔ شاید اتنی کم مقدار سے بات نہ بنتی ہو چنانچہ ایک اور پیگ نکالا اور غڑاپ سے پی گیا۔ واٹر باٹل سے اتنا اور پانی بوتل میں ڈال دیا اور باہر نکل آیا۔

اب لحہ لحہ انتظار تھا کہ کچھ تبدیلی پیدا ہو' کوئی رنگ آئے۔ وہ لوگ ایک خاص سرور کا ذکر کرتے ہیں' کسی کیفیت کا نام لیتے ہیں اور خول سے باہر نکل آتے ہیں۔ میں بے تاب تھا کہ اس کیفیت سے گزروں۔ خاندان میں شاید میں پہلا آدمی تھا جس نے صدیوں کی روایات توڑ کر شراب کا ذائقہ چکھا تھا۔

لیکن بدقسمتی......... کہ گناہ کے احساس اور ماضی کے شعور سے رشتہ توڑنے کے باوجود میری یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ میں کسی امنگ اور ترنگ سے دو چار نہ ہوا۔

دن کے سارے کام معمول کے مطابق ہوئے۔ لنگر کی صفائی دیکھی۔ سپاہیوں کے خیمے' ان کے تہہ کئے ہوئے بستر' پھولوں کی کیاریاں' دوپہر کا کھانا' شام کی رول کال' نہ میں کسی پر ہنسا' نہ خود تضحیک کا نشانہ بنا۔

میرا یہ اقدام گناہ بے لذت کے سوا کچھ نہ تھا.........

کمپنی کے سپاہیوں کی اکثریت ہندو تھی۔ دو چار مسلمان بھی تھے۔ ایک کا نام حسین ریڈی تھا۔ یہ عجیب و غریب کردار تھا۔ نہایت شریف مگر بے حد کاہل' اچھا ڈرائیور ہونے

کے باوجود ہر کام میں پیچھے رہ جاتا اس کی فطرت تھی۔ کتنی ڈانٹ ڈپٹ کرو وہ مسکراتا رہتا۔ سستی اور لاپرواہی کی وجہ سے کتنی بار سزا بھگت چکا تھا۔ کمپنی کمانڈر اسے اکیس دن یا اٹھائیس دن کی آر۔آئی سناتا تو وہ حسبِ معمول مسکرا کر سلیوٹ مارتا اور بے حد تحمل سے کوارٹر گارد کی سلاخوں کے پیچھے قید گزارتا۔

سب لوگ اس سے پیار بھی کرتے تھے کہ وہ نہایت بے ضرر آدمی تھا۔ کبھی شرارت نہ کی۔ کسی سے جھگڑا مول نہ لیا' نہ کبھی راشن کی کمی بیشی کی شکایت کی۔ جو ملا کھا لیا لیکن فوجی ملازمت کی صبح بیداری حسین ریڈی کے لیے ایسا عذاب تھی جس میں وہ ہمیشہ گرفتار رہا اور اسیر بلا ہوتا رہا۔

برسات کا موسم تھا وہ حسبِ معمول اٹھائیس دن کی قید کاٹ رہا تھا۔ وہ مشقت سے گھبرانے والا آدمی بھی نہیں تھا مگر خدا جانے کیا بات تھی۔ کیا دکھ تھا اسے' ایک دن گارد کے سپاہیوں سے نظریں بچا کر وہ خیمے سے کھسک گیا اور آم کے ایک پیڑ پر چڑھ کر پھندا لگا کر مر گیا.........

اس کی گردن ٹیڑھی ہو چکی تھی اس کی نیلی زبان باہر لٹک رہی تھی۔اس کی آنکھیں اُبل کر بہت بھیانک ہو گئی تھیں۔

کئی دن تک اس کی باہر کو لٹکی ہوئی نیلی زبان میرے تصور میں رہی اور کھانا پینا تقریباً" حرام ہو گیا تھا۔

غالباً" انہی دنوں کا واقعہ تھا۔ میں صبح اپنی پلاٹون کی گاڑیاں ڈیوٹی پر بھیج رہا تھا۔ سخت بارش ہو رہی تھی۔ آسمان زمین پر پانی کے کوڑے برسا رہا تھا۔ ڈھیروں پانی جمع ہو گیا تھا۔ گاڑیاں سلپ ہو رہی تھیں۔ پانی نکالنے کے لیے میرے ایک نائیک نے چند سپاہی لگا کر نالی نکالی چند منٹ میں میدان صاف ہو گیا۔ ہماری گاڑیوں کے پہیے متحرک ہو گئے لیکن سارا پانی سی پلاٹون کے وہیکل پارک میں جمع ہو گیا۔ وہاں لیفٹیننٹ کیف پہلے ہی اپنی پلاٹون کی گاڑیاں سلپ ہونے کی وجہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پانی کے ریلے کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور سوچے سمجھے بغیر مجھے گالی داغ دی۔ میں نے بھی گالی کا جواب گالی سے دیا۔



اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور مزید بکواس کرنے لگا۔

میں نے ایک سپاہی سے بیلچہ چھینا اور اس کی طرف بڑھا۔ اب لیفٹیننٹ کیف کے کان کھڑے ہو گئے اور خاموش ہو گیا۔ نائیک نے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔ لیفٹیننٹ کیف خاموشی سے اپنی جیپ میں جا بیٹھا.........

تقریباً" گیارہ بجے لیفٹیننٹ فلیچر سے ملاقات ہوئی۔ سارا واقعہ سنایا۔ پہلے تو وہ سنجیدگی سے سنتا رہا' پھر ہنس پڑا.........

دوپہر کو جمعدار حیات محمد اور حوالدار میجر سردار محمد آئے اور مجھے سمجھانے لگے۔ میں نے جواب دیا.........

"یعنی وہ گالیاں دیتا اور میں خاموشی سے سنتا.........؟"

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ شام کو میس میں لیفٹیننٹ کیف اور لیفٹیننٹ فلیچر کی باقاعدہ جھڑپ ہوئی۔ لیفٹیننٹ فلیچر نے میری پوری حمایت کی۔ میجر سینڈھرسٹ نے کہا.........

"یہ حوالدار ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے!"

چند دن بعد میں اپنی پلاٹون کی گاڑیاں چیک کرنے جا رہا تھا کہ حوالدار میجر نے ایک کارڈ دیا۔ کارڈ پر جو پتہ درج تھا' وہاں سے میجر صاحب کے کسی مہمان نے آنا تھا.........

کارڈ جیب میں ڈال کر ڈیوٹی پر چلا گیا۔ واپسی سے پہلے کارڈ پر لکھے ہوئے پتہ پر پہنچا تو وہاں ایک زرد رُو مگر نہایت ماڈرن سمارٹ اور خوبصورت لڑکی میری منتظر تھی۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا.........

"مجھے میجر سینڈھرسٹ نے بھیجا ہے۔"

"او۔ یس۔!" لڑکی خوش ہو گئی۔ "میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں ایک گھنٹے سے تیار کھڑی ہوں۔ آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا.........؟"

"کچھ نہیں!" میں نے بے حد روکھے لہجے میں اس کی آفر رد کر دی۔"آپ گاڑی میں بیٹھیں مجھے جلدی ہے۔"

لڑکی میرے اکھڑ رویے سے بجھ سی گئی اور خاموشی سے میرے ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھی۔ نرم نرم لطیف سی خوشبو نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گاڑی سٹارٹ کر کے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چلبلی، نو عمر اور شوخ لڑکی نہیں تھی بلکہ بائیس تیئس سال کی متین پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ یہ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں تھیں۔ نیلے رنگ کے سکرٹ اور سفید بلاؤز میں وہ بے حد جاذب نظر آرہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا۔ میجر سینڈھرسٹ سے اس کا کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہندو یا مسلمان نہیں تھی۔ اینگلو انڈین تھی.........

اس کا سہا سہا انداز دیکھ کر مجھے اپنے رویے پر نظرثانی کا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ جو پہلا ردِ عمل مرتب ہوا تھا کہ میجر سینڈھرسٹ نے کیمپ میں لڑکی بلانے کے لیے میرا انتخاب کیوں کیا ہے، زیادہ تکلیف دہ تھا!

یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اسے کیمپ میں اتارا تو نہایت سختی سے کہا۔

" اپنے میجر سے کہہ دو، تم جیسی لڑکیوں کو کیمپ لانے کے لیے میں موزوں آدمی نہیں ہوں۔ آئندہ ایسے احکام کی تعمیل نہیں کروں گا!"

لڑکی بکی بکی کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے رو پڑی۔ میجر سینڈھرسٹ کا اردلی بھی پہنچ گیا تھا.........

شام کو کھانے پر بیٹھے۔ میں نے اس لڑکی کا ذکر چھیڑا تو صوبیدار گنگا پرشاد نے بتایا.........

"ہاں ہاں! میں نے دیکھا ہے اسے، سسری بہت خوبصورت ہے۔ میجر کی کیپ ہے!"

دوسرے دن لیفٹیننٹ فلیچر نے بتایا.........

" میجر سینڈھرسٹ تم پر سخت ناراض ہے۔ لڑکی نے اسے وہی بتایا جو تم نے اسے کہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو تمہارا کورٹ مارشل کرتا۔ تمہارے تبادلے کے لیے اس نے اعلیٰ حکام کو لکھ دیا ہے.........!"



میں نے ہنس کر کہا.........

" یہ تو اچھا ہوا۔اس کمپنی میں آپ کے سوا میرے لیے کیا چارم ہے۔"

"مگر مجھے تو تمہاری ضرورت تھی۔ ایسا اندھا دھند اعتماد میں کسی اور پر کیسے کر سکتا ہوں۔"

اب کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا اور میرا رویہ غیر ذمہ دارانہ ہوتا جارہا تھا۔ میجر سینڈھرسٹ جب بھی ملتا میں تمسخرانہ انداز میں سلیوٹ کرتا۔ مگر اس یہودی بچے نے مجھے نہ ٹوکا۔

غالباً وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے میرے خلاف جو کارروائی کی ہے، اس سے میں باخبر ہوں۔ یہودی ہونے کی حیثیت سے میں اس سے نفرت نہیں کرتا تھا کیونکہ میں مذہب کی بنیاد پر تب بھی اور اب بھی کسی کو قابلِ نفرین نہیں سمجھتا، لیکن میجر سینڈھرسٹ مجھے کبھی اچھا نہ لگا اس کی وجہ کچھ اور تھی، شاید کہ وہ چھوٹے ظرف کا آدمی تھا.........

ایک دن مس گریٹا گوہاٹی کے بازار میں مل گئی۔ میں نے سلام کیا تو وہ گھبرا گئی۔ میں نے ہنس کر کہا.........

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے بہت جلد اس ناکارہ کمپنی سے میرا ٹرانسفر ہو جائے گا۔"

"وہ خاموش کھڑی رہی۔ نہ ہاں، نہ ناں.........

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی.........

"اچھا سلام.........!"

میں اس کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل دیا.........

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد میرے تبادلے کا حکم آگیا۔ گوہاٹی سے بیس میل پیچھے دریائے براہم پتر کے کنارے چونتیس ری اِن فورس منٹ کیمپ میں میرا تبادلہ ہوگیا تھا۔

جس دن کمپنی چھوڑ رہا تھا، وہ منظر دیدنی تھا۔ صوبیدار گنگا پرشاد کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جمعدار حیات محمد زارو قطار رو رہا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی بھی گھمبیر اور

اداس تھے۔ بعض سپاہی بے اختیار دھاڑیں مار رہے تھے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ایک سوستاون جی۔ پی۔ ٹی کمپنی کچھ ایسی بری بھی نہیں تھی۔

"حوالدار سر!" نارائن باورچی اس سے زیادہ بول ہی نہ سکا اور اس کی ہچکی بندھ گئی.........

ایک لیفٹیننٹ فلیچر ہی واحد آدمی تھا، جو خاموش کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ ان سے ہاتھ ملایا۔ تو وہی گرمی اور وہی توانائی اس کے ہاتھ میں، جو دوسروں کے چہرے پر تھی اور آنکھوں میں بھی.........

"ہاں......... تو شاید ہم پھر کبھی نہ ملیں۔۔!" لیفٹیننٹ نے میرا ہاتھ دبایا.........

"ہاں.........شاید کبھی نہیں!!" میں نے اس شریف انگریز کو اسی گرمجوشی سے کہا اور رخصت ہو گیا.........

٥ ٥

ری ان فورس منٹ کیمپ میں ذمہ داری کا کوئی کام نہیں تھا۔ صبح پی ٹی ہوتی، تھوڑی سی پریڈ اور شام کو کھیل کود ......... فوج کے مختلف یونٹ اور مختلف شعبوں کی یہاں دو ہزار نفری تھی۔ ان کیمپوں میں زیادہ تر سپاہی ٹریننگ سنٹروں سے ٹریننگ مکمل کر کے بھیجے جاتے تھے یا میری طرح ناپسندیدہ لوگ سرپلس ہو کر یہاں آجاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ڈیمانڈ کے مطابق ان کو سیکنڈ لائن یا فرنٹ لائن پر بھیج دیا جاتا تھا۔

ہمارے ایم ٹی گروپ کے نائب انچارج صوبیدار نشان علی بے حد شریف آدمی تھے۔ وہ فرنٹیئر فورس رائفل سے آئے تھے اور مستقل سٹاف میں تھے۔ ان کو ڈرائیونگ سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ تازہ راشن کے لیے کیمپ کی گاڑی روزانہ گوہاٹی سپلائی ڈپو جایا کرتی تھی۔ واپسی پر صوبیدار نشان علی ڈرائیونگ کی مشق کرتے تھے۔ اس دن راشن لانے کی میری ڈیوٹی تھی۔ شہر سے باہر نکلے تو معمول کے مطابق صوبیدار نشان علی سٹیرنگ پر آبیٹھے .........

سامنے سے امریکن سپاہیوں کی مختصر سی کانوائی آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کانوائی کی پہلی گاڑی میں صوبیدار نشان علی جیسا کوئی نو آموز ہی بیٹھا تھا۔ اس کی گاڑی بری طرح دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر نشان علی بھی گھبرا گیا.........

حادثہ اچانک سر پر آن پہنچا تو میں نے سٹیرنگ پکڑ کر گھمانے کی کوشش کی مگر صوبیدار نشان

علی نے سٹیرنگ اس سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ میری ساری چابکدستی کے باوجود گاڑیاں زور سے ٹکرائیں۔ شیشے کی ایک کرچ میرے ہونٹ کے آر پار چلی گئی..........

میری گردن اور یونیفارم لہو لہان ہوگئی۔ صوبیدار کو خراش تک نہ آئی........ گاڑیوں کے انجن ایک دوسرے میں پھنس گئے۔ ایکسیڈنٹ کرنے والا امریکی سپاہی خاموشی سے سٹیرنگ پر بیٹھا رہا۔ ان کا ایک سارجنٹ واہی تباہی بکتا رہا۔ ان کے باقی سپاہی ہنستے رہے۔

کیمپ پہنچے۔ میرا ہونٹ سوج کر کپا بن گیا تھا۔ صوبیدار نشان علی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ گوہاٹی ملٹری ہسپتال فون کیا گیا۔ ایمبولینس آئی اور مجھے لے گئی..........

ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر نے میرے زخم میں ٹانکے لگائے..........

صبح اٹھتے ہی غیر ارادی طور پر میں نے ہونٹ ٹٹولا تو وہ اسی طرح غبارہ بنا ہوا تھا..........

نو بجے ہسپتال کے کرنل انچارج دو ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ راؤنڈ کے لیے آیا تو میں نے آسمان سر پر اٹھا لیا..........

میں چیخ رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا..........

”اگر میرا ہونٹ اصلی حالت پر نہ آیا تو خودکشی کر لوں گا۔“

کرنل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی..........

”آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا جوان، بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر کب؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”بس دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ سوجن اتر جائے گی۔ تحمل سے کام لو۔“ اور واقعی دو دن کے بعد ہونٹ اصلی حالت میں آگیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا..........

ملٹری ہسپتال میں داخل ہونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ ایک دو انڈین ڈاکٹر کے علاوہ تمام سسٹرز اور ڈاکٹر یورپین تھے۔ خدمت اور توجہ کا اتنا اعلیٰ معیار میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ آج تک پھر ایسی سروس دیکھ سکا ہوں۔ کھانے پینے کی ہر چیز



نفیس اور وافر تھی۔ یورپ امریکہ اور دوسرے ممالک سے ریڈ کراس کے ذریعے جو تحفے آتے تھے، ہر ہفتے مریضوں کو تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔

انگریز سسٹرز مریضوں میں اون اور سلائیاں تقسیم کرتیں اور بے حد لگاوٹ سے سویٹر بننا سکھاتیں.......... میرا زخم اب ٹھیک ہو رہا تھا مگر ہسپتال میں اتنا آرام سکون اور دلچسپیاں تھیں کہ ری ان فورس منٹ کیمپ واپس جانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔

ایک دن لیفٹیننٹ فلیچر کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ بیان نہیں کر سکتا مجھے کتنی خوشی ہوئی۔

واقعہ یہ تھا کہ لیفٹیننٹ فلیچر نے کیمپ کمانڈنٹ کو میرے متعلق فون کیا تھا اور سفارش کی تھی کہ حوالدار گل کو زیادہ عرصہ ران فورس منٹ کیمپ میں رکھنے کی بجائے بہتر ہوگا کہ کسی اچھی کمپنی میں ٹرانسفر کر دیا جائے۔ چنانچہ کیمپ کمانڈر نے میرے متعلق دریافت کیا۔ ایکسیڈنٹ کا معلوم ہوا تو اس نے لیفٹیننٹ فلیچر کو میرے حادثے کی اطلاع کر دی۔

یوں لیفٹیننٹ فلیچر یہاں تک پہنچ گیا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے میرے پاس بیٹھا رہا۔ جب وہ جانے کے لیے اٹھا تو میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا..........

”سر خدا کرے یہ ہماری آخری ملاقات نہ ہو۔“

وہ ہنس پڑا اور پھر چلا گیا..........

میرا زخم اب بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ ہونٹ کے نیچے ذرا سا نشان باقی تھا جو اب تک موجود ہے۔

ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر کیمپ پہنچا تو حسب توقع میرا تبادلہ بمع ایک لانس نائیک اور دس سپاہیوں کے ضلع سلہٹ میں ہو چکا تھا۔ یاد نہیں رہا کمپنی کا نمبر کیا تھا؟

تقریباً پندرہ دن اس کمپنی کو تلاش کرتے رہے کئی دریا عبور کیے، کئی یونٹوں کے چکر لگائے۔ ریلوے سٹیشن پر اور مختلف کیمپوں میں راتیں بسر کیں۔ صبح اٹھ کر کٹ اور بستر اٹھاتے اور سفر شروع کر دیتے۔ خوب دھکے کھائے۔ تقریباً سارا ضلع ریل کے ذریعے

دیکھ لیا۔

کمپنی مل گئی......... سلہٹ شہر سے ذرا باہر لڑکیوں کے کالج کے قریب ہی کمپنی کا کیمپ تھا.........

سلہٹ مجھے جس قدر پسند آیا اتنا ہی صدمہ اس بات کا ہوا کہ جس جی پی ٹی کمپنی میں ہمارا تبادلہ ہوا تھا' اس کی مکمل نفری ہندو جاٹوں کی تھی۔ ہمیں غلطی سے وہاں بھیجا گیا تھا۔ یہاں صوبیدار گنگا پرشاد جیسے ہندو نہیں تھے بلکہ ان میں اکثریت چھوت چھات کی ماری ہوئی تھی۔ اس لیے پہلے دن ہی ہمارا چولہا الگ کر دیا گیا۔

ظاہر تھا کہ جب تک کہیں اور تبادلہ نہ ہو جاتا ہمیں وہیں رہنا تھا۔

سلہٹ مزاروں مسجدوں اور چائے کے باغات کا صاف ستھرا بھیگا بھیگا شہر تھا.........

چرا پونجی کے نزدیک ہونے کی وجہ سے سارا سال بوندا باندی رہتی تھی۔ ان دنوں سلہٹ آسام کا ایک ضلع تھا.........

میں نے یہاں پہلی بار قیمتی ساڑھیاں باندھی ہوئی لڑکیوں کو ننگے پاؤں دیکھا تو انتہائی حیرت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ چونکہ ہروقت برسات رہتی ہے چپل یا سینڈل دو دن میں ختم ہو جاتے ہیں' لہٰذا عورتیں ننگے پاؤں گھومتی ہیں۔ زمین جاذب ہے کیچڑ بالکل نہیں ہوتا' اس لئے پاؤں خراب نہیں ہوتے۔ کالج کی چھٹی ہوتی سینکڑوں لڑکیاں کالج کے گیٹ سے سڑک پر نکلتیں تو سانولے اور سفید نازک نازک پیروں کا عجیب سماں بندھ جاتا۔ چھوٹے چھوٹے قدموں اور رواں دواں پھولوں کا یہ قافلہ یا مجھے اتنا رومانٹک اور دلفریب لگتا کہ اکثر چھٹی کے وقت اس سڑک پر آنکلتا.........

چائے کے باغات کا نظارہ بھی کچھ کم دلکش نہ تھا۔ ملتان اور ساہیوال کے کھیتوں میں جس طرح لڑکیاں روئی کے پھول چنتی ہیں' اسی طرح آسام کی گول مٹول نازک نازک لڑکیاں ململ کی سادہ ساڑھیاں باندھے دوردور تک باغات میں پھیلی ہوئی پتیاں چنتی رہتیں.........

ہم حیرت اور مسرت سے اس عمل کو دیکھتے.........



ہمارے کیمپ کے قریب ایک ٹیلے پر کسی مسلمان خانوادے کا گھر تھا۔ اس کا محلِ وقوع نہایت دیدہ زیب تھا۔ یہ چاروں طرف سے بانسوں کے جھنڈ اور اناس کے پیڑوں سے گھرا ہوتا تھا۔ گھر کے نیچے ایک بڑا تالاب تھا۔ یہاں سے ان کا نوکر روزانہ دو چار مچھلیاں پکڑتا تھا۔ اس علاقے کے سارے کھاتے پیتے گھروں کے ساتھ تالاب لازم و ملزوم تھا۔

یہاں کی بھیگی بھیگی فضا' کومل کومل مزاج اور دھیما دھیما تمدن مجھے بے حد پیارا لگا لیکن جلد ہمارے تبادلے کے احکام آ گئے۔ میرے ساتھ جتنے سپاہی آئے تھے ان کو واپس ری ان فورس منٹ کیمپ بلا لیا گیا تھا۔ البتہ میرا تبادلہ انالیس جی پی ٹی کمپنی میں کر دیا گیا تھا۔

یہاں سے ایک کانوائی کے ساتھ مجھے شیلانگ جانا تھا......... یہ نہایت دلچسپ سفر تھا۔ ہم چرا پونجی کے بالکل قریب سے گزرے۔ یہ سارا پہاڑی راستہ تھا۔ مری کی اونچائیوں اور اترائیوں کی طرح خوبصورت شیلانگ' جو آسام کا گرمائی صدر مقام بھی ہے۔ مری اور شملہ کی طرح خوبصورت شہر ہے۔ یہاں پان کی دکانوں میں نوجوان خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ شیلانگ صرف دو گھنٹے ٹھہرنا تھا۔ میں پان کھانے کا عادی نہیں تھا۔ سگریٹ بھی شوقیہ کبھی کبھار پی لیتا تھا۔ لیکن ان دو گھنٹوں میں مَیں نے مختلف دکانوں سے دس پان کھائے اور دس سگریٹ پیئے۔

دو گھنٹے میں اتنے پان کھانا اور اتنے سگریٹ پینا میری زندگی کا ریکارڈ ہے۔ یہ لڑکیاں بے حد لگن سے پان بناتیں اور اسی لگاوٹ سے مسکرا کر گلوری پیش کرتیں۔ دس میں سے چھ لڑکیوں کی انگلیوں سے میری انگلیاں چھوئیں اور اسی میں لطف آ گیا۔ غالباً" میری طرح اور بھی بہت سے فوجیوں نے اس طرح کی حماقتیں کی ہوں گی اور بلا ضرورت پان کھائے ہوں گے.........

شیلانگ سے دوبارہ گوہاٹی واپسی ہوئی۔ گوہاٹی سے بذریعہ ریل میں ڈبرو گڑھ پہنچ گیا.........

ڈبرو گڑھ آسام کا سرحدی شہر ہے۔ شہر سے دو میل باہر ایک چھوٹے سے ریلوے

سٹیشن کے قریب انتالیس جی پی ٹی کمپنی کا کیمپ تھا......... کیمپ کے شمالی سمت دھان کے کھیت تھے اور دوسری طرف چائے کے باغات ......... باغات اور کیمپ کے درمیان سڑک اور ریلوے لائن متوازی چلی گئی تھیں۔

اس کمپنی میں دو ہندو جونیئر کمشن افسر بھی تھے لیکن اکثریت پنجاب اور گڑ گاؤں کے مسلمانوں کی تھی۔

عجیب اتفاق تھا کہ ایک ناپسندیدہ حوالدار کی جگہ دوسرا ناپسندید حوالدار آیا تھا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بے حد پسند کیا۔ حوالدار شفیق الرحمٰن چھریرے جسم کا بے حد سلجھا ہوا قبول صورت نوجوان تھا۔ وہ یو پی کا رہنے والا تھا اور انتہائی شستہ اردو بولتا تھا.........

انتالیس جی پی ٹی کمپنی اچھی شہرت رکھنے والی کمپنیوں میں سے تھی۔ کمپنی کمانڈر کا نام تو میں بھول گیا لیکن سیکنڈ اِن کمانڈ کیپٹن ہمبری بے حد نفیس آدمی تھا.........

جس دن میں حوالدار شفیق الرحمٰن سے چارج لے رہا تھا تو اس نے نہایت تپاک سے پلاٹون کے تمام عہدیداروں اور سپاہیوں کا کردار بیان کیا کہ کون کس طرح کے سلوک سے خوش ہوتا ہے اور کون کس طرح کے سلوک کا مستحق ہے۔ یہ سب باتیں اس نے سمجھائیں، حتیٰ کہ یوسف لانگری کے متعلق بتایا کہ اگر وہ صبح صبح آپ کو چائے اور پراٹھے نہ پہنچائے۔ رات کو اس کا پہرہ لگا دیا کریں۔ بس پھر وہ تین ماہ تک آپ کی مکمل سروس کرے گا۔ ہر تین ماہ بعد اسے ایک ڈوز پلا دیا کریں تو تکلیف نہ ہوگی!"

میں دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ تبادلے کی وجہ پوچھی تو بولا.........

"یہاں ایک ہندو صوبیدار ہے۔ ہیڈ کلرک زبان کا میٹھا، دل کا کالا، ایک دن جناح صاحب کو گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے جھانپڑ مار دیا، بات بڑھ گئی۔ بہت سے جونیئر افسر میرا ساتھ دے رہے تھے۔ انگریز افسروں نے یہی مناسب جانا کہ میرا تبادلہ کر دیا جائے۔"

میرے دل میں شفیق الرحمٰن کی عزت اور بڑھ گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب جناح صاحب چپکے سے میرے دل میں آ کر بیٹھ گئے تھے حالانکہ



یہ میری عمر کا وہ دور تھا کہ سیاست کی الف بے کا بھی پتہ نہیں تھا۔ جب وہ چارج دے چکا تو ہنس کر کہنے لگا.........

"ابھی میں نے آپ کو مکمل چارج نہیں دیا۔ آپ کی خوش قسمتی کہ آپ مجھے پسند آ گئے ہیں اور پھر آپ اس قابل بھی ہیں کہ گیتا سے آپ کا تعارف ہو!"

میں نے حیرت سے یہ نام سنا اور یکبار گی میرا دل دھڑک اٹھا.........

"آپ کی حیرت بجا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا.........

"یہ عجیب و غریب کیس ہے۔ گیتا ایک بدھ لڑکی ہے مگر اس کا شوہر ہندو ہے۔ دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان کو آپس میں محبت ہو گئی۔ شادی بھی ہو گئی۔ اب تک ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہیں مگر بد قسمتی پچھلے ڈیڑھ سال سے اس کا شوہر نامرد ہو چکا ہے۔ اس پر بھی وہ گیتا کو چھوڑنا نہیں چاہتا ہے اور نہ گیتا اسے چھوڑنا چاہتی ہے۔۔۔۔

"وہ اپنا علاج کروا رہا ہے مگر گیتا کے جذبات کا اتنا دھیان رکھتا ہے کہ اس نے گیتا کو اجازت دے دی ہے کہ جس مرد کو پسند کرے اس سے جنسی تعلقات استوار کر لے!"

"واہ.........!" میں نے بے ساختہ کہا.........

"گیتا نے پہلے تو انکار کیا۔" شفیق نے بات جاری رکھی......... "مگر شوہر کے اصرار پر اس حد تک رضا مند ہو گئی کہ مرد کا انتخاب خود سلیل سنہا کرے۔"

"خوب.........!" میری حیرت بتدریج بڑھ رہی تھی.........

"تو مسٹر گل........." وہ ہنستے ہوئے بولا "قرعہ فال بنام من دیوانہ زوند!"

"مگر آپ کی ملاقات مسٹر سنہا سے کیسے ہوئی؟"

"وہ ایئرپورٹ کے امریکن بیس میں سٹور کیپر ہے۔ تنخواہ کے علاوہ ہزاروں روپے ماہوار کماتا ہے۔ شاندار کوٹھی میں رہتا ہے۔ زندگی کی ہر آسائش اسے میسر ہے۔"

"کیا پہلی ملاقات میں ہی اس نے آپ کو سب کچھ بتا دیا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا.........

"نہیں یہ سب باتیں مجھے گیتا نے بتائی ہیں۔ سنہا نے تو اس بارے میں آج تک

ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ جان بوجھ کر انجان بنا ہوا ہے:

"لیکن گیتا تک رسائی کیسے ہوئی؟"

"دو چار ملاقاتوں کے بعد سنہا نے مجھے گھر پر شاندار دعوت دی۔ گیتا سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایک لمحے میں ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔"

"پھر.........؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ میں گیتا کے پاس نہ پہنچتا۔ یہ آنا جانا سنہا کی ڈیوٹی کے اوقات میں ہوتا۔ گیتا وہ سب باتیں بتاتی جو رات کو سنہا کے ساتھ ہوتیں۔"

"مثلاً........." میں نے پوچھا.........

"مثلاً" یہ کہ وہ نامرد ہے اور یہ کہ سنہا کا انتخاب کیسا ہے اور یہ بھی کہ اگر ایسے صاف ستھرے فوجی سے اولاد ہو گئی تو وہ خود ان دونوں کی اولاد معلوم ہو گی۔"

"واہ .........! گویا مسٹر سنہا خاصے عالی ظرف آدمی ہیں!"

"دراصل وہ گیتا سے بے پناہ پیار کرتا ہے کیونکہ گیتا بھی معمولی عورت نہیں ہے۔ وہ ان عورتوں میں سے ہے جن کے لیے بادشاہ تاج و تخت چھوڑ دیتے ہیں۔"

میرے شوقِ آوارگی پر تازیانہ سا پڑا.........

"لیکن کیا ضروری ہے کہ مسٹر سنہا آپ کی مسند پر مجھے بٹھائیں گے؟"

"اس لئے مسٹر سنہا سے پہلے میں آپ کا تعارف گیتا سے کرا دوں گا کہ آپ ہی میرے جانشین ہیں اور پھر آپ کسی سے کم ہیں کیا۔ گیتا آپ سے بہت مرعوب ہو گی۔"

"پھر بھی سنہا کی رضا مندی بہرحال لازمی ہے۔"

"اس کی فکر نہ کریں گیتا خود میدان ہموار کر لے گی۔"

میں نے شک بھرے لہجے میں کہا.........

"شفیق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ خواب کی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایک ہندو نے اس کام کے لیے مسلمان کو منتخب کیا ہو۔"

وہ ہنسنے لگ گیا.........



"آج دو بجے آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ سنہا چار بجے ڈیوٹی سے آف ہوتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سنہا محلے یا شہر کے کسی آدمی کا انتخاب کر کے بدنامی سے ڈرتا تھا۔ اس کام کے لیے آپ یا مجھ جیسے اجنبی کی ضرورت تھی۔"

"ہاں، بات کچھ دل کو لگتی ہے مگر میری حالت عجیب ہو گئی ہے۔ میرے سینے میں شورش برپا ہے۔ جب سے آپ نے گیتا کا ذکر چھیڑا ہے، مجھ پر لرزا سا طاری ہے۔"

"میری بھی یہی کیفیت تھی۔ گیتا سے تعلق میرا پہلا تجربہ تھا۔ غالباً" آپ کا بھی یہ پہلا تجربہ ہو گا؟"

"نہیں میرا یہ پہلا تجربہ نہیں ہے مگر میں ویسا ہی جذباتی ہو رہا ہوں، جیسا پہلے تجربے میں ہوا تھا۔ وہی بے چینی وہی بے کلی اور وہی سیمابیت ہے۔"

شفیق ہنس کر بولا۔

"اور ابھی آپ نے گیتا کو دیکھا بھی نہیں۔"

"آپ نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا ہے، وہ یقیناً" غیر معمولی ہی ہو گی اور جس بے نیازی سے مجھے اپنا جانشین بنا رہے ہیں، اس کی بھی داد دینا پڑے گی"۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ فوجی ملازمت میں من مانی کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ کھیل کا آغاز تو بس کھیلنا ہی تھا لیکن یہ گیتا کا کمال تھا کہ میں اس کی عزت کرنے لگ گیا، بلکہ اس سے محبت کرنے لگ گیا۔ اس کے رویے میں ایسی کوملتا ہے کہ کوئی اسے حقیر جان ہی نہیں سکتا مگر حقیقت بہرحال حقیقت ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہی ہو گا۔ اسے چھوڑنا ہی ہو گا لیکن گیتا سے جو اُنسیت پیدا ہو گئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اس کا دامن خالی نہ رہے۔ میں یہی کر سکتا ہوں تاکہ کسی موذی کی بجائے اپنے سے بہتر آدمی اس کے سامنے کھڑا کر دوں!"

شفیق الرحمٰن مجھے اور زیادہ اچھا لگا.........

تقریباً" پونے دو بجے وہ مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر شہر لے گیا.........

میرے دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ گیتا کے کئی چہرے میرے تصور

میں بن رہے تھے اور مٹ رہے تھے۔ حتیٰ کہ ہم ایک چھوٹے سے خوش نما کاٹج کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ شاید گیتا اس مخصوص وقت پر موٹر سائیکل کی آواز سننے کی عادی تھی کیونکہ اگلے لمحے وہ مسکراتی ہوئی برآمدے میں آگئی تھی.........

شفیق الرحمٰن کے ساتھ ایک نئے آدمی کو دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکی مگر پیچھے نہ ہٹی۔ سرخ دامن والی سیاہ ساڑھی میں اس کا خوبصورت جسم اور ملیح و تیکھے گندمی چہرہ' چھوٹی سی ٹھوڑی' بولتے ہوئے ہونٹ' گول سی ناک' روشن سیاہ آنکھیں' لمبے سیاہ بال جو پیچھے کی بجائے آگے کو داہنی چھاتی سے ہوتے ہوئے کولہوں تک چلے گئے تھے .........

واقعی وہ غیر معمولی لڑکی تھی......... آسامی خدوخال کا شاہکار!

شفیق الرحمٰن نے تعارف کرایا......... "مسٹر گل میری جگہ ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں۔" گیتا نے ننھا سا سلام کیا۔ اس کی آنکھوں میں پذیرائی تھی۔ میں نے اسی لمحے جان لیا کہ شفیق اس سے میرا ذکر کر چکا ہے۔ اندر گئے' ٹیبل پر کھانا لگا ہوا تھا اور لنچ کا پورا پورا اہتمام تھا' یہاں بھی تصدیق ہو گئی کہ گیتا کو میری آمد کا علم تھا.........

دو قسم کے چاول' چپاتی' اچار' چٹنی کے علاوہ مرغ و ماہی اور ایک نیا ذائقہ رکھنے والی سویٹ ڈش' خوبصورت چینی برتن' گلاسوں میں نیپکن کے پھول بنے ہوئے۔ ہر چیز سے سلیقے کا اظہار ہوتا تھا اور پھر اگر بتی کی دھیمی دھیمی خوشبو نے ماحول کو بے حد خوشگوار بنا دیا تھا۔

گیتا کبھی میری طرف متوجہ ہوتی 'کبھی شفیق کی طرف' کبھی مچھلی کا ٹکڑا' کبھی مرغی کی بوٹی بڑھا کر کھانے کے لیے اصرار کرتی۔

میں اور شفیق ٹیبل کے ایک طرف بیٹھے تھے۔ وہ ہمارے سامنے بیٹھی تھی۔ ہماری آنکھیں بار بار ملتیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفیق نے اس کے حسن کا ذکر کر کے جس طرح مجھے مرعوب کیا تھا بعینہٖ میرا ذکر کر کے گیتا کو بھی چوکس اور مضطرب کر دیا تھا کیونکہ اس کی کشش انگیز آنکھوں میں نہ صرف سپردگی تھی' بلکہ اس کے چہرے سے ایک نئے پیش آنے والے



تجربے کی خوشی' امنگ اور اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

اس کے رویے میں بیک وقت سادگی اور راز داری تھی۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ ایک دن بالکل یہی کیفیت شفیق الرحمٰن کی ہو گی جو آج میری ہے۔ یہ جذبہ جسے میں اعلیٰ ارفع یا ادنیٰ ہونے کا درجہ نہیں دے سکتا تھا' نہایت سادگی اور شدت سے میری طرف منتقل ہو رہا تھا۔ گیتا کی فطرت سے کوئی چیز ابلتی ہوئی' بہتی ہوئی' میرے وجدان میں اتر رہی تھی اور میری روح کو سرشار کر رہی تھی۔

مجھے ایک بار پھر لیفٹیننٹ فلیچر یاد آیا' جس نے مجھے اخلاقی اور روائتی جکڑ بندیوں سے آزادی کا مژدہ سنایا تھا کہ مجھے ایک فن کار کی فطرت ملی ہے اور میں ہر محبت سے نئی زندگی شروع کروں گا۔ وجہ غالباً" یہی تھی کہ میں اور وہ دونوں اس عظیم اور لطیف مسرت سے دوچار ہو رہے تھے اور شادی کے ارادے کے بغیر اسے حاصل کر رہے تھے۔

اس طرح کی محبتیں جن کا انجام شادی نہیں ہوتی' مقدر بنتی جا رہی تھیں۔ مگر یہ عجیب تھا کہ میں اپنے تئیں آخر دم تک ان محبتوں میں مخلص رہا!

گیتا میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں دل ہی دل میں عہد وفا کر بیٹھا تھا۔ ایسا عہد وفا جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ لیکن میرا دل صاف تھا اور اس میں کوئی دھوکہ نہیں تھا۔

یہ بے حد ٹھوس تسلی تھی.........

کھانے کے بعد وہ کافی بنانے کے لیے اٹھی تو شفیق الرحمٰن نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا.........

"ہاں گل بھائی خواب کی تعبیر کیسی رہی.........؟"

میں نے جذباتی لہجے میں کہا......... "شفیق میں تمہیں ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"

تقریباً" ساڑھے تین بجے ہم کیمپ واپس آگئے۔

پروگرام کے مطابق دوسرے دن گیارہ بجے شفیق الرحمٰن مجھے ہوائی اڈے لے گیا۔ سلیل سنہا اپنے کمرے میں بیٹھا فون پر کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے اشارے سے

ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا......... سلیل لڑکیوں کی طرح باریک خدوخال کا قبول صورت نوجوان تھا ٹیلی فون سے فارغ ہوا تو اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔ اس رویے میں نہ گرم جوشی تھی نہ سردی مہری۔ شفیق الرحمٰن نے تعارف کرایا تو وہ ذرا بھی نہ چونکا۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور متین لگ رہا تھا.........

"بھابی کا کیا حال ہے؟" شفیق نے گھریلو انداز میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کب جارہے ہیں؟ وہ دعوت کے لیے کہہ رہی تھی!"

"بس ایک دو دن میں۔ غالباً" پرسوں۔"

"تو گویا کل دعوت دی جائے۔ ٹھیک ہے۔ میں کل کی چھٹی لے لوں گا۔ آپ دونوں آئیں گے نا۔ کیوں مسٹر گل آپ آئیں گے، مجھے بہت خوشی ہوگی؟"

"ضرور ........" مجھے سنہا کی اپروچ اور بات کرنے کا ڈھنگ اچھا لگا۔

"شفیق نے ہمارا گھر دیکھا ہے۔ آپ ان کے ساتھ آئیں گے نا یا میں آپ کے لیے گاڑی کا انتظام کر دوں؟"

"نہیں بھئی انہیں میں لیتا آؤں گا۔" شفیق بیچ میں بول اٹھا۔" آپ بھابی کا ہاتھ بٹائیے۔ گوشت کا انتظام کچھ وافر کیجئے گا۔ یہ سرحد کا پٹھان ہے۔"

سلیل ہنس کر بولا......... "آپ کو معلوم ہے میری بیوی بُدھسٹ ہے۔ کسی جاندار کو ازا پہنچانے کی قائل نہیں۔"

"مگر اس صدی میں تو بدھوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں۔ جاپان کو دیکھئے تین چوتھائی دنیا کے خلاف لڑ رہا ہے۔ ویت نام کو دیکھئے کس بے جگری سے یورپی طاقتوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔"

"ارے بھئی شفیق، تم سیاست میں بہت ٹانگ اڑاتے ہو۔ کتنے اچھے دن گزر رہے تھے۔ تم نے مسٹر جناح کی وجہ سے خواہ مخواہ صوبیدار کو طمانچہ مارا اور ٹرانسفر کروا بیٹھے۔"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے اس کا افسوس نہیں ہے۔ ہاں آپ لوگ یاد آئیں گے۔ ایسی کمپنی شاید پھر زندگی میں کبھی نصیب نہ ہو۔"



"اچھا بھئی خط تو لکھو گے نا" سلیل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ اکیلے ہم کو یاد کریں گے، ہم پانچ دس مل کر آپ کے لیے پرارتھنا کریں گے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "مجھے یقین اس لیے نہیں آتا کہ میری جگہ جو آدمی آیا ہے، وہ مجھ سے زیادہ آپ کا دل موہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

شفیق کی پہلو دار بات سن کر میں نے کہا۔ "یہ تو محض آپ کی مہربانی ہے کہ مسٹر سنہا سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ آدمیوں کے اس جنگل میں کون کسی کی پرواہ کرتا ہے۔"

سنہا جو ان تہہ دار باتوں کی بنیاد کو سمجھ رہا تھا بولا......... "اس جنگ کا ایک فائدہ تو ہوا کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے رابطہ پیدا ہوگیا۔ ورنہ تو ہم شاید زندگی میں کبھی نہ ملتے۔"

"یہ تو ہے۔" شفیق اس کی تائید میں بولا۔ "اب دیکھو یوپی کے ہندو اور آسام کے ہندو کے مزاج میں کتنا فرق ہے۔ ہمارے ہاں کے ہندو کا ذرا سی بات پر دھرم بھرشٹ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں ہم مسٹر سنہا کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔"

"اس کی ایک وجہ ہے شفیق" سنہا نے ایک پہلو نکالا۔ "میں کٹر مذہبی آدمی کبھی بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک بدھ لڑکی سے شادی کی۔ پھر یہاں کے ایک واقعے نے مزید سوچنے پر مجبور کردیا کہ کوئی مذہب قابلِ نفرت نہیں ہے۔ ہر دھرم میں اچھے لوگ ملتے ہیں۔ مثلاً" یہاں ہوائی اڈے کے بیچ میں ایک مزار ہے۔ جب یہاں ایروڈرم بن رہا تھا۔ اس وقت ایک شکستہ قبر کی نشان دہی ہوئی تھی مگر امریکیوں نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے بلڈوزروں سے صاف کر دیا۔ جب پہلا جہاز اڑایا گیا تو وہ اس قبر کے قریب آکر پھٹ گیا۔ سرگوشیاں تو پہلے بھی ہوتی رہتی تھیں لیکن اس حادثے کے بعد لوگوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ چنانچہ قبر تلاش کی گئی اور احتراماً" اس کے ارد گرد چار دیواری بنا دی گئی اور بجلی کے بلب روشن کر دیئے گئے۔ اس کے بعد کوئی حادثہ نہ ہوا چنانچہ تب سے میں کچھ زیادہ سیکولر ہوگیا ہوں اور مسلمان میرے لیے اجنبی نہیں رہے۔"

سنہا نے جو بات سنائی خدا جانے کہاں تک درست تھی مگر اس نے مسلمانوں سے

دوستی کا جواز تلاش کر کے مجھے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا.........

سنہا کہنے کو تو سٹور کیپر تھا مگر اس کے اختیارات بے حد وسیع تھے۔ چاروں طرف خام مال کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن پر ترپالیں بچھی ہوئی تھیں۔ سٹیشن پر مال گاڑیوں میں جتنا سامان آتا' سنہا کے زیر نگرانی اَن لوڈ ہوتا۔ وہاں سے سنہا کے زیر نگرانی بیس تک پہنچتا۔ سنہا بعض اشیا کا سودا سٹیشن پر ہی کر لیتا۔ وہاں سے پارٹی سامان اٹھا کر اپنی راہ لیتی۔

یہ سب باتیں مجھے شفیق نے بتائیں۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ جو شخص جنسی جذبات سے عاری ہے اس کا سینہ بھی ہوس سے خالی نہیں ہے۔اُسے دولت جمع کرنے کا شوق ہے ......... کیونکہ یہ دولت ہی ہے کہ اس نے بیوی کو گو نہ سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے جنسی احتیاج کا بھی مکمل خیال رکھتا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ سنہا کس قدر زیرک آدمی ہے کہ ایک بنیادی کمی کے باوجود اس نے گھر کو تباہ ہونے سے بچا رکھا ہے۔ وہ لمحے کتنے اذیت بخش ہوں گے جب شوہر نے بیوی کو جنسی آزادی دینے کے سلسلے میں ہم خیال بنایا ہوگا۔ خود گیتا نے بھی حجاب دبے حجابی کے کیسے کیسے مراحل طے کیسے ہوں گے اور کتنی اذیت سے گزری ہوگی۔ لیکن اب جب کہ وہ تمام سماجی اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہے اور نت نئے تجربوں کے بارے میں خود مختار ہے تو زندگی کو کیسے محسوس کرتی ہے؟

بالکل میری طرح کہ ہر نئی لڑکی کی محبت میں پہلی محبت کی طرح سرشاری اور گرم جوشی محسوس کرتا ہوں یا بات محض جنسی لذتیت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے؟

سنہا کی دعوت اور رویے سے بھی یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ گیتا نے میرے لیے راہ ہموار کر لی ہے۔ میں خوش تھا اور اس لمحے کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا جب شفیق جا چکا ہوگا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس خوش نما کاٹج کے پھاٹک میں داخل ہوں گا۔

یہ تصور ہی عجیب وغریب تھا!

دوسرے دن عین وقت پر ہم دونوں دعوت میں گئے۔سنہا نے برآمدے میں خوش آمدید کہا۔ ہم تینوں ڈرائنگ روم میں بید کے بنے ہوئے سبک صوفے اور کرسیوں پر بیٹھ



گئے۔سنٹر ٹیبل پر تازہ پھولوں کا گلدستہ،سائیڈ ٹیبل پر سنہا اور گیتا کی شادی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ہر چیز میں قرینہ اور سلیقہ تھا.........

سنہا نے سگریٹ کا ٹن کھولا تو اسی لمحے گیتا گلابی ساڑھی پہنے ہوئے سبک سبک قدموں سے مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ اس نے ہم دونوں کو سلام کیا۔ سنہا نے میرا تعارف کرایا.........

"مسٹر گل شفیق کی جگہ آئے ہیں۔"

گیتا نے ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر سلام کیا۔ اس تاثر کے ساتھ گویا ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔ میں نے بھی اسی تاثر کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ شفیق ذو معنی انداز میں مسکرا رہا تھا.........

ہم تینوں نے سگریٹ سلگایا۔ گیتا نے سونف الائچی اور خوشبو دار سپاری کی چھوٹی سی ٹرے ہماری طرف بڑھائی۔ ہم نے ایک ایک الائچی منہ میں ڈال لی۔

گلابی ساڑھی میں گیتا کا چہرہ کل کی نسبت زیادہ نکھرا نکھرا لگا۔ یہی تازگی اور شگفتگی اس کی آنکھوں میں بھی تھی.........

کھانے کی میز پر اس کی توجہ زیادہ تر میری طرف ہی رہی۔ یہ دعوت شفیق کے اعزاز میں تھی مگر محسوس ہو رہا تھا کہ شفیق کی آڑ میں دراصل میری دعوت ہوئی ہے۔

شفیق کا رویہ بہت ہلکا پھلکا تھا۔ اس کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ اس نئی صورتِ حال سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایسا ڈاکٹر تھا جو ہم تینوں کے دکھ سکھ کو سمجھ رہا تھا اور تشخیص کردہ نسخہ کارگر ثابت ہو رہا تھا۔

اگر شفیق کی جگہ میں ہوتا تو ایسی حقیقت پسندی کا ثبوت ہرگز نہ دے پاتا۔ ایک ایسی لڑکی جس سے میرا جنسی تعلق رہا ہو اور جسے دل و جان سے پسند بھی کرتا ہوں، اس سے جدا ہوتے وقت میرا جذباتی ہو جانا بالکل یقینی تھا۔ یہ میرے کردار کی کمزوری سہی لیکن میں اس لڑکی کو آئندہ بھی ہمیشہ یاد رکھتا جس نے میری زندگی کو مسرت کے چند مہکتے لمحوں سے آشنا کیا تھا.........

شفیق سے گیتا اور سنہا کی یہ آخری ملاقات تھی۔ سنہا تو خیر جذبات واحساسات پر قابو پانے والا آدمی تھا اور اس کی نفسیات کو سمجھنا اتنا آسان نہ تھا مگر میں نہایت غور سے گیتا کا مطالعہ کر رہا تھا.........

آخر وہ لمحہ آگیا، جب گیتا کی روشن آنکھوں کے دیئے ٹمٹمانے لگ گئے۔ شفیق نے سنہا کو گلے لگایا پھر گیتا کی طرف دیکھا........ گیتا ہاتھ جوڑے پر نام کر رہی تھی۔ ہونٹ کاٹ رہی تھی اور آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کے دامن میں جذب کر رہی تھی.........

اس لمحے گیتا مجھے بے حد اچھی لگی........ اور مجھے شفیق الرحمٰن پر رشک آگیا۔

شفیق حسب معمول مسکراتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ کیمپ کے قریب پہنچے تو اس نے پوچھا.........

"آپ کو یہ سب کیسے لگا؟"

"بے حد خوبصورت۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی ہے وہاں تہذیبی دباؤ بہت زیادہ ہے۔ غالباً" یہ اسی ماحول کا اثر ہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ جب آپ چلے جائیں گے تو میں اکیلا گیتا کے پاس جا کر کیا کہوں گا؟"

شفیق الرحمٰن ہنس پڑا........ "ارے بھائی یہ دعوت میری نہیں آپ کی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا' غالباً" آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ گیتا کس طرح آپ پر توجہ دے رہی تھی۔ نہیں صاحب نہیں' آپ کسی حجاب یا جھجک کے شکار نہ ہوں۔ کل آپ وہاں جائیں گے۔ گیتا آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے گی۔ سونف اور الائچی کی ٹرے آگے بڑھائے گی۔ آپ اس کی آنکھوں میں جھانکیں گے۔ وہ پلکیں جھپکائے گی۔ آپ اس کی کلائی پکڑ کر کھینچیں گے۔ وہ آپ کی آغوش میں آجائے گی۔"

"آپ اپنا تجربہ بیان کر رہے ہیں؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"بالکل بھئی بے خطر یہی کرنا........"

میں مسکراتا ہوا اسے دیکھتا رہ گیا........ رات بہت بے چینی سے گزری۔ صبح نو



بجے شفیق کی گاڑی چل پڑی تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

"ایک بجے تم نے وہاں جانا ہے۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا........ یہ آخری فقرہ تھا جو وہ بولا اور یہ پہلا فقرہ بھی تھا کہ اس نے مجھے "تم" کہہ کر پکارا۔ میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی.........

وہ موٹر سائیکل جو شفیق الرحمٰن کی تحویل میں ہوتا تھا' اب میں اس کا انچارج تھا۔ اچانک مجھے ایئرپورٹ جانے کی سوجھی۔ میں ایک نظر سنہا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ محض یہ تسلی کرنے کہ وہ ڈیوٹی پر ہے لیکن پھر مجھے ان گاڑیوں کا معائنہ یاد آگیا' جو پلاٹون کمانڈر نے آج دس بجے کرنا تھا۔ اس کمپنی میں یہ قاعدہ تھا کہ روزانہ دو گاڑیاں ڈیوٹی سے آف ہوتی تھیں۔ ان کی مکمل گریسنگ ہوتی تھی اور نٹ بولٹ چیک کیئے جاتے تھے۔

جب میں کیمپ واپس پہنچا تو گاڑیاں انسپکشن کے لیے بالکل تیار تھیں۔ انجن دیکھا، شیشے کی طرح صاف تھا۔ ڈانگری پہن کر گاڑی کے نیچے لیٹ کر دیکھا۔ ڈیفرنشل کمانیاں' ویل' چیسز ہر چیز صاف ستھری تھی........ پلاٹون کمانڈر نے ایک ایک نٹ چیک کیا۔ ایک ایک گریس نپل کا معائنہ کیا مگر سپاہی جو اس کے سخت رویے اور مزاج سے واقف تھے' گاڑیوں کی سروس میں کوئی کمی نہ چھوڑتے.........

تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے وہ معائنہ ختم کرکے چلا گیا۔

نہا دھو کر وہیں لنگر میں سپاہیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ لمبا تڑنگا سپاہی ریاست علی جو غالباً" گڑگاؤں یا رہتک کا رہنے والا تھا' تھرماس کے کپ میں میرے لئے چائے لایا........ دوسرے سپاہیوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ ریاست علی کے پاس اتنی قیمتی تھرماس دیکھ کر میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا.........

نائیک اللہ دتا ہنس کر بولا........ "حوالدار صاحب ریاست علی کے پاس یہ تھرماس ہی نہیں اور بھی بہت سی قیمتی چیزیں ہیں۔ آپ کو ضرورت ہو تو اس کے پاس کیمرے'

دوربین، پین، گھڑیاں وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔"

"واقعی ........!" میں نے حیران ہو کر ریاست علی کی طرف دیکھا ........ "بھئی کہاں سے لاتے ہو یہ چیزیں؟"

"سر، چوری کرتا ہوں، امریکی فوجیوں کے کیمپوں سے۔ وہاں بے کار پڑی رہتی ہیں، میں لے آتا ہوں۔ بیچ دیتا ہوں اور روپیہ گھر بھیج دیتا ہوں۔"

میں ہکا بکا ریاست علی کو دیکھتا رہ گیا۔ نائیک اللہ دتا بولا۔

"بھئی ریاست ذرا حوالدار صاحب کو بتا دو۔ منی آرڈروں کی رسیدیں، کتنا روپیہ گھر بھیج چکے ہو؟"

"سر، صرف اٹھارہ ہزار روپے، چیزیں تو قیمتی ہوتی ہیں مگر چوری کا مال ہوتا ہے اونے پونے بیچ دیتا ہوں!"

میں اس کی جرأت اور صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔

"مگر اتنا روپیہ تم نے بھیجا کیسے؟ کمپنی میں تمہیں چیک کرنے والا کوئی نہیں تھا؟"

"سر میں نے اپنے نام سے کوئی منی آرڈر نہیں بھیجا۔ شہر میں میرے بہت دوست ہیں وہی میرے باپ کے پتہ پر روپیہ بھیج دیتے ہیں۔ بعد میں رسید دے دیتے ہیں۔"

"تمہارا باپ جانتا ہے کہ یہ چوری کا روپیہ ہے؟"

"ہاں سر!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں گاؤں میں بھی یہی کام کرتا تھا۔ ضلع بھر میں کہیں بھی چوری کی واردات ہوتی تھی، پولیس میرے گھر پہنچ جاتی تھی۔ بعد میں پولیس سے سمجھوتہ ہو گیا۔ سو میں پچیس پولیس کا حصہ ہوتا تھا!"

"تو پھر فوج میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" میرا تجسس بڑھتا چلا گیا۔

"سر، ذرا آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے!"

"خوب!" میں اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ مجھے شفیق الرحمن یاد آ گیا ........

"ایک بجے تم نے وہاں جانا ہے ........!"

گیتا کی کوٹھی کا پھاٹک کھلا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو بریک لگائی تو گیتا مسکراتی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔ وہ پیلے بارڈر والی ململ کی دھاری دار ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ میں جو متوقع تھا کہ آج وہ زرق برق دیدہ زیب لباس میں ملبوس ہو گی، اسے سادہ گھریلو لڑکی کے لباس میں دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی کہ طوائفیت کا سامنا کرنے سے بچ گیا ........

اس نے ہاتھ جوڑے نہ پرنام کیا، بس سادگی سے کھڑی مسکراتی رہی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو ہولے سے بولی ........ "آیئے!"

ڈرائینگ روم میں میں کل والی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے الائچی اور سونف والی ٹرے آگے بڑھائی۔ میں نے ایک الائچی اٹھائی مگر اس سے آگے شفیق الرحمن کی تجویز پر عمل نہ کیا ........ وہ خاموشی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس نے میک اپ نہیں کیا تھا ........ یہ دل لبھا دینے والی سادگی تھی۔ چند لمحے دونوں طرف خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں حرارت تھی، تجسس بھی اور کسی حد تک دھیمی دھیمی سی اذیت بھی ........

اس اذیت اور حرارت کو گیتا بھی محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے نرم نرم نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی ........ "کھانا لگاؤں ........؟"

"میں تو کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔"

"کیوں ........؟" وہ ایسی حیران ہو کر بولی' جیسے مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

میں نے ہنس کر کہا......... "بھوک بہت لگی تھی۔"

"مگر آپ کو تو لنچ یہیں کرنا تھا!"

وہ ایسے دعوے سے بولی کہ بس مزہ ہی آگیا۔ اگرچہ میں مدعو نہیں تھا مگر لنچ کی بات تو سمجھ رہا تھا۔ گویا ہربات طے تھی' اس لئے اس کا دل رکھنے کے لئے کہا۔

"چلیے۔ میں آپ کے ساتھ دوبارہ لنچ کر لیتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے مجھے ٹوکا۔ "لنچ پر لنچ نہیں ہو گا۔ میں آپ کے لیے سویٹ لاتی ہوں۔ بس وہی کھا لیتا۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میرا دل مچل رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ بالکل اپنوں جیسا سلوک کر رہی تھی۔ اس کے انداز میں اپنائیت اور محبت کی ملی جلی آنچ تھی۔ مگر میں جو ایسے معاملات میں کُرید کا عادی تھا' یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس تعلق خاطر میں جنسیّت کا عنصر کتنا تھا۔ خلوص کتنا اور سچ کتنا؟

کیونکہ خود میں اس کے لئے ایک خاص احساس رکھتا تھا۔ ایسا احساس جو محض مطلب براری تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں اچھی دوستی کی مہک تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایک دن آئے گا ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے' شوہر سے محبت کرتی ہے۔ بقول شفیق الرحمٰن اس سے مکمل وفادار بھی ہے۔ اس کے باوجود میں اس عورت کی قربت میں خوشی محسوس کر رہا تھا اور اس میں کوئی فریب نہیں تھا.........

اتنے میں وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوارٹر پلیٹ تھی۔ اس میں چھ رس گلے تھے......... جب اس نے رس گلے میری طرف بڑھائے تو میں نے ہنستے ہوئے کہا.........

"یہ سب میں کھاؤں گا؟"



وہ ہونٹ دبا کر مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا.........

تین رس گلے کھا کر میں نے ایک رس گلہ چمچ میں اٹھا کر اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنی سیاہ آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کے لبوں پر شرارت سی ابھری۔ پھر وہ ہنس پڑی اور اس نے منہ کھول دیا.........

رس گلے کھا کر میں نے اس سے کہا۔ "لنچ کرنے سے پہلے آپ نے میٹھا کھا لیا۔"

"میں آج لنچ نہیں کروں گی۔ بھوکی رہوں گی تاکہ آپ کو احساس ہو کہ آپ کی وجہ سے میں بھوکی رہ گئی ہوں!"

میں نے پیار سے اس کے منہ پر ہلکا سا چپت رسید کیا۔

وہ تڑپ اٹھی......... اس کی آنکھوں میں پیار کے دیئے جگمگا اٹھے اور اس کا چہرہ تمتما گیا......... اس کے انگ انگ اور نس نس سے ردِ عمل کا اظہار ہو رہا تھا۔

اسی لمحے میں نے اس کے گول شانوں پر ہاتھ رکھے......... میرے تن بدن میں بجلی سی لہرا گئی......... اس کے ہونٹ تھرتھرائے......... میں نے دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اس کا منہ اٹھایا......... اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں بند کر لیں.........

میں دونوں انگوٹھوں سے اس کے رخسار دھیرے دھیرے سہلا رہا تھا۔ پھر خاموشی سے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے.........

تقریباً چار بجے جب میں نے اس سے رخصت لی تو ہم دونوں بہت ہلکے پھلکے تھے اور بے حد گھمبیر بھی.........!

گیتا چھٹی لڑکی تھی جس سے میں نے محبت کی.........

یوں مس سارا کے بعد گیتا دوسری لڑکی تھی' جس سے میرا جنسی رشتہ استوار ہوا اور بلاشبہ گیتا مس سارا سے زیادہ پر جوش' محبت کرنے والی اور شگفتہ لڑکی تھی.........

اب میرا معمول بن گیا۔ کمپنی کے سارے کام نمٹا کر ایک بجے تک میں گیتا کے ہاں پہنچ جاتا۔ صرف اتوار کو نہ جاتا کیونکہ اس روز سنہا گھر پر ہوتا.........

جوں جوں میں گیتا کے قریب ہوتا گیا' توں توں اس کی شخصیت کے پرت کھلتے

گئے.......... اس نے ہسٹری میں ایم۔ اے کیا تھا جبکہ سنہا محض گریجوایٹ تھا۔ ہارمونیم پر اسے مکمل عبور تھا.......... طبلہ وہ بجاتی تھی.......... شعر وہ کہتی تھی۔ ناچ وہ جانتی تھی اور آواز میں ایسی لوچ تھی کہ گاتی تو نشہ طاری ہو جاتا..........

نرم گفتاری ایسی کہ مہکتے گلوں کی خوشبو آتی۔ مزاج میں دھیماں پن ایسا کہ روح میں حلول ہو جاتی..........

ایک دن میں نے اسے چھیڑا.......... "کیا ہماری مشرقی اقدار اس بات کی اجازت دیتی ہیں جو ہم نے اپنے لیے روا رکھا ہے؟ کیا سنہا کے رویے کو مہذب سوسائٹی حق بجانب قرار دے سکتی ہے؟"

اس نے بے حد تحمل سے جواب دیا..........

"جہاں تک اقدار کا مسئلہ ہے' خود میں بھی اس کے اثر میں رہی ہوں۔ یہ اقدار ہی تھے' جب مجھ پر سنہا کی نامردی کا راز کھلا.......... مگر اف تک نہ کر سکی۔ آپ اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتے' جو سنہا کے پہلو میں لیٹ کر میں کئی مہینوں تک برداشت کرتی رہی ہوں۔ لیکن سنہا بنیادی طور پر عالی ظرف آدمی ہے۔ اس نے محسوس کر لیا کہ زندگی صرف روٹی' الفاظ اور ذہن تک محدود نہیں ہے۔ کیونکہ تمام آسائشوں کے باوجود میرے دل کی کلی مرجھا گئی تھی اور میرے ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ تب سنہا نے ڈرتے ڈرتے اس صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی اور ترغیب دی کہ اس معاملے میں مجھے آزادی ہے..........

"بظاہر مجھے پھر بھی اقدار کا خیال ستا رہا تھا۔ گرچہ دل نے فیصلہ کر لیا تھا اور شاید بہت پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ میرا حق مجھے ملنا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں نے سنہا کا حقیقت پسندانہ فیصلہ قبول کر لیا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دل کے بغیر دنیا کے دوسرے معاملے نہیں چلتے اور تمام مراعات بے کار ہو جاتی ہیں۔ اقدار کیا' زندگی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب شفیق آ گیا تو ہم نے پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ دراصل یہ زندگی کی پہچان تھی.......... ہم جنسی کا احساس تھا۔ یہ بالکل سادہ



سچائی تھی.......... نہ بدلنے والی حقیقت تھی.......... پھر آپ آ گئے.......... شفیق سے زیادہ وجیہہ' زیادہ توانا اور زیادہ جوشیلے۔ سچ کہتی ہوں' زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہیں ملی تھی.......... جتنی میں آج مسرور ہوں..........

"سہاگ رات کو سنہا نے جو مسرت دی تھی' وہ محبت مجھے اب ہر روز ملتی ہے۔ آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے رکھتی ہوں.......... آپ کو بھانت بھانت کی چیزیں کھلاتی ہوں تو من شانت ہوتا ہے۔ آپ کی سیوا میرا دھرم بنتا جا رہا ہے۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ انسان کے پاس محبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اب رہا سنہا کا رویہ اور مہذب سوسائٹی کا وجود' تو میں نہیں سمجھتی کہ سنہا پر کیونکر الزام آ سکتا ہے۔ ہمارے لئے دو ہی راستے تھے.......... پہلا یہ کہ ہم الگ ہو جاتے اور دوسرا یہ کہ ساتھ نہ چھوٹتا.......... علیحدہ ہونے میں یہ خطرہ تھا کہ ہم دونوں بکھر جاتے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتے.......... شوہر کی دھتکاری ہوئی عورت کا ہمارے سماج میں کیا مستقبل ہو سکتا ہے.......... خود سنہا کا کیا حال ہوتا.......... گھریلو زندگی ختم ہونے کے علاوہ دنیا کی لعنت ملامت کے سوا اور کیا ملتا.......... تو غالباً" یہی بہتر تھا کہ ہماری زندگی میں ایسا اجنبی آتا جو سنہا کی قدرتی کمی سے پیدا ہونے والے خلاء کو پر کر دیتا..........

"چنانچہ ایسا ہی ہوا.......... اس نئی صورتِ حال سے سنہا کو ضرور تکلیف ہوتی ہو گی کہ حسد و رقابت انسان کے لئے فطری امر ہے.......... لیکن ایک ایسا شخص جو مردانگی کے جوہر سے عاری ہو چکا ہو اگر خودکشی نہیں کرے گا تو پھر یہی کرے گا.......... جو سنہا کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے اس سے ہمدردی ہے.......... کہ وہ بے قصور ہے اور پھر وہ میرے معاملات میں اس قدر دلچسپی لیتا ہے۔ میرے جذبات و احساسات کا اس قدر دھیان رکھتا ہے کہ مجھے اس پر رحم آ جاتا ہے۔ جو کماتا ہے' میرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور اس کے بدلے صرف یہ چاہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ نہ جاؤں!"

"غالباً" وہ جذبات جو سنہا کے لیے شادی سے پہلے تھے' اب نہیں رہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا..........

"نہیں، میں شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی اس سے دیوانہ وار محبت کرتی رہی ہوں۔ اگر وہ اس حادثے سے دو چار نہ ہوتا تو شاید میری محبت میں کمی نہ آتی مگر اب وہ پہلی والی لگن نہیں رہی۔ یہ بالکل سادہ اور قدرتی بات ہے اور اس تبدیلی پر میں کوئی دوش محسوس نہیں کرتی......... لیکن جب دیکھتی ہوں کہ کس بے تابی سے وہ اس بچے کا ذکر کرتا ہے......... جو اس کا بچہ نہیں ہو گا......... یعنی میرا اور صرف میرا بچہ ہو گا......... تو واقعی جی کانپ جاتا ہے......... اور پھر صرف رحم ہی نہیں دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتی ہوں......... بس یہی بندھن ہے کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔"

اس کا فیصلہ سننے کے بعد میں نے سنجیدگی سے کہا.........

"ہم جو پتی پتنی کی طرح رہ رہے ہیں۔ ہم جو ایک دوسرے پر جسم و جان نچھاور کرتے ہیں۔ تم جو میری راہ میں آنکھیں بچھائے رکھتی ہو......... میں جو تمہارے لیے گہرے احساسات رکھتا ہوں۔ کیا ہمارا مقدر یہی ہے کہ جدائی کا لمحہ آئے تو تمام تر جذبات و احساسات کو کچل کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں؟"

اس نے گھمبیر نگاہوں سے میری طرف دیکھا......... "ہو سکتا ہے جو کچھ آپ چاہتے ہیں، وہی خواہش میری بھی ہو۔ مگر میری خواہش کے مقابلے میں آپ کی خواہش اس لئے قابل احترام ہو جاتی ہے کہ میرا کردار مثالی نہیں ہے۔ آپ شفیق سے میرے تعلقات جاننے کے باوجود میری آرزو کرتے ہیں۔ ایک ایسی عورت کی آرزو، جس کو ملنے سے پہلے آپ ایک ماڈرن قسم کی طوائف کا تصور رکھتے ہوں گے۔ بہت ہمت کا کام ہے اور میرے لیے اس سے زیادہ عزت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے پیار و محبت کی سزاوار ٹھہروں......... یقیناً" آپ نے میرے رویے میں سچائی کا کوئی عنصر محسوس کیا ہو گا۔ کیونکہ میں اپنی فطرت کی تمام توانائیاں بڑی بے ساختگی سے آپ کے سپرد کرتی رہی ہوں اور ہمیشہ پوری سچائی سے اپنی آتما آپ کے حوالے کرتی رہی ہوں.........

"میں نے مذہب اور نسل کے بغیر آپ کو پہچانا تھا۔ پہچان تو خیر شفیق سے بھی ہوئی



تھی لیکن وہ صرف جسموں کا بیوپار تھا۔ شریر اور آتما کے بھید تو میں نے صرف آپ پر نچھاور کئے ہیں۔ یہ ذہنی فیصلہ نہیں تھا، دل کا معاملہ تھا اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ نظر کے فیصلوں کے مقابلے میں دل کے فیصلوں میں زیادہ شکتی ہوتی ہے مگر میں وہ بدقسمت استری ہوں......... جسے شوہر بھی ملا۔ پیار بھی ملا۔ جسے دوسری عورتوں سے زیادہ پیار ملا۔ جسے سب کچھ ملا۔ لیکن پھر بھی تہی دامن ہے......... شوہر جو صرف میرا ہے۔ مجھ سے کتنا دور جا چکا ہے۔ میں جو اس کے ساتھ وفا کا دعویٰ کرتی ہوں اس سے کتنی دور کھڑی ہوں......... آپ ہیں، جس کے پریم کو میں دھرم سمان جانتی ہوں۔ کہاں تک اپنا کہہ سکتی ہوں گل جی......... میں وہ ناؤ ہوں جو کھیون ہار کے بغیر منجدھار میں گھر گئی ہو......... جس کا ہر لمحے ڈوبنے کا اندیشہ ہو۔ ایسے سے آپ مجھے جیون کا سندیسہ دیتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ کتنا انوکھا۔ من میں کھدبد ہوتی ہے، نئے سفر کی کھدبد۔ جینے کی نئی امنگ، دور دیس کا سفر، کیا ان سپنوں میں تعبیر ہے گل جی، کیا یہ سچ ہو جائے گا؟"

اس نے بات ختم کی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کی من موہنی باتوں سے میرا سینہ عجیب گیان دھیان سے بھر گیا تھا۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی تھی اور اب دھیرے دھیرے رو رہی تھی......... وہ کس قدر دکھی تھی.........!

مجھے پہلی بار شدید احساس ہوا کہ ایک مکمل مرد کے بغیر عورت کی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے اور یہ بھی کہ محبت کرنا عورت کا بنیادی حق ہے۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس پہلو پر بات کیوں کی، جو ہم دونوں کے لیے پل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے.........!

وہ میرے سینے میں منہ چھپائے ہوئے تھی۔ اس کا خوبصورت ننھا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، جسے میں سہلا رہا تھا اور بار بار چوم رہا تھا۔ مجھے رام پیاری یاد آ گئی اور اس کا وہ تاریخی خط.........'

میں ہار گئی ہوں گل جی۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔ ان پہاڑوں سے پرے اور ان پربتوں سے بھی دور، کوہ سفید کے دامن میں، جہاں

قبائلی سورما بستے ہیں......... جہاں کوئی فرنگی نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں
کوئی ہندو نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں قانون اور مذہب کی کوئی طاقت مجھے
تمہاری آنکھوں سے دور نہیں رکھ سکتی .........!

جس طرح رام پیاری کا خط پڑھ کر میں حواس باختہ ہو گیا تھا' بالکل اسی طرح گیتا کا ردِ عمل دیکھ کر میں سوچوں میں ڈوب گیا تھا......... آج پھر ایک بدھ لڑکی مجھے گل جی' کہہ کر پکار رہی تھی......... اور پرواز کے لیے پَر تولے بیٹھی تھی.........

ابھی جنگ جاری تھی اور گیتا شادی شدہ عورت تھی۔ دونوں صورتیں ایسی تھیں کہ جو کچھ میں نے کہا تھا......... ناقابلِ عمل تھا......... اس کا حصول آسان نہ تھا تو پھر یہ کیوں ہوا کہ اپنی اہمیت کا احساس کرایا اور اسے سپنوں کی وادی میں لے گیا.........

یہ انسان ہے کیا چیز؟ میں نے سوچا۔ کیسی کیسی باتوں سے خود کو اہم بناتا ہے اور جب لوگ اس کے اہم ہونے پر صاد کرتے ہیں تو خود کو کتنا بے بس پاتا ہے!

مجھے چپ پا کر اس نے سر اٹھایا اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی.........

"گل جی' تقدیر ہر سے میرا ساتھ کب تک دیتی رہے گی؟ میں کب تک اپنی وفاداریاں بدلتی رہوں گی؟ ہر بار آپ کی طرح ہیرا میرے ہاتھ کب لگے گا؟ یہ پہاڑ سی زندگی حیلوں اور آسروں کے ذریعے کہاں تک کٹے گی؟ یہ جنگ کب تک رہے گی؟ سنہا بے چارا ہر چھ ماہ بعد ایک اجنبی کہاں سے لائے گا؟ پھر یہ بھی تو ہے کہ ایک دن جنگ ختم ہو جائے گی۔ سارے پردیسی لوٹ جائیں گے اور میری نہ ختم ہونے والی جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔ میں کیسے لڑوں گی یہ رن.........؟ نہ آتے میرے جیون میں آپ' نہ پلاتے پریم رس' نہ آوارہ ہوتا یہ من' نہ ہوتی میں باؤلی اور نہ ڈھونڈتی سپنوں کی تعبیر؟"

میں نے پیار سے اس کے آنسو پونچھے۔ بے حد عقیدت سے ان سیاہ آنکھوں کو بار بار چوما اور پھر اسے سینے سے لگا کر زارو زار رو پڑا......... پھر جانے کتنی دیر تک ہم چپ چاپ سینہ بہ سینہ لیٹے رہے......... اس خاموشی کے کیا معنی تھے۔ اغلباً" ہم ایک دوسرے کو جواب دے چکے تھے......... لیکن پریم بندھن نہ ٹوٹا تھا.........



شفیق الرحمٰن نے جس گیتا کا تعارف کرایا تھا' یہ گیتا اس گیتا سے بالکل مختلف تھی......... شفیق گیتا کی آتما تک رسائی نہ پا سکا تھا۔ بظاہر وہ جس طرح ہنستی کھیلتی نظر آتی تھی' اس کے برعکس نہایت سنجیدہ اور متین عورت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جو ملائم اور کومل سی مسکان ہوتی تھی' اس میں گیتا کی آتما کی گھمبیرتا کی جھلک ملتی تھی.........

اب میرا معمول بن گیا تھا۔ سوائے اتوار کے روزانہ ایک بجے وہاں پہنچ جاتا' تین بجے تک گیتا کے پاس رہتا۔ نت نئے ذائقوں کا چسکہ بھی گیتا نے مجھے ڈالا تھا۔ اس کے گداز جسم کی خوشبو کی طرح اس کے ذائقے بھی منفرد تھے۔

ہفتے میں ایک بار سنہا سے بھی ضرور ملاقات ہوتی۔ ہماری کمپنی کی گاڑیاں اکثر ایئرپورٹ پر ڈیوٹیوں کے لئے جاتیں۔ میں چیکنگ کے بہانے نکلتا۔ پہلے گیتا کے پاس جاتا۔ اس کے بعد کیمپ میں اور کبھی کبھار سنہا سے ملنے چلا جاتا......... لیکن سنہا سے ملاقات میرے لئے شدید اذیت کا باعث بنتی......... کیونکہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ جتنی دیر وہاں بیٹھتا' ایسا محسوس ہوتا کہ میں مسلسل جھوٹ بول رہا ہوں......... سنہا مجھے چائے پلاتا یا کافی اور اتوار کو گھر آنے کی تاکید کرتا......... جس کی میں ہمیشہ تائید کرتا لیکن کبھی اتوار کو وہاں نہ جاتا.........

ایک دن شام کو کیمپ واپس آیا تو میرے کمرے میں دو پیٹیاں پڑی ہوئی تھیں......... معلوم ہوا کہ سپاہی ریاست علی کا کارنامہ ہے......... ایک پیٹی میں امریکن بیئر کی دو درجن بوتلیں اور دوسری پیٹی میں آدھ آدھ پونڈ کی پکی ہوئی مچھلی کے چھتیس بند ٹن تھے......... میں نے یہ دونوں پیٹیاں گیتا کے ہاں پہنچا دیں......... گیتا نے بیئر کی ساری بوتلیں ایک ایک کر کے نالی میں بہا دیں' البتہ مچھلی کی ایک ڈش ایک ماہ تک لنچ کے ساتھ آتی رہی.........

یہ نہایت لذیذ مچھلی تھی.........

تقریباً" ایک ماہ بعد رات کے دس بجے ہمارے ہیڈ کوارٹر میں فون آیا کہ ہمارا ایک سپاہی ایئرپورٹ کے قریب امریکن کیمپ میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ مجھے فوراً"

ریاست علی کا خیال آ گیا......... چنانچہ گارد بھیج دی گئی۔ ایک گھنٹے بعد گارد واپس آئی......... تو ساتھ ریاست علی بھی تھا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' چہرے پر جگہ جگہ خراشیں تھی۔ امریکی سپاہیوں نے اسے بہت مارا تھا۔ ہمارے پلاٹوں کے صوبیدار نے ریاست علی کو دیکھ کر ایک زور دار قہقہہ لگایا......... "کیوں بچو! آخر قابو آ گئے نا؟"

ریاست علی خفیف سا ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر اس کے کورٹ مارشل کا فیصلہ کیا گیا۔ ہفتہ دس دن ٹرائل ہوتا رہا۔ ریاست علی کو ایک سال کی سزا ہو گئی۔ جس دن اسے جیل بھیجا جا رہا تھا' وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا.........

"حوالدار صاحب' مجھے قید کی پروا نہیں۔ بس ایم ٹی کی نوکری چھوٹنے کا افسوس ہے!"

لگ بھگ یہی دن تھے۔ جب مجھے صوبیدار گنگا پرشاد کا خط ملا۔ اسے ڈیوٹی کے سلسلے میں امپھال جانا پڑا تھا......... راستے میں وہ ایک گھنٹے کے لیے "مرم" بھی رک گیا تھا۔ اب وہاں کوئی اور جی پی ٹی کمپنی آ گئی تھی.........

اس خط میں "تن تارارا" کی موت کی اطلاع تھی......... اس نے اسی دن خودکشی کر لی تھی......... جس دن ہم نے مرم کیمپ چھوڑ دیا تھا.........

میری زندگی میں یہ پہلی موت تھی......... جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ باؤلے کتے کی طرح سارا دن میں اپنے آپ سے لڑتا رہا......... ایک ایسی لڑکی جو سراپا سچ تھی۔ میری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی......... وہ لوگ جو اس طرح مرتے ہیں' کتنے طاقتور ہوتے ہیں۔ محبت تو اس سے میں نے بھی کم نہیں کی تھی مگر محبت کے لئے مرنے کی شکتی مجھ میں نہ تھی۔

اتواروں کے علاوہ یہ پہلا ناغہ تھا کہ میں گیتا کی طرف نہ گیا۔ شام کو سنہا ہمارے کیمپ آ گیا۔ لیکن میری سرخ آنکھیں اور سردمہری کا رویہ محسوس کر کے وہ خاموش بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا' گیتا نے اسے بھیجا ہے......... لیکن اس نے کوئی ذکر نہ کیا۔ اسے اندازہ



ہو گیا تھا کہ میں ذہنی اور قلبی طور پر منتشر ہوں۔ چائے پی کر جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا.........

"کل میں آپ کی طرف آؤں گا۔"

"ضرور' ویل کم!" اس نے ہاتھ ملایا اور چلا گیا.........

دوسرے دن میں گیتا کی طرف گیا تو اس نے حیرت اور محبت سے مجھے خوش آمدید کہا......... اندر پہنچے......... تو میں اس سے لپٹ کر زارو قطار رونے لگ گیا۔ وہ حیران اور پریشان تھی......... لیکن اس کی بانہوں میں آغوشِ مادر کی طرح تسکین تھی۔ میرے اردگرد کی دنیا میں گیتا واحد ہستی تھی جسے میں اپنے دکھوں میں شریک کر سکتا تھا.........

جب دل کا بھڑاس نکل گیا۔ میں قدرے سنبھل گیا اور ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے نہایت اعتقاد سے میری پیشانی چوم لی......... میں نے خط نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا......... وہ خط پڑھتی رہی۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔

قبل ازیں میں نے اپنی کسی محبت کا ذکر اس سے نہیں کیا تھا۔

خط پڑھ کر اس نے اپنی سیاہ آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ چند لمحے خاموشی سے دیکھتی رہی......... پھر عجیب تمکنت سے بولی.........

"اگر مجھے یقین آ جائے کہ آپ میرے لئے بھی ایسے ہی خلوص سے روئیں گے تو آج ہی مر جاؤں!"

"نہیں' آپ نہیں مر سکتیں۔" میں نے اس کی تردید کی......... "آپ سمجھوتے کی راہ ڈھونڈ نکالیں گی......... کیونکہ آپ کے خون میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ خود میں بھی تو آپ کی طرح ہوں.........

"تن تارارا کی موت کے بعد زندہ ہوں......... اور آپ کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا' محبت کے لیے مرنا ضروری نہیں؟"

"آپ سنہا کی موت پر کب مری ہیں......... میرا مطلب اس کی جنسی موت سے

ہے۔ آپ نے زندہ رہنے کو ترجیح دی......... زندگی نے کچھ نہ کچھ آپ کو دیا' موت آپ کو کیا دے سکتی تھی.........!"

"تو پھر آپ نے اس ناگا لڑکی کی موت کا اتنا اثر کیوں لیا؟"

"میں سچ کو کس طرح نظرانداز کر سکتا ہوں......... اس کی موت ایسی ہی گداز حقیقت ہے' جیسی آپ کی خوبصورت آنکھیں۔ جس طرح یہ آنکھیں ہمیشہ میرا پیچھا کرتی رہیں گی' اسی طرح یہ موت ہمیشہ میری روح کو تھپتھپاتی رہے گی۔ میرا خیال ہے' زندگی ایسی ہی دلگداز اوز خوشگوار باتوں سے عبارت ہے۔"

گیتا کی آنکھیں یکبارگی چمک اٹھیں اور اس کے چہرے پر نرمی اور تازگی کی نورانی لہر پھیل گئی......... وہ کیف بھرے لہجے میں بولی.........

"قدرت نے آپ سے ملاپ ہی اس لئے کرا دیا ہے کہ میں جیون کے معنی پا لوں......... آپ اتنے اچھے ہیں کہ زندوں کو من میں بسا لیتے ہیں اور مرنے والوں کو آتما میں گھُلا دیتے ہیں۔ آپ کا پریم پاپ نہیں پُن ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں' میں ہسٹری میں ایم۔ اے لڑکی کو جیون کے معنی کیونکر سمجھا سکتا ہوں......... لوگ تو شاید اسے پسند نہ کریں کہ میں زندگی میں جذباتی رویے کو ترجیح دیتا ہوں مگر میرے نزدیک عقلی رویہ زندگی کو ضبط و نظم تو دے سکتا ہے لیکن اصل خوشی اور غم کا حقیقی احساس تو جذباتی سطح پر ہی ملتا ہے۔"

"ہاں........." اس کی آنکھیں اور زیادہ دمکنے لگیں......... "میں اب سمجھی ہوں کہ جب آپ میرے قریب ہوتے ہیں تو میرا نراج کیوں ختم ہو جاتا ہے اور دھرتی کے سارے غم کیوں بھول جاتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں آپ کے وچاروں میں بہت گیان ہے۔ آپ کی باتوں سے امرت رس ٹپکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے قلبی' ذہنی اور جسمانی طور پر آپ کو سب سے زیادہ محسوس کیا ہے اور یہ میرے جیون کا سب سے اعلیٰ ترین دور ہے۔ ایک طرح سے جو کچھ میں نے پانا تھا پا لیا ہے۔ جب تک آپ میرے پاس ہیں' میں خود کو دنیا کی سکھی عورت کہہ سکتی ہوں۔ جس دن آپ مجھے چھوڑ جائیں گے' وہی میرا روزِ حساب



ہو گا اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

میں بے حد اپنائیت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' سچ تھا......... سچ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سچ کو پہچاننے کی صلاحیت تقریباً" ہر آدمی میں ہوتی ہے......... اس کی آغوش میں مجھے سکون مل رہا تھا۔ تن تارا کی روح فرسا موت کا غم اس کے خوبصورت گداز جسم میں جذب ہو رہا تھا۔

بیڈ روم کی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کے پنڈولیم نے چار بجائے تو اس نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا......... یہ سنہا کی چھٹی کا وقت تھا۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن کے نیچے سے کھینچ لیا۔ وہ خفیف سی ہو گئی اور میری طرف دیکھ کر بولی.........

"آپ جا رہے ہیں کیا؟"

"ہاں........." میں نے سادگی سے کہا......... "سنہا کی چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گئی......... یہ عجیب بات تھی کہ جس شوہر کی اجازت سے یہ سارا معاملہ چل رہا تھا' اسی کا ہمیں احساس بھی تھا۔ دراصل یہ بے حد نازک مسئلہ تھا۔ ایسی ڈھٹائی کا مظاہرہ بہت مشکل تھا کہ ہم اپنے آپ کو حیوانی سطح پر کھڑا کر دیتے.........

جب میں پھاٹک سے نکل رہا تھا تو وہ برآمدے میں کھڑی تھی' اداس اور گھمبیر۔ یقیناً" وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں یہاں سے جاؤں مگر مجھے تو جانا ہی تھا۔ یہ بات خود وہ بھی جانتی تھی کہ ہم جو اتنے آزاد تھے' اتنے آزاد بھی نہ تھے!

انہی دنوں مردان مکینک سکول سے ایک خط آیا۔ یہ گشتی مراسلہ تھا۔ ساری جی پی ٹی کمپنیوں سے ایک ایک حوالدار ٹریننگ کے لئے بلایا گیا تھا۔ کمپنی کا سیکنڈ ان کمان کیپٹن ہمبری جو کھیلوں کا بہت شوقین تھا اور کھیلوں کی وجہ سے میرا دوست بن گیا تھا' ٹریننگ کے لیے میرے نام کی سفارش کر دی۔ تین چار روز بعد مجھے علم ہوا تو سخت گھبرایا۔ میں گیتا سے دور کہاں جا سکتا تھا۔

ایک دن شام کو فٹ بال کھیلنے کے بعد میں نے کیپٹن ہمپری سے مردان جانے سے معذرت کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ میری جگہ کسی اور حوالدار کو بھیج دیا جائے۔

وہ حیران ہو کر بولا......... "میں نے ارادتہً تمہارا نام بھیجا تھا۔ اس خیال سے کہ تم فرنٹیئر کے رہنے والے ہو......... ایک ماہ کے لیے جنگ کے ماحول سے نکل جاؤ گے، وطن سے ہو آؤ گے۔ اپنے پرایوں سے مل لو گے اور سیرو تفریح الگ ہو جائے گی۔"

میں نے خوبصورت طریقے سے دوبارہ معذرت کی۔ کیپٹن ہمپری مان گیا لیکن اس بات کو پندرہ دن بھی نہ گزرے تھے......... صبح کا وقت تھا۔ میں پلاٹون کو پی ٹی کرا رہا تھا۔ کیپٹن ہمپری بھی بنیان نکر اور پی ٹی شو پہنے گراؤنڈ میں آ گیا اور سپاہیوں کے پیچھے کھڑے ہو کر اکسر سائز میں شامل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد پی ٹی کا وقت ختم ہو گیا۔ سپاہی بیرکوں میں چلے گے۔ کیپٹن ہمپری خوش خوش میرے قریب آیا اور جنگ ختم ہونے کی خوشخبری سنائی۔ میں نے حیرت اور اچنبھے کا اظہار کیا......... تو وہ بولا......... "جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ رسمی طور پر آج یا کل جنرل میک آرتھر عہد نامے پر دستخط کر دیں گے۔"

جو لوگ اس محاذ پر رہ چکے تھے اور جاپانیوں کی سخت جانی اور ان کی کارروائیوں کی تھوڑی بہت خبر رکھتے تھے، وہ مشکل سے یقین کر سکتے تھے کہ جاپانی افواج شکست کھا سکتی ہیں اور جاپانی قوم جنرل میک آرتھر کی شرائط پر صلح کے لئے گھٹنے ٹیک دے گی۔

لیکن جب کیپٹن ہمپری نے تفصیل سے ذکر کیا کہ ہم نے ایک ایسا ایٹم بم تیار کیا ہے، جس نے چشم زدن میں جاپان کے دو بڑے بڑے شہر صفحہ ہستی سے مٹا دیئے ہیں۔ ان شہروں کی آبادی لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہ ایسا خوفناک بم ہے کہ ان دو شہروں ناگا ساکی اور ہیروشیما میں کوئی ذیح روح سلامت نہ رہ سکا اور کوئی مکان ثابت و سالم نہ بچ سکا.........

چنانچہ جاپان کے لیے ہتھیار ڈالنے کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اگرچہ بظاہر میں نے کیپٹن ہمپری کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا لیکن یہ اطلاع میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھی کہ ایک ہی وار میں لاکھوں آدمی لقمۂ اجل بن



جائیں اور پھر سب سے اہم بات، جنگ کے خاتمے کے بعد واپس جانے کی تھی اور گیتا جیسی لڑکی سے گویا جدائی کا لمحہ قریب آ گیا تھا.........

ایک بجے میں گیتا کی طرف گیا۔ موٹر سائیکل کی آواز پر وہ حسبِ معمول مسکراتی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔ میں جان گیا، جنگ ختم ہونے کی اطلاع ابھی اسے نہیں ملی۔

اندر گئے تو اس نے معمول کے مطابق اناس کا رس پلایا......... کھانے کے بعد وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگ گئی۔ میں نے مضطربانہ ٹھہراؤ کے ساتھ اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں.........

کچھ دیر تو وہ مسکراتے ہوئے میری ٹکٹکی کو دیکھتی رہی۔ پھر پریشان ہو کر ہنس پڑی.........

"کیا بات ہے، آپ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں؟"

"دل چاہتا ہے، آج آپ کو بہت رلاؤں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"تو پھر رلائیں نا۔ آپ کا دل چاہتا ہے تو ضرور رلائیں۔"

"آپ سچ مچ رو دیں گی۔"

"آپ کا تبادلہ ہو گیا.........؟" وہ ذرا سا چونکی۔

"نہیں.........!"

"تو پھر آپ مجھے نہیں رلا سکتے۔" اس کے لہجے میں دعویٰ تھا۔

"جنگ ختم ہو گئی گیتا! جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں!!"

گیتا کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ہاتھ جو تھوڑی دیر پہلے میرے ہاتھ کو سہلا رہا تھا، بالکل بے جان ہو گیا تھا۔ وہ ٹک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک چیخ مار کر میرے سینے سے لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں میری چھاتی اس کے آنسوؤں سے بھیگ گئی.........

"گیتا.........!" میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا......... "یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔"

وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا۔ اس تعلق خاطر کا انجام یہی تو ہونا تھا.......... میں بھی جانتا تھا' گیتا بھی جانتی تھی.......... چھ سات ماہ ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئے.......... مسرتوں کے مہ و سال چھوٹنے کا احساسِ زیاں اس لمحے ہوتا ہے' جب وقت حدِ فاصل کی لکیر کھینچ دیتا ہے اور انسان کو مجبور کر دیتا ہے کہ لکیر کے اس پار نہ جائے۔ اس کی سسکیوں کا سلسلہ نہ ٹوٹا.......... تو میں نے اسے بے اختیار چومنا شروع کر دیا لیکن آج اس شدید ردِ عمل کا مظاہرہ نہ ہوا کہ میں ایک بوسہ لیتا تو وہ اس کے بدلے دس بوسے گنتی اور تب بھی اس کا جی نہ بھرتا..........

میں نے محسوس کیا کہ اس کا دکھ بہت شدید ہے مگر میرے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں تھی کہ اس کے غم میں کمی کر سکتا.......... یہ دکھ ہمارا سانجھا تھا..........

گھڑی کے پنڈولیم کے تسلسل کی طرح وہ مسلسل روتی رہی۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ آج گھڑی کی چار بجنے والی گھنٹیوں پر بھی وہ نہ چونکی۔ آج وہ نہ میری کسی بات کا جواب دے رہی تھی اور نہ اسے شوہر کی پروا تھی.......... میں حیران و پریشان بیٹھا' جاؤں نہ جاؤں' رہوں نہ رہوں۔ اسے اس حالت میں چھوڑ کر جانا مجھے بہت معیوب لگ رہا تھا۔ ادھر سنہا کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

باہمی حجاب کا وہ پردہ جو میرے اور سنہا کے درمیان حائل تھا' میں قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن جانے وہ کیا جذبہ تھا کہ میں وہاں سے نہ جا سکا۔ حتیٰ کہ سنہا کی موٹر سائیکل کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی.......... میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر گیتا اب بھی نہ اٹھی۔ وہ اوندھے منہ پڑی سسکیاں بھر رہی تھی..........

میرا موٹر سائیکل باہر کھڑا تھا۔ ظاہر ہے سنہا نے دیکھا ہو گا مگر اس کے باوجود وہ سیدھا بیڈ روم میں آ گیا.......... گیتا کو روتے اور مجھے پریشان دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ گویا صورتِ حال کو سمجھنا چاہتا ہو مگر میں کیا کہتا.......... ایک عجیب مجرمانہ سا احساس مجھے گھیرے ہوئے تھا.......... وہ آگے بڑھا اس نے گیتا کے شانے پر ہاتھ



رکھا۔ گیتا نے کوئی نوٹس نہ لیا تو اس نے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ مگر میں اس سے آنکھ ملانے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ سنہا غالباً" میری کمزوری کو جان گیا تھا.......... یہی وجہ تھی کہ وہ میری طرف آیا اور دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ پھیلاتا ہوا ڈرائینگ روم کی طرف لے گیا.......... اس نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں..........

"کیا آپ نے اسے بتا دیا ہے کہ جنگ ختم ہو گئی ہے؟"

"ہاں.......... میں نے بتا دیا ہے!"

"تو پھر اسے رونے دو۔" سنہا اداس ہو گیا اور اس نے نظریں نیچے کر لیں۔

"تو کیا مجھے نہیں بتانا چاہیئے تھا؟"

"کب تک نہ بتاتے۔" سنہا ٹوٹے ہوئے دل سے بولا۔ "ریڈیو سے بھی اسے پتہ چل ہی جانا تھا۔"

"مگر وہ مسلسل تین ساڑھے تین گھنٹے سے رو رہی ہے۔ میں نے اسے ایک بجے یہ خبر سنائی تھی۔"

سنہا نے ایک بار پھر آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد تھا.......... نرمی تھی.......... اپنائیت تھی..........

"مسٹر گل۔" وہ دھیمے مگر پُر یقین لہجے میں بولا.......... "وہ آپ سے بہت متاثر ہے۔ اس کی وجہ شاید آپ کی شخصیت ہو مگر میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے!"

"مسٹر سنہا..........!" میں نے تقریباً" چیخ دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں مسٹر گل' میں اب مزید ایکٹنگ نہیں کروں گا۔ یہ حقیقت ہے' اسے دو ماہ کا حمل ہے۔"

میں ہونقوں کی طرح سنہا کو دیکھ رہا تھا۔ اس خبر سے جہاں میں بوکھلا گیا تھا' ایک نامعلوم قسم کی خوشی بھی میرے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ بوکھلاہٹ کی وجہ شاید یہ ہو کہ

احساس ذمہ داری نے مجھے چونکا دیا تھا اور خوشی کی بنیاد غالباً" یہ ہو کہ میری مردانگی آخر رنگ لائی تھی..........

سنہا بیک وقت میرے چہرے کی بوکھلاہٹ اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر بولا..........

"ہاں.......... یہ عجیب ہو گا کہ جو اس بچے کا اصل باپ ہو گا۔ وہ یہاں سے چلا جائے گا اور جو اس کا اصل باپ نہیں ہو گا۔ ساری زندگی اس کا اصل باپ سمجھا جائے گا!"

" تو کیا آپ اس صورت حال سے نباہ نہیں کریں گے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

" میں اس صورتِ حال کو قبول کرتا ہوں۔" وہ پُر عزم لہجے میں بولا۔ "اس کے کئی وجوہ ہیں.......... اول یہ کہ خود میں نے گیتا کو اس کی اجازت دی تھی۔ دوم یہ کہ سماجی طور پر یہ بچہ میرا بھرم رکھنے کی ضمانت ہے۔ سوم یہ کہ یہ بچہ ایک طرح سے گیتا کی مسرت اور مستقبل کی علامت ہے۔ چہارم یہ کہ یہ بچہ بھگوان کی امانت ہے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اگر سنہا کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا..........؟ اس لئے اس سے پوچھا..........

"آپ کا ضمیر' آپ کی فطرت' آپ کی انا کے بھی کچھ تقاضے ہوں گے۔ کیا آپ کی عالی ظرفی' ساری زندگی ان سے جنگ جاری رکھ سکے گی؟"

" میں کوشش کروں گا کہ لوگوں سے خوف کی پروا نہ کروں۔ میں جانتا ہوں' سماج کا فرد ہونے کے ناطے سماج کا خیال رکھوں۔ لیکن اگر کسی کا نقصان کیے بغیر میں سماج کو نظر انداز کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میں اسے نظر انداز کرنے میں عار نہیں سمجھوں گا.......... کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں سے خوف ہی "سماج" ہوتا ہے اور اپنے آپ سے خوف "ضمیر" ہوتا ہے۔ میرے پاس بچانے کے لئے باقی کیا رہ گیا ہے کہ اسے نہ بچا کر ضمیر کا خوف محسوس کروں۔ ایک دن وہ تھا کہ میری فطرت گیتا کی خاطر ساری دنیا سے ٹکر لینے کے لئے تیار تھی۔ ایک دن یہ ہے کہ میری فطرت خود اس کی تسکین کے ذرائع تلاش



کر رہی ہے.......... باقی رہی انا؟ انا کیا ہے۔ یہی کہ جو میں نہیں ہوں' اسی کا تقاضا کروں.......... جو میں نہیں ہوں.......... اسی کے لئے اصرار کروں.......... بار بار اس چیز کا اعلان کروں' جس کا وجود ہی نہیں ہے.......... مسٹر گل' فطرت کا مزاج ہی بے انصافیوں سے عبارت ہے۔ ایک بچہ بادشاہ کے گھر پیدا ہوتا ہے، وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ ایک بچہ مزدور کے گھر پیدا ہوتا ہے، وہ ساری زندگی مزدور رہتا ہے۔ اب اگر ایسی فطرت مجھے توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہو چکی ہے تو میں انا کا نعرہ لگا کر کیسے بچ سکتا ہوں۔ ضمیر مجھے کہاں کہاں پناہ دیتا پھرے گا تو پھر یہی ہوا نا کہ جو بچہ آ رہا ہے' فطرت کی تمام ستم ظریفیوں کی طرح اسے بھی قبولنا ہو گا۔ کیونکہ یہ تو ایک پراسس ہے۔ زندگی کا معمول ہے!"

سنہا کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس کی ذہانت اور دکھ دونوں کا شدید احساس ہوا..........

"مسٹر گل!" اس نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ " میں نے بہت روپیہ کمایا ہے۔ میں نیکی بدی پر یقین نہیں رکھتا۔ میں موت کے بعد کی زندگی پر بھی یقین نہیں رکھتا۔ میں اس سچائی کے علاوہ جو گیتا کی محبت کی شکل میں مجھے ملی ہے' کسی دوسری سچائی کو نہیں مانتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں گیتا کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں.......... گیتا اگر اس پر خوش ہے کہ اس کا مستقبل آپ سے وابستہ ہو تو میں اسے آپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دوں گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ آپ فوج کے ایک چھوٹے سے عہدے دار ہیں اور گیتا کے رہن سہن کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ لیکن مردانہ جوہر کھو جانے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سچّی خوشی روٹی سے نہیں' بوسے سے ملتی ہے اور آپ بوسے کی دولت سے مالا مال ہیں!"

سنہا جو سات پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ آج تمام پردے چاک کر کے باہر نکل آیا تھا۔ وہ کتنا عجیب اور انوکھا آدمی تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔

"اگر آپ کو پیسوں کی ضرورت ہو گی اور ظاہر ہے ہو گی تو سمجھئے' میں گیتا کو خالی ہاتھ نہیں بھیجوں گا۔ آپ کے پاس اتنا روپیہ ضرور ہو گا کہ دونوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے

گا۔ یقین جانیئے گیتا پوتر عورت ہے۔ شفیق سے اور آپ سے جنسی تعلق کے باوجود میں اسے دیوی سمجھتا ہوں۔ میں ہر قیمت پر اس دیوی کو وحشیا بنانے سے بچانا چاہتا ہوں......... بس یہی میری آخری آرزو ہے!!"

سنہا نے مجھے اس قدر مرعوب کر لیا تھا کہ کوئی بات ہی نہ کر سکا۔ میں جذباتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس شخص کو چند ماہ پیشتر میں اتنا بے رحس، بے غیرت اور جانے کیا کیا سمجھ رہا تھا، آج وہ کس قدر بے مثال شخصیت کے روپ میں سامنے آ گیا تھا.........

کچھ دیر بعد ہم دونوں گیتا کے کمرے میں واپس آ گئے.........

گیتا اب پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر آنکھوں کے گوشوں میں آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سنہا نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور چپکے سے نکل گیا۔

جنگ کے خاتمے کی خبر سپاہیوں میں پھیل چکی تھی۔ زیادہ تر لوگ خوش تھے کہ واپس گھروں میں جائیں گے......... کچھ لوگوں کو یہ خبر اچھی نہ لگی کہ بے روزگاری سے خائف تھے......... دوسرے دن ہی خبر موصول ہو گئی کہ جو لوگ خوشی سے ریلیز چاہتے ہیں، اپنے نام لکھوا لیں۔ بصورت دیگر حکومت کی صواب دید رجمنٹوں پر منحصر ہو گا کہ جس کو رکھے۔ جس رینک پر رکھے، کوئی معترض نہ ہو گا......... یہ بھی افواہ تھی کہ تمام رجمنٹیں اور کمپنیاں فرنٹ لائن اور ایل آف سی ایریا چھوڑ کر واپس آ رہی ہیں.........

جس دن میں نے اپنا نام ریلیز کے لیے لکھوایا۔ کیپٹن ہیری دفتر میں موجود تھے......... پوچھنے لگے......... "ریلیز کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا......... "کوئی منصوبہ نہیں ہے۔"

وہ ہنسنے لگ گیا اور کہنے لگا......... "میں نیوزی لینڈ جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ میرے ایک دوست کی فرم ہے، اس میں کام کروں گا۔"



میں نے موقع غنیمت جان کر کہا......... "کیا ایسا نہیں ہو سکتا سر، کہ مجھے لکھنؤ ریکارڈ آفس بھیجنے کی بجائے یہاں سے سیدھا گھر بھیج دیا جائے؟"

"ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہاں آپ کا حساب ہو گا۔ بیسہ ملے گا۔ ڈسچارج سرٹیفکیٹ ملے گا۔ گھر جانے کے لئے ریلوے وارنٹ ملے گا........."

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے سر، میں لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"مگر کیوں؟" وہ حیرت سے بولا۔ "ایسی کیا مجبوری ہے، کیا جلدی ہے؟ اپنے مفاد کا خیال کرو۔"

"ہے ایسی مجبوری سر، آپ میری مدد کریں۔"

میں نے سارا واقعہ سنایا تو اس نے مسکرا کر مدد کرنے کا وعدہ کیا.........

وہ سارا دن میں بہت خوش رہا۔ طرح طرح کے منصوبے بناتا رہا کہ گیتا ساتھ ہو گی تو کسی شان سے وطن واپس جاؤں گا۔ ایک دنیا گیتا کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے گی اور میری قسمت پر رشک کرے گی......... ابا واحد ہستی تھے، جس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ لیکن یہ بھی توقع تھی کہ آخر وہ مان جائیں گے اور یہ بھی کہ گاؤں کی بجائے شہر منتقل ہو جاؤں گا اور گیتا کے مشورے سے کوئی کاروبار شروع کروں گا۔

یہ وہ دن تھا کہ مجھے بار بار گیتا کی کومل کومل آتما کا خیال آ رہا تھا۔ اس کی مسکان میں ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں کی راحت، اس کی آنکھوں کی نرم نرم روح میں اترنے والی نگاہیں، اس کی باتوں میں پھول کی پنکھڑیوں کو چھونے کا احساس، اس کے رویے میں ایسی لگاوٹ اور گھلاوٹ کہ گھنٹوں پاس بیٹھ کر بھی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی......... گیتا جیسے ساتھی کے تصور سے ہی من سرشار ہو جاتا۔

دوپہر کو جب میں اس کی طرف جا رہا تھا تو بہت خوش تھا......... گیتا کو خوشخبری سناؤں گا کیپٹن ہیری نے میری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا ہے.........

جب میں پھاٹک میں داخل ہوا تو وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ کہنی ٹکائے، کمر میں خم دیئے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک بھونرا ستون سے لپٹی ہوئی گلاب کی ٹہنی کے ایک

پھول پر منڈلا رہا تھا ' جو گیتا کے ہاتھ کے قریب کھل رہا تھا۔ میں اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تو وہ سیدھی ہو کر ہنس پڑی.........

میں نے مسکرا کر کہا......... "تم نے ستون سے کہنی ہٹا کر بے چارے بھونرے کی مشکل آسان کر دی......... تمہاری خوبصورت کہنی نے اس کی جبلت کو امتحان میں ڈال دیا تھا!"

"واہ خوب' آج تو آپ کویتا کہہ رہے ہیں۔" وہ اندر جانے کے لئے مڑی۔

"یہیں ٹھہرو۔" میں نے اسے روکا۔ "کمر میں اسی طرح خم دے دو۔ کہنی اسی طرح ستون پر ٹکا دو۔ میں تمہارا یہ انداز من میں بسا کر سچ مچ کویتا کہہ ڈالوں گا۔"

"اچھا اب آیئے نا!" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گئی.........

"آپ بہت خوش ہیں۔" اس نے کھانا لگاتے ہوئے کہا۔ "بتایئے نا......... کیا بات ہے؟"

"تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔ کیپٹن ہمپری نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے!"

"اوہ.........! نہیں نہیں۔" وہ گھبرا گئی۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی.........

"مگر کیوں؟ یہ تمہاری اپنی خواہش تھی.........؟"

"ہاں تھی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا......... میں تمہیں اغوا نہیں کر رہا۔ سنہا نے مجھے اجازت دے دی ہے۔"

"ہاں دے دی ہے۔ نہ دیتا تو میں آپ کے ساتھ چلی جاتی۔ یقیناً" چلی جاتی۔"

"اس کا مطلب.........؟" میں نے حیرت سے پوچھا.........

"وہ شخص' جس نے سب کچھ تیاگ دیا ہے' میری خوشی کے لیے۔ اسے چھوڑ دوں' کیسے چھوڑ دوں......... اکیلا' تنہا!"



"مگر گیتا........."

"گل جی!" اس نے میری بات کاٹی......... "میرا خیال تھا' آپ مجھے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں ہوں گے ' مگر آپ آمادہ ہو گئے یہ آپ کی جیت ہے۔ میرا خیال تھا' سنہا مجھے جانے کی اجازت نہیں دے گا مگر اس نے اجازت دے دی ' یہ اس کی جیت ہے۔ میرا خیال تھا۔ میں نہ ادھر کی رہوں گی ' نہ ادھر کی رہوں گی' ٹھکرا دی جاؤں گی۔ مگر میں نے آپ دونوں کی محبت پا لی ہے......... یہ میری جیت ہے......... دراصل یہ سچ کی جیت ہے!"

"گیتا.........!" میں تقریباً" لاجواب سا ہو گیا.........

"مانتی ہوں۔ آپ نے میری لاج رکھ لی۔ آپ نے مجھ سے جی بھر کر محبت کی۔ آپ مجھے جیون ساتھی بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ آپ نے میری عزت نفس کو بچا لیا......... آپ نے مجھے وحشیا بنانے سے بچا لیا۔ آپ نے پُن کی اس کرن کو بچا لیا جو زندہ رہنے کی علامت ہوتی ہے ۔ آپ کے اتنے ڈھیر سارے احسان ہیں کہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔"

"تو آپ نہیں جائیں گی......... یہی نا.........؟" میری آواز بھرا گئی.........

"ہاں......... میں نہیں جاؤں گی۔" اس نے بے حد عقیدت سے میرا ہاتھ چوما۔

" میں سنہا کو نہیں چھوڑوں گی۔ میں اس ستم رسیدہ شخص کو نہیں چھوڑ سکتی' جس نے میری خوشی کی خاطر ہر وہ کام کیا جو کوئی دوسرا مرد شاید ہی کر سکتا۔ اس نے میری جھولی سچ سے بھر دی ہے۔ میں اس کے بدلے اپنا جیوان بھینٹ کرتی ہوں!" قصہ ختم ہو چکا تھا۔ جنگ بھی ختم ہو چکی تھی.........!

میں واپس چلا گیا.........

اگلے دن کیپٹن ہمپری نے بتایا......... "بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے ہماری تجویز رد کر دی ہے۔ تم کوئی عورت یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔ یہاں سے سیدھا ریکارڈ آفس جانا پڑے گا۔"

اس خبر سے دکھ کی بجائے ایک حد تک تسلی ہوئی کیونکہ اگر اجازت مل جاتی تو گیتا

کا انکار زیادہ دکھ کا باعث بنتا.........

تیسرے دن سنہا کیمپ آ گیا کیونکہ میں نے جانا ترک کر دیا تھا۔ اس کا رویہ بے حد معذرت خواہانہ تھا......... "آپ نہیں آئے......... گیتا سخت بے چین ہے۔ خود میں بھی بہت نادم ہوں......... میں نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا کہ گیتا کو مجھ پر رحم آ گیا اور اسے قربانی دینے کی سوجھی اور میں نادانستہ آپ دونوں کے راستے کا روڑا بن گیا۔"

"دراصل آپ دونوں کے مقابلے میں میرا کردار بہت کمزور ہے۔ میرا تجربہ بھی بہت کم ہے۔ میں نے ابھی زیادہ دنیا نہیں دیکھی لیکن جو دیکھی ہے' اس میں آپ جیسے خوبصورت لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا اور آنے کی ہمت نہ کر سکا".........

"آپ نے یہ نہ سوچا اگر آپ کا وجود نہ ہوتا تو اس صورتِ حال کا پیدا ہونا کیونکر ممکن تھا۔ یہ آپ ہی تھے' جس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ گیتا آپ کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔ وہ آپ کا ذکر جس پریم سے کرتی ہے' کبھی وہ اسی لہجے میں میرا ذکر کرتی تھی۔ نہ آپ ہماری زندگی میں آتے' نہ میں اس سمبندھ کے لیے تیار ہوتا اور نہ میں گیتا کا من جیت سکتا!"

"آپ کو مبارک ہو۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

"جب تک آپ ہمارے شہر میں ہیں' ہم سے الگ نہیں ہوں گے۔ میں یہی بنتی لے کر آیا تھا۔"

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا.........

"آیئے گا نا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "یہ گیتا کی آشا ہے؟"

"آؤں گا........." میں نے بے ساختہ کہا.........

جب وہ چلا گیا تو میں کافی دیر اکیلا بیٹھا سوچتا رہا......... مجھے وہ دن یاد آیا' جب شفیق مجھے گیتا سے متعارف کرانے لے گیا تھا۔ تب جنسی کشش کے سوا ذہن میں کوئی سودا نہیں تھا۔ پھر ایک اور دور آیا۔ گیتا نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ جنسی لذتوں نے گہرے ناتوں کا



روپ دھار لیا اور اب' جبکہ اس نے ذہنی راستہ اختیار کر لیا اور ترکِ تعلق مقدر بن گیا تو وہ پھر مجھے پکار رہی تھی......... اور میں تھا میرا گداز دل تھا......... کہ سرگم سننے کے لیے بے چین تھا.........!

اگلے دن وہاں پہنچا تو خلافِ توقع گیتا کے ساتھ سنہا بھی برآمدے میں کھڑا تھا۔

"آیئے آیئے۔" میں ہنستے ہوئے آگے بڑھا۔ "آج گیتا نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ آپ کا انتظار کروں۔ آپ نہ آتے تو مجھے کیمپ جانا پڑتا۔"

"مگر میں نے تو آپ سے کہا تھا' آؤں گا۔"

"مجھے یقین تھا' آپ آئیں گے مگر اسے یقین نہیں تھا۔"

"انہوں نے مجھ سے ایسا کوئی سلوک نہیں کیا' جس پر انہیں نادم ہونے کی ضرورت ہو۔"

گیتا نے مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت سنہا نے بھی دیکھی.........

"پگلی.........!" اس نے پیار سے اسے بغل میں لیتے ہوئے کہا......... "میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ تم بیک وقت ہم دونوں کی وفاداری کا دم بھرتی ہو۔ میں تمہارے رویے پر معترض نہیں ہوں۔ فطرت کی راہ کھلی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ تمہیں فیصلہ کرنے میں آزادی ہے۔"

"فیصلہ تو ہو چکا ہے۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "گل صاحب نے اس فیصلے کو سراہا ہے مگر اس کی سزا دینا بھی ضروری سمجھا ہے۔"

"نہیں گیتا جی! سزا تو خود میں نے اپنے آپ کو دی ہے۔ آپ کے بچھڑنے سے جو عذاب نازل ہو گا' آپ سے نہ ملنے کی وجہ گویا اس عذاب کو سہنے کا عادی بنانا تھا۔"

"اچھا بھئی۔" سنہا نے مداخلت کی۔ "تم لوگ گلے شکوے کر کے دل کا غبار نکال لو۔ میں تو ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔"

سنہا چلا گیا تو اس نے سیاہ کٹورہ کٹورہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میں

بیان نہیں کر سکتا کہ ان آنکھوں میں کیسی دلگداز کہانی تھی۔ وہ عورت، جو آوارہ بھی نہ تھی لیکن جسے حالات کی ستم ظریفی نے فرض، جنس اور محبت کے سہ راہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اپنی لاچاری اور بے بسی کا اظہار کس طرح کرتی اور اپنی صفائی کے لیے ایسے الفاظ کہاں سے ڈھونڈتی، جن کا مفہوم اس کی مجبوری کو واضح کر سکتے..........

ان سب پیچیدگیوں کا ایک ہی علاج تھا کہ اسے سینے سے لگایا جائے اور بے تحاشہ پیار کیا جائے.......... میں نے بھی یہی کیا..........

اندر لے جا کر اسے اتنا پیار کیا، اتنا پیار کیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ دنیا و مافیہا کو بھول گئی اور اس کے سارے اندیشے بہہ گئے..........!

ہماری کمپنی سے ریلیز ہونے والا پہلا جتھہ "تقریباً" بیس سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس میں میرا نام بھی تھا۔ اس گروپ کا انچارج بھی میں ہی تھا..........

وہ بھی میری زندگی کا ایک تاریخی دن تھا۔ جب میں ڈبروگڑھ چھوڑ رہا تھا اور گیتا جیسی ہمہ صفت عورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا تھا۔ میری مختصر سی زندگی میں گیتا ایک طرح سے پہلی عورت تھی، جس سے چھ سات ماہ کی طویل ذہنی اور جسمانی رفاقت کے باوجود ایک لمحہ بھی بور نہیں ہوا۔ وہ آخری تین دن اور تین راتیں جو چھٹی لے کر میں نے اس کی بانہوں میں گزارے تھے آج بھی یاد کرتا ہوں تو شدتِ احساس سے کانپ کانپ جاتا ہوں.......... اور پھر وہ دن جب میں اپنے گروپ کے ساتھ ریلوے سٹیشن سے رخصت ہو رہا تھا ڈبے کے دروازے میں کھڑا بظاہر صبر و ضبط کا دامن پکڑے، فوجی ڈسپلن کا بھرم رکھے مگر اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا اور میرے سپاہی کھڑکیوں سے سر نکالے حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی اس عورت کو دیکھ رہے تھے جو شدتِ غم سے بے حال ہو کر شوہر کے سینے سے لگی ہوئی دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھی..........

گاڑی چل پڑی تھی.......... گیتا کو خبر نہ ہوئی۔ سنہا نے ہاتھ اٹھا کر ہلایا۔ جواباً" میں نے بھی میکانکی انداز میں ہاتھ ہلایا مگر میری نگاہیں اس عورت پر جمی ہوئی تھیں، جس نے مسرتوں کے جام انڈیل انڈیل کر میری روح کو سرشار رکھا تھا.......... اور اس سے پرے وہ



سڑک جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ متوازی ڈبروگڑھ شہر کی طرف چلی گئی تھی..........

آج میں مخالف سمت جا رہا تھا۔ یہ سڑک مخالف سمت میں بھی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ متوازی جا رہی تھی..........

میں سوچ رہا تھا..........

ریاضی کا اٹل اصول ہوتا ہے کہ متوازی خطوط کبھی نہیں ملتے..........!

X X

کٹ بیگ اٹھائے ریل اور سٹیمر سے سفر کرتے ہوئے، ری ان فورس منٹ کیمپوں میں رکتے ہوئے تقریباً" پندرہ دن کے بعد ہم کلکتہ پہنچے۔ سپاہیوں کی خواہش تھی کہ کلکتہ کی خوب سیر کی جائے۔ کم از کم ایک ہفتہ رکا جائے مگر کیمپ کی حالت دیکھ کر محسوس ہوا کہ پندرہ دن کے بعد بھی ہمارا نمبر آجائے تو غنیمت ہے۔ بیرکیں بھری ہوئی تھیں' خیموں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ عجب افراتفری کا عالم تھا۔ ہوڑہ ریلوے سٹیشن سے ٹرین نکلتی اور فوجیوں کو مختلف چھاؤنیوں میں پہنچاتی......... مگر فرنٹ لائن اور ایل آف سی ایریا سے اتنی نفری اور پہنچ جاتی۔

ایٹم بم نے جہاں جنگ ختم کردی تھی، لاکھوں آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا' وہاں زندہ لوگوں میں عجیب اضطراب اور سراسیمگی پیدا کردی تھی۔

صبح ناشتہ کر کے اور کیمپ کے دفتر میں ضروری اندراجات کرنے کے بعد چار چار پانچ پانچ سپاہیوں کی ٹولیاں نکل جاتیں۔ یہ لوگ دن بھر پیدل گھومتے......... شام کو رول کال سے پہلے پہنچ جاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ فلمیں دیکھتے کچھ آؤٹ آف بونڈ ایریا (ممنوع علاقہ) میں پہنچ جاتے اور وہاں ملٹری پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے اور گرفتار ہو کر کیمپ پہنچا دیئے جاتے......... مگر اس کے باوجود کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ سپاہی ریڈ لائٹ ایریا میں نہ پہنچتے۔ بعض کامیاب ہو کر لوٹتے تو ساتھیوں کو بڑھ چڑھ کر کہانیاں





سناتے.........

کلکتہ کی وسعت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس سے پہلے میں نے اتنا پھیلا ہوا وسیع وعریض شہر نہیں دیکھا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت شاہراہیں دیکھیں۔ ایک سے ایک نفیس بازار دیکھے۔ خوبصورت اور بلند و بالا عمارتیں دیکھیں۔ حسین سے حسین چہرے دیکھے' مور و ملخ کی طرح خدا کی مخلوق دیکھی۔ بس نہ دیکھا تو گیتا کا مہربان چہرہ.........؟

میرے نزدیک کلکتہ ایک ویران شہر تھا!!

غالباً" سولہویں یا سترھویں دن ہم اس شہر بے پایاں سے رخصت ہو گئے۔ لکھنؤ پہنچے تو یہاں ہزاروں کی تعداد میں ریلیز کے لیے سپاہی پہنچ چکے تھے۔ ریکارڈ آفس کی بیرکوں کے چاروں طرف خیمے لگ گئے تھے۔ دس دس بارہ بارہ سپاہی ایک ایک خیمے میں ٹھسے ہوئے تھے اور سب لوگ زمین پر سوتے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی ہر سپاہی کی پے بک حساب کے لیے جمع ہو جاتی تھی۔ کام کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ ہر گروپ جو وہاں پہنچتا تھا' دس دن کے بعد فارغ کر دیا جاتا۔

مجھے جب بھی فرصت ملتی شہر کی طرف نکل جاتا اور سڑکوں پر بلا مقصد آوارہ گردی کرتا۔ ان دنوں میری ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ فوج سے نکلنے کا افسوس بھی نہیں تھا کیونکہ میں نے اپنا نام خود ریلیز کے لیے پیش کیا تھا اور نہ مجھے گھر پہنچنے کی چنداں جلدی تھی.........

تہذیب و کلچر کے سلسلے میں ان دنوں میں بالکل اناڑی تھا' ورنہ ان جگہوں میں اور ان مقامات تک ضرور پہنچتا جہاں سے تہذیب و آداب کی سند ملتی تھی۔ بعد کے دور میں جب فنون لطیفہ کی تھوڑی بہت شُدبُد ہوئی اور لکھنؤ کے چرچے سنے تو بہت افسوس ہوا کہ نہ کوئی بانکا دیکھ سکا، نہ کسی مشاعرہ میں گیا اور نہ کسی نازنین کے ہاتھ سے پان کھایا......... البتہ لکھنؤ مجھے اس لحاظ سے ہمیشہ یاد رہے گا کہ وہاں ایک بک سٹال سے رئیس احمد جعفری کی لکھی ہوئی کتاب حیاتِ محمد علی جناحؒ خریدی تھی۔ یہی وہ کتاب تھی جس نے مجھے قائداعظم کا گرویدہ بنا دیا تھا اور سیاسی طور پر میرے لیے ایک راہ متعین کر

دی تھی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں نے باقاعدگی سے اخبار پڑھنا شروع کردیا اور ہندوستان کے دوسرے لیڈروں کے متعلق بھی جاننے لگ گیا تھا.........

ریلیز کے وقت میرے حساب میں ساڑھے چار سو روپے نکلے۔ اکٹھے اتنے روپے مجھے زندگی میں پہلی بار ملے تھے ۔ نوٹ جیب میں ڈال کر میری خود اعتمادی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

تقریباً" تین سال بعد جب میں کوہاٹ کے چھوٹے سے سٹیشن پر اترا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں کی تمام بے جان اشیا میں زندگی کی رمق آگئی ہے اور وہ مجھ سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ کوہاٹ سے گاؤں تک چالیس میل کے راستے میں جتنے ندی نالے اور پہاڑ آئے' ایسا لگا کہ ایک ایک پتھر میری طرف دیکھ رہا ہے اور آنکھیں کھول کھول کر اور مسکرا مسکرا کر خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ درخت بھی مسکرا رہے ہیں اور کھیت سبز آنچل کے پرچم کھول کر میرا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

شام ہو رہی تھی۔ میں گاؤں سے ابھی میل ڈیڑھ میل دور تھا کہ ایک کھیت سے بٹیر کے پٹاخنے کی صدا آئی۔ میرا دل یکبار گی اچھل پڑا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مسرت کا ایک جھونکا میری روح کو چھو گیا۔ افروزہ کے گاؤں میں ایک سپاہی کی واپسی ایسی بری بھی نہیں تھی.........

گھر میں سب سے پہلا ٹکراؤ بجو سے ہوا۔ میں تین سال بعد لوٹا تھا وہ ایک لمحے کے لیے چونکا مگر اگلے لمحے دم ہلا کر میری طرف لپکا۔ میں بھی اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اگلے پاؤں میرے کندھوں پر ڈال دیئے اور بے تحاشہ چاٹنے لگا۔

بہن نے دیکھا۔ بھابیوں نے دیکھا۔ بچوں نے دیکھا۔ تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ سب گلے لگ رہے ہیں، چوم رہے ہیں، وار رہے ہیں اور نثار ہو رہے ہیں۔ میں چھوٹوں اور برابر والوں کو گلے لگا رہا ہوں اور بڑوں کے سامنے جھک رہا ہوں۔ ابا آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ضعیف ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی روح میں شیشے کی کرچ گھتی ہوئی محسوس کی۔ میرا بس چلتا تو مسرت کا جھونکا بن کر اس ضعیف شخص کی روح میں تحلیل



ہو جاتا اور اپنی روح کی تمام توانائیاں اس پر نچھاور کر دیتا.........

اتنا ڈھیر سارا پیار پا کر چند دن بے حد سرشار رہا۔ پھر دھیرے دھیرے نشہ اترنے لگا اور زندگی کے معمولات سے اکتاہٹ ہونے لگی......... معلوم ہوا افروزہ کی شادی ہو چکی ہے اور وہ چار دیواری کے اندر بند ہوگئی ہے۔ البتہ بھابی نے بتایا کہ شادی کے بعد ایک بار ملی تھی۔ میرا پوچھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی .........

"اب کے گلو چھٹی آیا' خدا کی قسم گریبان پھاڑ دوں گی۔"

اس فقرے کی گونج چند دن تک دل و دماغ پر چھائی رہی۔ بے حد خواہش رہی کہ سچ مچ کسی دن کسی گلی کی نکڑ پر مل جائے اور گریبان چاک کردے مگر افروزہ تو زندہ درگور ہو چکی تھی۔

زرینہ کے متعلق بھی یہی سنا کہ محمل میں بیٹھ کر کسی اور دیس چلی گئی ہے' ایک مردہ بچی کو جنم دے کر ہمیشہ کے لیے بانجھ ہوگئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا صدیاں تو نہیں گزریں' صرف تین سال کے عرصے میں ہنستی کھیلتی چوکڑیاں بھرتی دو ہرنیاں آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ کیا زندگی کو ایسا سلوک زیب دیتا ہے.........؟

ایک رام پیاری تھی جو میری روح کو تھپکی دے سکتی تھی مگر وہ دل کہاں سے لاتا کہ سامنا کرنے کا یارا ہوتا......... میں تو اس نڈر باپ کی نڈر بیٹی کو دغا دے چکا تھا......... میں ناگاہل اور برما کے جنگلات سے تو ہو آیا تھا مگر کوہ سفید کے دامن تک نہ جاسکا جو بہت قریب تھا......... جس کی برفانی کلغیاں میرے گاؤں سے نظر آتی تھیں.........

میں گیتا کو ساتھ لانے پر تیار ہوگیا تھا جو رام پیاری کی طرح غیر مسلم تھی مگر رام پیاری کی طرح کنواری نہیں تھی۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کو تیار تھا مگر اس سے ذرا کم ذمہ داری اٹھانے سے کترا رہا تھا۔ غالباً" یہ وہی نفسیاتی گرہ تھی جسے میں کھولنے سے قاصر تھا......... میں محبت کرنے والے ضعیف باپ کو دکھ پہنچانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا.........

یہی وجہ تھی کہ میں نے مسجد والی گلی کا پھیرا چھوڑ دیا تھا اور ہر پل خود اذیتی کے عذاب میں کاٹ رہا تھا۔ گاؤں کی دو تین لڑکیوں نے متوجہ کیا۔ دو چار روز ان کے متعلق سوچتا بھی رہا مگر ان میں کوئی بھی ایسی نہ تھی جو مجھے چند لمحوں کے لیے مضطرب کر دیتی اور بے کلی کے سودے سے نواز دیتی۔ ان میں سے ایک ایسی بھی تھی جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلتی رہی اور اب اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں بہاریں کھل اٹھی تھیں۔ جب بھی کسی گلی کی نکڑ پر ملتی' بے ساختہ ہنس پڑتی اور بچپن کی گیلی ریت کے گھروندے ڈھانے کی باتیں یاد دلاتی......... میں اس سے کہتا.........

"سب کی شادیاں ہوگئی ہیں تیرا گھر ابھی تک نہیں بسا؟"

وہ بے باکی سے کہتی۔ "میرے رخساروں میں ہنستے وقت گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ تم نے ان کا کچھ نام بھی بتایا تھا نا.........؟"

"ہاں چاہ غب غب!" میں مسکرا کر کہتا.........

"ہاں یہی" وہ جواب دیتی "بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں جس لڑکی کے رخساروں میں گڑھے پڑتے ہوں اسے محبت ملتی ہے' گھر نہیں ملتا۔"

میں چاہ غب غب کے ساتھ اس شگون کی وابستگی سے خوف زدہ نہیں تھا مگر خوبصورت آنکھوں' خوبصورت ہنسی اور اس کی خوبصورت باتوں کے باوجود اسے روح میں جذب نہ کر سکا۔ اس لئے بات آگے نہ بڑھی.........

انہی دنوں مجھے کوہاٹ کے دفتر روزگار سے ایک خط ملا۔ مجھے پٹوار سکول میں داخلہ کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ ہمارے معاشرے میں پٹواری کی بڑی اہمیت تھی لیکن میں جو سیلانی نیچر کا آدمی تھا جمع بندی' خسرے اور کھاتے کی خشک کتابوں کا بوجھ اٹھانے کا روا دار نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے انکار کردیا......... دو بارہ پولیس میں ملازمت کی پیش کش ہوئی مگر یہ تجربہ تو میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ لہٰذا اسے دہرانے میں کوئی چارم نہیں تھا لیکن اس سب کے باوجود میرے ذہن میں آئندہ زندگی کا کوئی پروگرام نہیں تھا' نہ میں کوئی خاص منصوبے بنانے والا شعور رکھتا تھا اور نہ منظم زندگی گزارنے کی سوجھ بوجھ تھی اور نہ کامیاب



زندگی گزارنے کے اصولوں سے واقف تھا۔

کوئی اور دلچسپی بھی نہیں تھی کہ دل بہلا رہے۔ اس لئے میں نے سیاست کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا۔ اپنے قصبے میں میں پہلا آدمی تھا جس نے لاہور سے زمیندار اخبار جاری کروایا۔ اب لوگ مجھ سے تازہ خبروں کے بارے میں پوچھتے۔ سیاست پر گفتگو کرتے اور میری رائے کو بہت اہمیت دیتے۔ یہ وہ دور تھا کہ ہر طرف مسلم لیگ کا چرچا تھا اور پاکستان بننے کی باتیں ہو رہی تھیں اور قائداعظمؒ کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کا نہایت ذوق و شوق سے ذکر کیا جاتا تھا۔

دیہاتوں میں خان عبدالغفار خان کا بھی خاصا اثر تھا۔ ان کے بھائی ڈاکٹر خان کو لوگ ان کی سادگی کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ ہمارے علاقے میں بھی خاصے لوگ کانگرس کے حامی تھے مگر اکثریت مسلم لیگ کی ہمنوا بنتی جا رہی تھی۔ شہروں میں جہاں خان عبدالقیوم خان اور سردار عبدالرب نشتر مسلم لیگ کی تقویت کا باعث بنے' وہاں دیہات میں پیر مانکی شریف نے کانگرس کا جادو توڑا۔ پیر صاحب نے گلی گلی گاؤں گاؤں جلسے منعقد کیے۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے مذہبی تقدیس کی وجہ سے جو ان کی گدی کو حاصل تھی' لوگوں کے دل موہ لیے تھے بلکہ وہ بلا کے مقرر تھے انہوں نے اقتصادی' معاشرتی اور سیاسی دلیلوں سے لوگوں کو قائل کیا کہ پاکستان کا وجود کس قدر ضروری ہے.........

میں اگرچہ طبعاً سیاسی آدمی نہیں تھا مگر ان دنوں سیاست کی کچھ ایسی ہوا چلی تھی کہ غیر جانبدار رہنا تقریباً" ناممکن ہو گیا تھا۔ ہمارے خاندان اور برادری کے آدمی شریف اور سیدھے سادے لوگ تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بڑوں سے مشورہ کیے بغیر جب میں نے مسلم لیگ کے لیے کام شروع کیا تو وہ سب میری حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اپنے علاقے کا مسلم لیگ کا سیکرٹری چن لیا گیا تھا۔ میں نے نوجوان ورکروں کی ایک ٹیم تیار کر لی تھی۔ ہم لوگ سبز کپڑے پہنتے تھے اور ہر وقت لڑنے بھڑنے کو تیار رہتے تھے۔ ہفتے میں ایک آدھ جلسہ کرتے' جلوس نکالتے اور پاکستان زندہ باد/ قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے.........

ابا بہت کمزور ہو چکے تھے اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کے پاؤں سوج گئے ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔معلوم ہوا جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں سخت تشویش ہوئی۔ علاج جاری رہا۔ اب دن رات تیمار داری میں گزرتے تھے۔ ابا کی حالت سنبھلنے لگی۔ اب وہ تکئے کے سہارے بیٹھ جاتے تھے لیکن پاؤں کی سوجن نہ اتری۔ مجھے وہ دن یاد ہے' جب ہمارے ایک عزیز ان کے قریب بیٹھے تھے۔ میں ذرا فاصلے پر تھا ابا کہنے لگے.........

"موت بَرحق ہے۔ موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے صرف ایک غم ہے، چھوٹے بیٹے کا۔ اس کا کیا بنے گا.........؟

عزیز نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میں اٹھ کر ابا کے پاس جا بیٹھا۔ ابا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور رو پڑے۔ میں بھی بلک بلک کر رونے لگ گیا۔ میری بہن نے مجھے سنبھالا۔ ابا نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گئے۔ ہم تقریباً" آٹھ دس آدمی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آدھ گھنٹہ بعد دوائی کا وقت ہو گیا۔ جگانے کی کوشش کی گئی مگر وہ تو سو چکے تھے ابدی نیند سو چکے تھے۔

ہر طرف کہرام مچ گیا۔ میرا خیال ہے ابا کی موت پر مجھ سے زیادہ کوئی دکھی نہیں ہوا ہوگا یا مجھ سے زیادہ کسی نے آنسو نہ بہائے ہوں گے۔ اپنے پرائے سب رو رہے تھے۔ قصبے کے اس شریف النفس شخص کی موت پر جس کی دیانت کی قسم ہر کوئی کھانے کو تیار تھا لیکن زندگی کی ڈھٹائی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وقت کا مرہم گہرے سے گہرے زخم مندمل کر دیتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ دکھ جو کسی وقت سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وقت کے ریلے میں یوں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا.........

وہ روپیہ جو میں ریلیز کے وقت لایا تھا تقریباً" ختم ہو چکا تھا اور اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں ایک بیوی کا شوہر اور ایک بچے کا باپ ہوں اور ان کی روٹی کپڑے کی ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ چنانچہ بڑے بھائی اور چچا سے مشورے کے بعد زمین کا ایک حصہ بیچ دیا۔ میں نے اپنے حصے کے آٹھ سو روپے لے کر جنرل مرچنٹ کی دکان کھول لی۔ مجھے



تسلیم ہے کہ طبعاً" دکاندار بھی نہیں تھا۔ اس لئے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ البتہ گھر کی روٹی چلتی رہی اگر ان دنوں سیاسی دلچسپیاں نہ ہوتیں تو میں یقیناً" گھر سے بھاگ نکلتا کیونکہ بیوی کو دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میں نے اس بدقسمت عورت کو کبھی بھی پیار کی نظر سے نہ دیکھا۔ اس سے ہمدردی کے باوجود مجھے اس کی ہر حرکت کھلتی تھی۔ اس کی ہر بات سے چڑتا تھا۔ وہ کوئی قصور نہ کرتی تب بھی قصور وار تھی۔ اس کے ساتھ ہم بستری بھی ایک ناگزیر فرض کے سوا کچھ نہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یہ فرض اور غرض کی ایک ملی جلی شکل تھی۔ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ اس عورت سے شادی تھی!

اور غالباً" یہ اس کی زندگی کا بھی سب سے بڑا المیہ تھا کہ اس کی شادی مجھ سے ہوئی تھی اور یہ المیہ مجھے اس شخص کی بدولت ملا تھا جسے میں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا اور جن کے پیار اور محبت پر میں کبھی شبہ نہیں کر سکتا تھا اور جن کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ میرا دامن سدا پھولوں سے بھرا رہے.........

انہیں مرتے وقت بھی ایک ہی احساس تھا کہ ان کا لاڈلا بیٹا دنیا میں کیا کرے گا۔ ادھر میری فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ انہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے فیصلے اور انتخاب نے ان کے لاڈلے کی زندگی اجیرن کر دی ہے اور وہ باقی ماندہ زندگی جیتے جی دوزخ میں گزارے گا.........

وقت گزرتا گیا۔ جلسوں اور جلوسوں میں شدت آنے لگی حتیٰ کہ مسلم لیگ نے سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ پنجاب کی طرح سرحد میں بھی یہ تحریک بے حد منظم تھی اور حکومت کا پہیہ بالکل جام کر دیا گیا تھا۔ ہم نوجوان لوگ اخباروں میں خبریں پڑھتے تھے کہ آج اتنے لوگوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ انہیں ٹرکوں میں بٹھا کر شہر سے چالیس میل دور چھوڑ دیا گیا۔ رات گئے یہ لوگ پیدل اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے.........

ہمارے قصبے کے نوجوانوں میں بڑا بہت جوش اور جذبہ تھا۔ وہ بھی عملی طور پر سول نافرمانی میں حصہ لے کر سرخرو ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں پندرہ نوجوانوں کا جتھ لے کر کوہاٹ پہنچ گیا لیکن پیر معصوم شاہ نے ہمیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی

اس کی ضرورت نہیں پڑی کہ ہم دیہاتوں سے آدمی منگوائیں۔ کیونکہ کوہاٹ کے لوگ نہایت جوش و خروش اور منظم طریقے سے تحریک کو چلا رہے تھے۔ عدالتوں میں اور سرکاری دفتروں میں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا دراصل مجسٹریٹوں اور اہل کاروں کی اکثریت پاکستان کی حامی تھی، اس لئے سول نافرمانی کی تحریک کو خود بخود تقویت پہنچ رہی تھی۔ پولیس والے چشم پوشی سے کام لیتے اور سول لاء توڑنے والوں سے وہ سلوک روا نہ رکھتے' جس کے لیے عام طور پر پولیس بدنام ہے۔ اور پھر ایک دن اچانک اعلان ہو گیا.........

ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ پاکستان بن گیا تھا......... ہمارے قصبے کے ہندوؤں کو پولیس کی حفاظت میں بنوں کے کیمپ پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے بحفاظت ٹرینوں کے ذریعے ہندوستان بھیج دیئے گئے۔ سرحد میں ڈاکٹر خان کی وزارت توڑ دی گئی۔ خان عبدالقیوم خان برسراقتدار آ گئے۔ مسلم لیگ نے کپڑے' مٹی کے تیل اور آٹے کے ڈپو اپنے کارکنوں میں تقسیم کیے۔ ہمارے علاقے کے تمام ڈپو میرے سپرد کر دیئے گئے۔

عام لوگوں کا خیال تھا کہ میں سال کے اندر اندر لاکھوں کا آدمی بن جاؤں گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میں چینی' تیل اور دوسری اشیا کوہاٹ سے لاتا اور راشن کارڈوں کے مطابق لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ بعض لوگوں کے پاس خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوتے' ان کا راشن بچ جاتا۔ میں بچے ہوئے راشن کا گوشوارہ تیار کرتا اور محکمہ کو بھیج دیتا۔ محکمے کے افسر میرے اس طرز عمل پر ہنستے اور مخصوص محفلوں میں میری حماقتوں کا ذکر کرتے۔ دراصل میرے اس طرز عمل سے خود ان کو بھی نقصان ہورہا تھا کیونکہ وہ زائد آمدنی سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ مجھ سے ڈپو چھین لیتے لیکن بظاہر میری مخالفت بھی نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ میں مسلم لیگ کا کئی ضلع کمیٹیوں کا ممبر تھا اور میرا سیاسی رسوخ برابر بڑھ رہا تھا۔

ایک بار تھانے کا سپاہی آیا کہنے لگا۔ "تھانے دار صاحب نے پانچ سیر چینی مانگی ہے۔" میں نے چینی دے دی اور قیمت کا مطالبہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا "پیسے تو میں نہیں لایا!"



میں نے چینی رکھ لی اور اس سے کہا "پیسے لاؤ اور چینی لے جاؤ۔"

ایک بیوہ کی بچی بیمار تھی۔ اسے ساری رات جاگنا پڑتا تھا۔ وہ ہر تیسرے دن مٹی کے تیل کے لیے آتی۔ میں بوتل بھر کر دے دیتا۔ ایک کپتان صاحب نئے نئے پنشن پر آئے تھے۔ انہوں نے یہ صورت حال دیکھی تو دوسرے دن بوتل لے آئے۔ میں نے راشن کارڈ مانگا تو وہ جامے سے باہر ہوگئے۔ اسے واقعی تیل کی ضرورت ہوتی تو میں انکار نہ کرتا لیکن جب اس نے کپتانی کا رعب جتایا اور بیوہ کا طعنہ دیا تو میں بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ گریبان سے پکڑ کر دھکے دیتے ہوئے باہر نکال دیا۔ لوگ جمع ہوگئے۔ وہ بڑبڑاتا دھمکیاں دیتا چلا گیا......... کپتان صاحب تھانے گئے' شنوائی نہ ہوئی۔ کوہاٹ ڈپٹی کمشنر کے پاس پہنچے......... رسید نہ ملی۔ پشاور گورنر ہاؤس گئے' رسائی نہ ہوئی۔ ناکام ہو کر لوٹے تو سیدھے میرے پاس آ گئے اور معذرت کرلی کہ غلطی خود ان کی ہے.........

انہی دنوں قائداعظم پشاور آ رہے تھے۔ مجھے قائداعظم کو دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ میرے ایک رشتہ دار مشتاق احمد جو بعد میں کوہاٹ کے ممتاز وکیل بنے' ان دنوں اسلامیہ ہائی سکول میں ٹیچر تھے۔ ہم دونوں نے پشاور جانے کا پروگرام بنا لیا۔

گورنر جنرل کی حیثیت سے یہ ان کا پہلا دورہ تھا۔ سرحد کے لوگ چشم براہ تھے۔ میں بیان نہیں کرسکتا جب ان کا جہاز فضاؤں میں نمودار ہوا تو عوام کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ کیسا جوش و خروش تھا۔ کیا بے چینی تھی اور کیا خوشی تھی۔ انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ لوگوں کا اژدھام لہروں کی طرح ادھر ادھر جا رہا تھا۔ لاکھوں دل شدت احساس سے بے تاب ہو رہے تھے۔ جہاز لینڈ ہوگیا۔ فلک شگاف نعروں میں قائداعظم جہاز سے اترے۔

مگر ہم انہیں دیکھ نہ سکے.........

جب ان کی کار ایئرپورٹ سے نکلی تو آدمیوں کا سیلاب ان کے ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا۔ بس ایک جھلک دیکھنے کی حسرت تھی ہم اس مرحلے پر بھی پیچھے رہ گئے۔

اگلے دن انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور میں ایک خاص نشست سے خطاب کرنا

تھا۔ خاصی کوشش کے بعد ہمیں دو پاس مل گئے۔ خوش قسمتی سے دوسری یا تیسری لائن میں تمام نشستیں پر تھیں۔ لوگ ایک ایک گھنٹہ پہلے آکر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے ذوق شوق کا یہ عالم تھا کہ ہر آدمی اپنی پچھلی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ شامیانے جہاں لگے تھے اس کی پچھلی طرف سے قائداعظم کی آمد متوقع تھی۔ تقریباً" چار بج رہے تھے۔ سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا.........

"خواتین و حضرات! قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح کی کار اسلامیہ کالج کی حدود میں داخل ہوچکی ہے۔ وہ چند لمحوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آپ جانتے ہیں قائداعظم ڈسپلن بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ لوگ اپنی اپنی نشست پر کھڑے ہو کر تالی بجا کر انہیں خوش آمدید کہہ سکتے ہیں لیکن آپ سے درخواست ہے کہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں.........

"لیجئے کار کھڑی ہوگئی ہے۔ قائداعظم کار سے باہر نکل آئے ہیں......... محترمہ فاطمہ جناح بھی باہر آگئی ہیں........."

اچانک زور کا نعرہ لگا......... "قائداعظم محمد علی جناح۔"

پورے مجمع نے "زندہ باد" کا نعرہ لگایا پاکستان "زندہ باد" کا نعرہ لگا۔ دبلے پتلے لمبے اور گورے قائداعظم نے شیروانی شلوار اور جناح کیپ پہن رکھی تھی۔ بہن بھائیوں کے رنگ ایک سے' خدوخال ایک سے' بالکل ملتی جلتی شکلیں' جیسے دو فرشتے انسانوں میں آگئے ہوں.........

مجمع کے جوش و جذبہ کا یہ عالم تھا کہ ہر آدمی خوشی اور مسرت سے تمتما رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی نہایت وقار اور متانت سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے......... سپاسنامہ پڑھا گیا۔ قائداعظم سے درخواست کی گئی کہ مجمع سے خطاب کریں۔ قائداعظم اٹھے۔ سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر چوکس ہوگئے۔ قائداعظم بار بار شہادت کی انگلی اٹھا کر اس طرح ہلاتے گویا احکام صادر کر رہے ہوں۔ نظر کا گول سا شیشہ جو باریک طلائی زنجیر کے ذریعے شیروانی کے کاج سے بندھا ہوا تھا' داہنی آنکھ پر لگاتے۔ تقریر کے دوران بار بار شیشہ گرتا'



قائداعظم بار بار اٹھا کر آنکھ پر جماتے۔ مجھے تقریر کا وہ حصہ اب تک یاد ہے.........

جب قائداعظم نے کہا تھا.........

"میری خواہش ہے کہ یہ خطۂ زمین علم کی وہ روشنی پیدا کرے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورا ایشیا اس سے منور ہو جائے۔"

اور اس پر زوردار تالیاں بجی تھیں۔ کئی دن تک اس جلسے کی کیفیت ہم پر طاری رہی اور ہم دوستوں کو اس جلسے کی روئداد سنا سنا کر مرعوب کرتے رہے۔ قصبے میں جو پہلا ریڈیو آیا وہ بھی میری وساطت سے۔حکومت سرحد نے بڑے بڑے قصبوں میں عوام کے لیے ریڈیو مہیا کیے تھے۔ ہر چوتھے پانچویں دن چارج ہونے کے لیے بیٹری کوہاٹ جاتی تھی......... ریڈیو میری دکان میں لگا تھا۔ خبریں سننے کے لیے عام طور سے جمگھٹا ہو جاتا۔

پھر اسی ریڈیو سے ایک دن ہم نے یہ روح فرسا خبر سنی کہ قائداعظم رحلت کر گئے ہیں!

میں اس دن دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ ابا کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا سانحہ تھا' جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

اب میرا دل قصبے میں نہیں لگ رہا تھا۔ سیاست کی گہما گہمی میں بھی اب وہ پہلی سی بات نہ رہی تھی۔ مالی حالات بھی تسلی بخش نہیں تھے' اگرچہ تمام ڈپو میرے پاس تھے......... مگر میں ذہنی طور پر ڈپو ہولڈر نہیں تھا۔ میں سیدھا سا معصوم آدمی تھا......... نہ بلیک مارکیٹنگ کے گر سیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا تھا اور نہ میری فطرت جرم کی طرف مائل تھی.........

ہندوؤں کی دکانیں تھیں۔ مکان تھے۔ لاکھوں کی جائداد تھی اور پھر میرا اثر و رسوخ بھی تھا۔ جو چیز چاہتا' آسانی سے حاصل کرسکتا تھا......... میں اس چھوٹی سی جگہ میں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ میں اس پوزیشن میں تھا' چاہتا تو اچھے سے اچھے مکان پر قبضہ کر سکتا تھا اور اپنے نام الاٹ کروا سکتا تھا مگر شارٹ کٹ راستوں کا ذہن ہی نہیں رکھتا تھا۔ نہ مجھے ایسی باتیں سوجھتی تھیں اور نہ میں لاٹری کے انداز میں دولت پاکر خوشی حاصل کرسکتا تھا۔ روپیہ کی ضرورت کا میں اس حد تک قائل تھا کہ زندگی چل سکے لیکن روپیہ نمائش بن

جائے، میرے لیے اس میں کوئی تسکین نہیں تھی۔

اگرچہ میں بہت زود رنج تھا۔ بہت جلد بھڑک اٹھتا تھا اور فوری غصہ کے تحت دست و گریبان ہونے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا مگر غصہ اتر جانے کے بعد میرا دل صاف ہو جاتا اور کینہ دل میں نہ رہتا اور نہ بات دل میں رکھ کر انتقام کے لیے سوچتا۔

بس رسائل تھے اور کتابیں کہ لالٹین کی روشنی میں رات گئے پڑھتا رہتا۔ میری بیوی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہتی۔ کبھی کبھار ایک ہلکی سی ہوک کی آواز آتی جو میرے دل و جگر کے آر پار ہو جاتی۔ اس ہوک سے ہمدردی کی بجائے نفرت کی آگ اور بھڑک اٹھتی اور میں اس عورت سے اور درو چلا جاتا..........

بہت ہی صحیح قدم ہوتا اگر میں ان دنوں اس عورت کو طلاق دے دیتا۔ ہم دونوں نہ ختم ہونے والے عذاب سے چھٹکارا پالیتے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ مجھ میں جرأت کی کمی نہیں تھی اور اب تو ابا بھی زندہ نہیں تھے مگر کچھ سماجی بندھن ایسے تھے کہ میں اس قابوس سے آزاد نہ ہوسکا۔ پھر بھی میری خواہش رہی کہ یہ بندھن جو میری روح میں پنجے گاڑے ہوئے ہے کم از کم جسمانی طور پر ہی اس سے دور چلا جاؤں۔

چنانچہ میں نے دکان بیچ دی۔ سارے ڈپو چھوڑ دیئے اور ایک دوست کی وساطت سے اپنے سابقہ عہدے پر منسٹری آف ڈیفنس میں چلا گیا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دوسری بار فوج میں گیا تو سنٹر ملتان ہی ملا۔ یہاں چار چھ ماہ ٹریننگ ہوئی۔ اس کے بعد ایک پٹھان پلاٹون کے ساتھ نو شہرہ میڈیکل ڈپو میں تعیناتی ہوئی۔ اس ڈپو کا انچارج ایک پٹھان کرنل تھا جو بعد میں میجر جنرل بنا۔ نہایت ستھرا اور شریف آدمی تھا۔ یہ بہت بڑا میڈیکل ڈپو تھا۔ یہاں سے آرمی کے تمام ہسپتالوں کو دوائیاں مہیا کی جاتی تھیں..........

تین چار ماہ خیریت سے گزر گئے لیکن ایک دن اچانک میرے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے مکمل طور پر میری زندگی کا رخ موڑ دیا اور مجھے نئی ڈگر پر ڈال دیا۔ میڈیکل ڈپو سے ہماری بیرکوں کا فاصلہ تقریباً ایک میل تھا۔ بیچ میں آرمی کے افسروں کی کوٹھیاں تھیں۔ میں صبح، دوپہر اور شام سرکاری سائیکل پر یہاں سے گزرتا تھا۔ ایک دن شدید بارش



ہو رہی تھی۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ جونہی میں پہلی کوٹھی کے قریب پہنچا ایک نیلا لفافہ اڑتا ہوا سائیکل کے سامنے آن گرا۔ میں نے بریک لگائی۔ لفافہ اٹھایا۔ کوٹھی کی طرف دیکھا۔ برآمدے میں چک کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ شکل و صورت نظر نہیں آ رہی تھی، البتہ برآمدے کے فرش اور چک کے نچلے کنارے کے درمیان جو چھ سات انچ جگہ خالی تھی۔ کنول کی طرح دو سفید سفید پاؤں نظر آگئے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا..........

میں اب بالکل بھیگ چکا تھا۔ آگے جانے کی بجائے پیچھے مڑ گیا۔ کوٹھی سے پچیس تیس قدم کے فاصلے پر کنٹین تھی۔ کنٹین کے برآمدے میں پہنچ کر خط کھولا لکھا تھا..........

اجنبی..........!

معاف کرنا جو کچھ کر رہی ہوں.......... شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ کوئی شریف لڑکی بھلا اس طرح کب کرتی ہے کہ کسی اجنبی کا راستہ روک لے اور واضح بے شرمی سے کہہ دے کہ آپ سے محبت کرتی ہوں! آپ نے مجھے نہیں دیکھا مگر میں تین ماہ سے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ ہر چند کوشش کی کہ آپ کا راستہ نہ روکوں مگر اب بات میرے بس میں نہیں رہی۔ یقین جانئے، میں نے پہلی بار دل ہارا ہے۔ آپ مجھے قابلِ اعتبار لڑکی پائیں گے۔ میری سچائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ جس کو مخاطب کر رہی ہوں۔ نہیں جانتی، کون ہے، کیا ہے..........؟

کیا میری ڈھٹائی کو معاف کردیں گے کیا اپنا تعارف کرائیں گے کیا یقین کریں گے کہ میں اپنی زندگی آپ پر نچھاور کرسکتی ہوں؟

آپ کی..........

خط پڑھ کر میری وہی کیفیت ہوئی جو رام پیاری کا خط پڑھ کر ہوئی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میرا سارا جسم کانپ رہا تھا مگر میں ایک لرزتی چنگھاڑتی ہوئی خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔ بارش اور تیز ہوگئی تھی۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس کے

پاؤں نظر آ رہے تھے۔ میری نظریں اس جگہ پر جمی ہوئی تھیں جہاں دو چکوں کے کنارے مل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد یہ دونوں کنارے دھیرے دھیرے الگ ہوگئے۔ ایک گول سا سفید خوبصورت چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے سفید شلوار پر سبز کوٹ پہنا ہوا تھا.........

مجھ سے کچھ نہ بن پڑا......... نہ سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ نہ اپنی جگہ سے ہل سکا اگرچہ اسی کو میں دیکھ رہا تھا مگر اندر سے خوف زدہ تھا۔ خدا جانے یہ اس وسیع کوٹھی کا خوف تھا یا محبت کی غیر متوقع الہام کا کہ میں تھر تھر کانپ رہا تھا اور لحہ لحہ مدہوشی کی کیفیت بڑھ رہی تھی۔ بارش نہ رکی میں بھی وہیں کھڑا رہا' حتیٰ کہ شام ہوگئی۔ برآمدے کی بتی جل گئی اور وہ کنول جیسے پاؤں غائب ہوگئے۔

بیرک پہنچا تو میری عجیب حالت تھی۔ جو کچھ پیش آیا، اس کا یقین نہیں آرہا تھا۔ تکیے سے ٹیک لگائے' چوری چوری خط پڑھ رہا تھا۔ جانے کتنی بار پڑھ چکا تھا۔ لانگری نے ایک دوبار کھانے کے لیے پوچھا۔ میں نے انکار کیا بھوک کوسوں دور جا چکی تھی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ یہ لڑکی جو دور سے گوری اور خوبصورت نظر آرہی تھی' قریب سے کیسی لگتی ہوگی۔ اس کے خدوخال کیسے ہوں گے؟ اگر اس کا ناک نقشہ مجھے پسند نہ آیا تو میرا رویہ کیا ہوگا ؟

آرٹلری کے کرنل بدیع الزمان کو میں نے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کوٹھی کے پھاٹک پر اس نام کی تختی پڑھی تھی۔ میں منسٹری آف ڈیفنس کا ایک مختصر سا حوالدار اور دوسری طرف ریگولر آرمی کا ایک باوقار کرنل۔ یہ طبقاتی خلیج کیوں کر پاٹی جاسکتی تھی ؟

رات کے گیارہ بج گئے تو تمام شکوک و شبہات کے دفتر بند کر کے میں نے اسے خط لکھا لیکن اس خط میں محبت کا اقرار نہیں تھا' انکار بھی نہیں تھا۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ اسے قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں.........

صبح سپاہیوں کو ڈیوٹی پر بھیج کر' میڈیکل ڈپو کی طرف جاتے ہوئے' کوٹھی کے قریب پہنچا تو سائیکل آہستہ کر کے ٹلی بجائی وہ فوراً" برآمدے میں آگئی اور کل والی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس کے پاؤں دیکھ لیے۔ سائیکل سے اتر کر اس کی چین درست کرنے لگا



جو بالکل صحیح تھی۔ چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ لیا تھا کہ کوئی آدمی میرا جائزہ نہیں لے رہا۔ کوٹھی کا کچن جو سڑک کی طرف واقع تھا۔ اس کے ساتھ شیشم کا درخت تھا۔ خط نکال کر شیشم کے تنے کے ساتھ ایک اینٹ کے نیچے رکھ دیا۔ برآمدے کی طرف دیکھا تو چک کے پیچھے سے ایک مرمریں ہاتھ باہر نکلا جو تحریر کی مانند سمجھا گیا کہ خط کی وصولی ہوگئی ہے!

کوٹھی اور میڈیکل ڈپو میں دو فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر وہیں رک گیا۔ بظاہر گارڈ والوں سے باتوں میں مصروف تھا مگر طائرانہ نظر سے خط اور کوٹھی کا جائزہ لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سفید شلوار اور سبز کوٹ میں ملبوس لڑکی چک کے پیچھے سے نکل آئی اور بے نیازی سے ٹہلتی ہوئی' شیشم کے درخت کی طرف چلی گئی۔ اسی بے نیازی سے خط اٹھایا' جیب میں ڈالا اور چک کے پیچھے غائب ہوگئی۔

میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا مگر کیفیت وہی رہی۔ دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا اور ابھر ابھر کر ڈوب رہا تھا۔ گارڈ والوں سے باتیں ہو رہی تھیں لیکن کوئی خبر نہ تھی' کون کیا کہہ رہا ہے.........

چار بجے چھٹی ہوئی۔ میں دفتر سے نکل کر پھاٹک کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ ڈپو کا لیبر' کلرک اور افسر ایک ایک کر کے نکل رہے تھے۔ میں حسب معمول ڈیوٹی دے رہا تھا اور کوٹھی کا جائزہ بھی لے رہا تھا......... لڑکی کوٹھی سے نکلی اور شیشم کے تنے کے ساتھ اینٹ کے نیچے خط رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں ڈیوٹی بھول گیا۔ سائیکل پر بیٹھا اور اگلے لمحے اینٹ کے نیچے سے خط لے کر بیرک پہنچ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے خط کھولا لکھا تھا.........

پیارے اجنبی !

بے حد شوق سے، بے حد شوق سے' مجھے دیکھ لیں۔ میں آج شام ہی آپ کو یہ موقع فراہم کر دوں گی۔ خانساماں کو کسی بہانے چلتا کردوں گی۔ میں کچن میں رہوں گی۔ سڑک کی طرف کھلنے

والی کھڑکی کھلی ہوگی۔ جی بھر کر مجھے دیکھ لیں اور پھر فیصلہ کر لیں کہ
میں آپ کے لائق ہوں یا نہیں؟ اگر فیصلہ میرے حق میں ہوا تو صبح
خط کا انتظار کروں گی!

خط طے کر کے جیب میں ڈالا۔ دروازہ کھولا۔ تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور من کو گدگدا گیا۔ لانگری چائے لایا۔ آج لنگر کی بے ہودہ چائے بھی اچھی لگی.........

اب شام ہونے کا انتظار تھا۔ یہ عجیب تھا، بہت ہی عجیب تھا۔ ایک کرنل کی لڑکی ایک تیسرے درجے کے عہدے دار کے لیے تڑپ رہی تھی.........

رام پیاری، زرینہ، افروزہ اور تن تارارا کے متعلق تو میں کہہ سکتا تھا کہ میرے طبقے کی لڑکیاں تھیں مگر مس سارا، گیتا اور اب یہ لڑکی میری کلاس کی نہیں تھیں تو پھر یہی ہوا نا۔ میں نے سوچا کہ جنس اور محبت کی باری آتی ہے تو تمام کلاسیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سارے طبقے ایک ہو جاتے ہیں یعنی انسان کی سچی پہچان جنس اور محبت سے ہوتی ہے!

شام ہوگئی اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا۔ میں سائیکل لے کر پہنچ گیا۔ کچن کی کھڑکی کھلی تھی۔ جالی میں سے چھن چھن کر روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں دبے قدم قریب جاکر ایسے زاویے میں کھڑا ہوگیا کہ اندر کی روشنی سے محفوظ ہوگیا مگر اگلے لمحے روشنی اور اندھیرے کا احساس خلط ملط ہوگیا تھا۔ میں نے سفید قمیض، سفید شلوار اور سفید دوپٹے میں ایسا معصوم چہرہ دیکھا جو خط کے مضمون سے بالکل مختلف تھا۔ یقین نہ آیا......... کہ یہ حورِ جناں ایسا مضمون باندھ سکتی ہے جو صرف زمین والوں کا مقدر ہو.........!

میں دیوانہ وار اس ملیح و صبیح چہرے کو دیکھ رہا تھا، جس پر ایک چھوٹا سا مناسب ناک اور چھوٹے سے کھلے ہوئے گلاب کا سا دہانہ سج رہا تھا.........تو کیا تقدیر مجھے اس لئے دوبارہ فوج میں لے آئی تھی کہ زندگی اتنی آسانی سے تکمیل نہیں ہوتی۔ گویا پچھلی چھ محبتیں ناکافی تھیں.........

کرنل کے سوا میں نے سارا کنبہ دیکھ لیا تھا۔ اس کی ماں، اس کی دو چھوٹی بہنیں اور اس کا بھائی ایک ایک کر کے آئے اور بہن سے باتیں کر کے چلے گئے ......... یہ حسین



انسانوں کا کنبہ تھا۔ سب سے انوکھی وہی تھی، سب سے حسین بھی وہ تھی۔ حسین یوں بھی تھی کہ مجھے حسین بنا گئی تھی.........!

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اس نے کام نمٹا لیا تھا اور اب سب کچھ ٹرے میں سجا رہی تھی.........

میں نے ہولے سے کہا......... "خدا حافظ!"

اس نے چونک کر باہر کی طرف دیکھا......... مسکرائی، کھڑی ہوگئی۔ ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی......... دو چار لمحے خاموش رہی۔ پھر باہر کی طرف دیکھا اور جذبے سے بولی.........

"خدا حافظ"!

ٹک کی آواز آئی۔ بتی بجھ گئی۔ کچن میں اندھیرا ہوگیا مگر میرا دل روشن ہوچکا تھا۔ میرا ضمیر، میرا من، سب جھلمل جھلمل کر رہے تھے.........

محبت کا اتنا بڑا خزانہ پاکر میں مالا مال ہو گیا تھا۔ خدا مجھ پر کتنا مہربان تھا۔ واپس فوج میں نہ آتا تو یہ خوشی مجھے کیسے نصیب ہوتی۔ نوشہرہ تبادلہ نہ ہوتا تو یہ پھول کیسے کھلتے۔ میڈیکل ڈپو میں ڈیوٹی نہ لگتی تو یہ انمول ہیرا کیسے ہاتھ لگتا۔ میں سوچ رہا تھا، یہ مواقع کون پیدا کر رہا ہے۔ محبتوں کے اس پراسس میں سے گزرنے کا مقصد کیا ہے .........؟ اس عذاب کا صلہ جو ابا مجھ پر مسلط کر گئے تھے یا زندگی کا کوئی اپنا ہی مفہوم پوشیدہ تھا......... کچھ تو تھا۔ میں اسے تقدیر کہتا یا تدبیر۔ بہر حال یہ احساس مجھے ایک خوش آئند مستقبل کی نوید دے رہا تھا۔

کمرہ بند کر کے میں نے اسے خط لکھا۔ میری زندگی کا یہ پہلا طویل خط تھا' جو تقریباً" پندرہ صفحات پر پھیل گیا تھا......... جب اس خط کو نظر ثانی کے لیے پڑھا تو شدید حیرت ہوئی......... یہ خط نہیں تھا' شاعری تھی' الہامی شاعری۔ مجھے پہلی بار اپنی تحریر کی شوخی اور گداز کا احساس ہوا ......... میں بار بار اس خط کو پڑھتا اور محظوظ ہوتا گویا اس سے مکالمہ کر رہا ہوں.........

نیند اڑ گئی تھی۔ وہ خوبصورت دہانہ' وہ معصوم چہرہ دل میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ مسکان' وہ جذبے میں ڈوبا ہوا خدا حافظ' وہ جچا تلا متناسب جسم' وہ ننھے منے سے خوبصورت ہاتھ......... یہ تصور ہی عجیب تھا۔ رات یونہی بیت گئی.........

صبح ہوئی......... کل کی طرح وہ آج بھی خط اٹھا کر لے گئی......... میں سارا دن مضطرب رہا۔ مجھے بے چینی سے جواب کا انتظار تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ دونوں طرف سے تسلیم و رضا کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوگا.........؟

چھٹی ہو چکی تھی۔ گارد کے سوا سارا ڈپو خالی ہوگیا تھا اور اس وقت تقریباً" پانچ بج رہے تھے۔ میں منتظر تھا کہ خط اینٹ کے نیچے رکھے گی تو فوراً" یہاں سے چل پڑوں گا لیکن وہ باہر نہ نکلی۔ ہر لمحے میرے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چھ بج گئے۔ میں مایوس ہوگیا تو سائیکل لے کر پیدل چل پڑا۔ میرے قدم بوجھل بوجھل سے تھے۔ کوٹھی کے قریب





پہنچا۔ میری نظریں برآمدے کی چک کے نچلے حصے پر لگی ہوئی تھیں......... اچانک سرخ پائنچوں میں گورے گورے پاؤں نظر آگئے۔ دل کی دھڑکن یکبارگی تیز ہوگئی۔ چک کے کنارے دھیرے سے کھل گئے۔ اس کا ہنستا ہوا حسین چہرہ نظر آگیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور پھر نیلا لفافہ ہوا میں تیرتا ہوا میرے قدموں میں آن گرا۔ لفافہ بہت وزنی تھا......... یقیناً" آج کا سارا دن اس نے جواب لکھنے میں صرف کیا ہوگا!

بیرک میں پہنچا۔ کمرہ بند کردیا اور خط کھول کر پڑھنے لگا......... تقریباً" بیس صفحوں کا یہ طویل خط پڑھ کر میں سرشار ہو گیا......... سچ مچ نشہ سا ہوگیا۔ ایسی بے پایاں خوشی مجھے پہلی بار نصیب ہوئی تھی' گویا میں پہلی بار محبت کر رہا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا' الفاظ اس مسرت کا احاطہ نہیں کرسکتے!

وہ خوش تھی......... مجھ سے زیادہ خوش۔ اس نے لکھا تھا' "آج میں نے روئے زمین کی ساری خوشیاں سمیٹ لی ہیں......... یہ سب کچھ کتنا انوکھا ہے......... کتنا عجیب' یہ جانے بغیر کہ آپ کون ہیں کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں' کیسی فطرت ہے' کیا عادات ہیں ؟ میں نے خود کو آپ کی محبت کی نذر کر دیا ہے......... دراصل مجھے یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں' بے حد اچھے۔ شاید محبت میں یہی ہوتا ہے۔اگر یہی ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ مجھے نہ خاندانی وجاہت کی پروا ہے' نہ مال و دولت کی طمع۔ میں صرف محبت کے لیے جینا چاہتی ہوں۔ آپ کی قربت زندگی ہے۔ آپ کی گود میں جینا مرنا زندگی ہے.........!"

مزید لکھا تھا......... "آپ کتنا خوبصورت خط لکھتے ہیں۔ آپ کی تحریر میں جادو ہے۔ آپ تو افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے خیالات کتنے اچھے کتنے پیارے ہیں۔ میں نے جس صورت کو دیکھ کر پیار کیا تھا' اس کے اندر کتنی خوبصورت روح بستی ہے۔ یہ میری تقدیر ہے کہ جوا کھیلا اور جیت گئی......... یہ میری پہلی اور آخری جیت ہے۔ اب میں آئندہ جوا نہیں کھیلوں گی بلکہ جو جیت لیا ہے اس کی حفاظت کروں گی۔ میں سچ کہتی ہوں' آپ

دیکھ لیں گے کہ میں آپ کے ساتھ کہاں تک جاسکتی ہوں......... میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں گی.........'

جوں جوں خط پڑھتا گیا' توں توں تغیر آتے گئے۔ کبھی میں ہلکا پھلکا محسوس کرتا اور اڑنے کو جی مچلتا......... کبھی میں ایسا گھمبیر ہو جاتا کہ خوشی سے آنسو نکل آتے۔ بعض جملے بار بار پڑھتا اور ہر بار نئی لذت سے آشنا ہوتا۔ خط کیا تھا' روح کو گداز کرنے والا نسخہ تھا.........

رات کو سب سپاہی سو گئے تو میں نے اسے خط لکھنا شروع کیا۔ اس کا خط سامنے کھلا پڑا تھا۔ ایک ایک جملہ پڑھتا۔ جواب میں کئی جملے لکھ جاتا۔ ایسی آمد' خیالات کا ایسا تانتا کہ لہر در لہر آتے اور صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتے۔ خط پڑھتے ہوئے جتنی خوشی محسوس ہوتی تھی' خط لکھتے ہوئے بھی ایسی ہی مسرت سے دو چار ہو رہا تھا۔ یہ تنہائی کے لمحے تھے لیکن ان میں بوسے کی گرمی تھی اور ہمکلامی کی چاشنی.........!

اب ہم روزانہ ایک دوسرے کو خط لکھتے اور شام کی ملاقات پر خطوط کا تبادلہ ہوتا۔ یہ خطوط پندرہ بیس صفحات سے کم نہ ہوتے۔ سوچتے' سب کچھ تو لکھ دیا' کل کے لیے کیا باقی رہ گیا۔ لیکن جب کل آتا تو خط لکھا جاتا اور صفحات کی تعداد بھی اتنی ہی ہوتی۔ فہمیدہ کا کمرہ کوٹھی کے پچھلی طرف لگتا تھا اور اس کا ایک دروازہ باتھ روم کی طرف کھلتا تھا۔ باتھ روم کا ایک دروازہ باہر برآمدے میں کھلتا تھا۔ فہمیدہ کا پلنگ کھڑکی کے قریب تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر پینٹ ہوا تھا۔ فہمیدہ نے ایک شیشے سے' انچ بھر کے قریب پینٹ کھرچ لیا تھا۔ میں رات کو نو بجے وہاں پہنچتا۔ اس کھرچی ہوئی جگہ پر آنکھ رکھ کر کمرے کا جائزہ لیتا' فہمیدہ پلنگ پر نیم دراز کوئی کتاب ہاتھ میں لئے میری منتظر ہوتی۔ میں شیشے پر ہلکی سی ٹک کرتا۔ وہ چونکتی' مسکراتی اور ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے باتھ روم میں جاتی اور باہر کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آجاتی اور گلے ملتی۔ پیار کرتے' خطوں کا تبادلہ کرتے اور آخر میں عقیدت سے میں اس کے ہاتھ کا بوسہ لیتا اور چک اٹھا کر چلا جاتا......... یہ ملاقات پانچ منٹ سے زیادہ نہ ہوتی.........



مسلسل چار پانچ ماہ تک یہی ہوتا رہا۔ اس سارے سلسلے میں ایسی چاشنی اور لطف تھا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ کھانا کھاتا تو ذہن میں فہمیدہ' بازار جاتا تو آنکھوں کے سامنے فہمیدہ' بیرک میں ہوتا تو دل میں فہمیدہ' ڈپو میں ہوتا تو پیرا میٹر کے باہر فہمیدہ اور اس کی دل لبھا دینے والی باتیں۔ اس کا گلے ملنے کا بے ساختہ انداز۔ اس کا ختم نہ ہونے والا ہر لمحہ انتظار۔ اس کی ہر ہر ادا کا سچ' شام کے وہ پانچ منٹ جس میں کبھی ناغہ نہ آتا۔ ملاقات ہوتی تو صبح تک اس کے بوسے کی گرمی تازہ دم رکھتی۔ صبح ہو جاتی تو شام کی ملاقات تک ہر ہر لمحہ محبت کے نور سے [illegible].........

کوٹھی سے تقریباً" پچاس گز کے فاصلے پر سرونٹ کوارٹر تھے۔ جو عموماً" خالی رہتے تھے۔ میں اسے بہت دنوں سے مجبور کر رہا تھا کہ وہ کسی رات آئے تاکہ ہم جی بھر کر باتیں کر سکیں مگر وہ ہنس کر ٹالتی رہی۔ جب میں نے ناراضگی کی حد تک مجبور کیا تو وہ راضی ہوگئی.........

آخر وہ تاریخی رات آگئی.........

یہ شدید یخ اور تاریک رات تھی۔ گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ وہ گہرے نیلے ریشمی کپڑے پہن کر آئی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یہ کانپنا سردی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ گھر سے پہلی بار نکلنے کا خوف تھا۔ میں نے اس کے نازک اور خوبصورت ہاتھوں' اس کے بالوں' اس کے رخسار' اس کی گردن' اس کی آنکھوں اور اس کے ہونٹوں پر بوسوں کی بارش شروع کردی۔ کافی دیر تک اسے دیوانوں کی طرح چومتا رہا۔ اس کا خوف کسی قدر کم ہوا تو ہولے سے بولی.........

"آپ کی ضد پوری ہوگئی۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے اسے پیار سے چپت مارتے ہوئے کہا......... "آج تو آپ میرے رحم و کرم پر ہیں۔ مرغ کی بانگ سے پہلے جانے نہیں دوں گا۔"

اس نے میرا ہاتھ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگایا......... اس رات ہم نے دنیا جہان کی باتیں کیں......... مستقبل کے منصوبے بنائے۔ اسی رات یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا

باپ احمدی ہے' ماں شیعہ ہے مگر خود فہمیدہ کا عقیدہ وہی رہے گا جو میرا ہے۔ اس عمر میں جب کہ مذہب کے ساتھ گہری شیفتگی ہوتی ہے' فہمیدہ کا مذہب صرف محبت تھا۔ وہ میرے ساتھ پاتال تک جانے کے لیے تیار تھی.........

فہمیدہ کا خیال تھا کہ رضا و رغبت سے ہماری شادی نہ ہو سکے گی اور اس کے لیے کوشش کرنا بے کار ہے۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔ عدالت میں بیان دینے کیے لیے بھی تیار تھی مگر ابھی اس کی عمر قانونی بلوغت سے چند ماہ کم تھی۔ وہ میری چھاتی سے لگی ہوئی بیٹھی تھی۔ ہر چند کہ میں اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن باتوں کے ریلے کے بعد اب جذبات کا طوفان اُمنڈ پڑا تھا۔ وہ میری دست درازی پر چڑنے کے بجائے تحمل سے بولی.........

" رحیم صاحب' اگر آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں تو منع نہیں کروں گی۔ میں آج بھی آپ کی ہوں اور کل بھی آپ کی رہوں گی۔ میرا جسم اور روح سب آپ کے لیے ہیں' پھر عصمت کو بچا کر میں کیا کروں گی۔ بس مجھے ایک احساس ہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا......... آپ میرے اس احساس کو زندہ رہنے دیجیے۔"

فہمیدہ کے خوبصورت انکار سے مجھ پر بالکل اُوس پڑ گئی۔ میرے ہاتھ جو اس کے جسم کو ٹٹول رہے تھے' ڈھیلے پڑ گئے۔ محرومی اور سرد مہری کی ایک لہر سارے جسم میں دوڑ گئی اور نادم ہو کر ہونٹ چبانے لگ گیا۔ جسموں کا باہمی رابطہ اور اتصال کے خلوص کا جام ٹوٹ گیا تو فہمیدہ نے چونک کر میری طرف دیکھا.........

"کیوں' آپ ناراض ہوگئے۔ چلئے ایسا ہے تو ایسا ہی سہی' جو جی میں آئے کر ڈالیے!"

اس کا یہ لہجہ میرے دل میں کھُب کر رہ گیا۔ اس کا گول حسین چہرہ تاریکی میں بھی دمک رہا تھا اور اس سے نور کا ہالہ اٹھ رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر ماتھا چوما اور بے اختیار گلے لگا کر زارو قطار رو پڑا.........

یہ عجیب رونا تھا......... بے بسی کا' ندامت کا' سب کچھ میرے اختیار میں تھا اور



پھر بھی اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ اب اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بچوں کی طرح بہلانے لگی۔ کبھی میری آنکھوں کو چومتی' کبھی ہونٹوں کو' کبھی گردن کو' کبھی میرے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیتی اور کبھی میرے کانوں کی لویں دھیرے دھیرے مسلتی۔ اب جذبات کے طوفان کی جگہ لطیف اور متین سی محبت نے لے لی تھی......... اس میں زیادہ وسعت' زیادہ عمق اور زیادہ گمبھیرتا تھی.........

میں اس کی باریک اور نرم نرم انگلیوں والے ہاتھوں کو دبا کر اپنے رخساروں سے رگڑتا......... ہونٹوں سے لگاتا' چھاتی پر رکھتا۔ اس کے ہاتھوں میں انوکھی گرمی' سکون اور راحت تھی۔ یہ دستِ شفا تھا' جس کی حرارت روح کو گرما دیتی تھی اور زندگی کو معطر کر دیتی تھی.........

" رحیم صاحب!" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پیار سے بولی "آپ ناراض تو نہیں ہوئے نا؟"

"نہیں جان نہیں" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "ہاں' میں شرمندہ ہوں۔ آپ نے مجھے معاف کردیا نا؟"

" ایسی باتیں نہ کریں" وہ پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولی "میں آپ کی باندی ہوں' ہمیشہ باندی رہوں گی۔ یہ وقت ثابت کرے گا........."

اسی رات طے ہوگیا کہ قانونی سنِ بلوغت پوری ہونے کے بعد وہ ماں باپ کا گھر چھوڑ دے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔ گو فہمیدہ کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے لہجے میں ایسی سچائی اور باتوں میں ایسا وقار تھا کہ فوراً" اس کا یقین آجاتا تھا......... گیتا سے جدائی کے بعد ڈیڑھ دو سال کا عرصہ جس بے یقینی میں گزرا تھا' فہمیدہ کے پیار نے اس بے یقینی کو ختم کر کے زندگی کو پھر سے یقین افروز بنا دیا تھا۔

علی الصبح جب مرغ کی بانگ نے صبح کی نوید دے دی تو وہ ہنس پڑی.........

"لیجئے آپ کے مرغ نے صبح کی نوید دے دی ہے۔"

" لیکن ابھی مؤذن نہیں جاگا پَو پھٹنے میں بہت دیر ہے۔"

" آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ یہ خوشی اکیلے آپ کی ہے۔ میں بھی آپ کی قربت میں آپ کی طرح سرشار ہوں شاید کچھ زیادہ ہی سرشار ہوں۔ مگر جانا تو ہے آخر' اس لیے آپ مجھے خوشی خوشی الوداع کہیں۔"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے.......... باہر خاموشی اور تاریکی تھی۔ آسمان روشن ستاروں سے جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ یخ ہوا چل رہی تھی مگر ہمارے دلوں کی گرمی اس کوہستانی ہوا پر بھاری تھی.......... میں نے وہ نرم نرم خوبصورت انگلیوں والا گرم گرم ہاتھ اٹھایا' عقیدت سے چوما اور پھر اسے الوداع کہہ دیا..........

وہ جو کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ہماری محبت کا چرچا بھی عام ہوتا جارہا تھا اور لوگوں نے سرگوشیاں شروع کردی تھیں۔ میں نے مشتاق کو خط میں تمام تفصیلات لکھیں۔ وہ ان دنوں لاہور میں لاء کر رہا تھا۔ مشتاق جو آج نہایت سنجیدہ آدمی ہے، ان دنوں نو جوان تھا اور میرا ہم سفر۔ اس نے میرے تمام پروگرام سے اتفاق کیا اور لکھا کہ جب بھی اس کی ضرورت ہو گی، نوشہرہ پہنچ جائے گا اور لڑکی کو ساتھ لے کر کوہاٹ یا پشاور چلا جائے گا اور ساری قانونی کارروائی مکمل کر لے گا..........

اس پروگرام کے تحت خود مجھے نوشہرہ میں ہی رہنا تھا تاکہ کوئی الزام ثابت نہ ہو سکے۔ قانونی کارروائی کے بعد مزید احتیاط کے طور پر ہم نے فہمیدہ کے عارضی قیام کا انتظام علاقہ غیر میں بھی کر لیا تھا کیونکہ بہرحال ایک کرنل کی لڑکی تھی۔ شدید ہنگامے اور ردعمل کی توقع عین ممکن تھی.......... فہمیدہ نے بھی اپنی ماں کو اعتماد میں لے لیا تھا..........

شام کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن فہمیدہ نے بتایا..........

" سامنے کی کوٹھی میں کیپٹن سعید کی بیوی کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہوگیا ہے کیونکہ پرسوں کیپٹن سعید نے میرے ابا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ ابا نے اماں سے بات کی اگرچہ ماں نے تردید کردی ہے مگر اب ہمیں کسی حد تک محتاط رہنا ہوگا۔"

میں نے پوچھا.......... "ہمیں محتاط رہنے کے لیے کیا کرنا ہوگا..........؟"

وہ بولی.......... "ہفتے میں دو بار ملاقات ہوگی.......... سوموار اور جمعرات کو' ماں



کی بھی یہی رائے ہے۔"

میں نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا۔ اب خط بھی تین دن کے بعد ملتے تھے۔ اس لیے صفحات کی تعداد مزید بڑھ گئی۔ دن میں ایک آدھ بار ایک دوسرے کی جھلک دیکھ لیتے تھے' دور دور سے سلام دعا ہو جاتی تھی۔ کیپٹن سعید کی بیوی ہمیں برابر واچ کرتی رہی.......... ایک شام کو جب میں فہمیدہ سے ملنے گیا کیپٹن سعید کی کوٹھی میں دو سائے نظر آگئے مگر میں نے پروا نہ کی۔ فہمیدہ سے تین دن کے وقفے کے بعد ملاقات ہوتی تھی۔ احتیاط برتتا تو گویا تین چار دن مزید انتظار کرتا' جو میرے لیے تقریباً" ناممکن تھا۔ لہٰذا جونہی میں نے چک اٹھایا' کیپٹن سعید نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ میں باہر نکل آیا تو کیپٹن سعید نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں..........؟"

میں نے سوچے سمجھے بغیر بے ساختہ کہہ دیا۔"کرنل بدیع الزماں صاحب سے۔" کیپٹن نے میرا نام پوچھا' مقصد پوچھا اور یونٹ کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے سچ سچ بتا دیا' البتہ مقصد کے متعلق کہا کہ ایک اہم سرکاری پیغام پہچانے آیا ہوں۔ کیپٹن نے مجھے وہیں کھڑا رہنے کے لیے کہا اور خود اندر چلا گیا۔ میں نے تاڑ لیا کہ معاملہ بگڑ چکا ہے اور یہاں مزید ٹھہرنا میرے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ لہٰذا کیپٹن اور کرنل کے آنے سے پہلے ہی میں اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ بیرک پہنچا تو دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کوئی بری خبر سننے کا خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا..........

اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ تھوڑی دیر میں پلاٹون کمانڈر پہنچ گیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کرنل بدیع الزماں نے اسی وقت میڈیکل سٹور کے کمانڈنٹ کو ٹیلی فون پر سارے واقع سے مطلع کر دیا تھا۔ میرا نام بھی بتا دیا تھا۔ چنانچہ ہمارے کرنل نے فوراً" پلاٹون کمانڈر کو بلوا کر انکوائری کے لیے بھیج دیا تھا۔ جب میں نے تمام الزامات قبول کر لیے اور اسے بتایا کہ میں کرنل صاحب کے سامنے بھی ہر بات سچ سچ کہہ دوں گا تو وہ مزید گھبرایا۔ دراصل بے چارے کو اپنی نوکری کی فکر تھی..........

ہمارے کرنل صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ دس دن پہلے انہوں نے کمیشن کے

لیے میری شفارش بھیجی تھی۔ صبح جب میری پیشی ہوئی تو بھی ان کا رویہ بے حد مشفقانہ تھا۔ وہ تقریباً" ایک گھنٹہ مجھے سمجھاتے رہے۔ کبھی مستقبل کی باتیں' کبھی طبقاتی فرق اور کبھی پٹھان اور غیر پٹھان کا مسئلہ ہونے کا خدشہ ظاہر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ آخر میں انہوں نے کہا.........

"کرنل بدیع الزماں نے سٹیشن ہیڈ کوارٹر سے بات کر کے ملٹری پولیس متعین کر لی ہے۔ اس لئے تم کوٹھیوں والے راستے سے نہ جایا کرو........"

شام کو چار بجے میڈیکل سٹور میں چھٹی ہو گئی تو واقعی کوٹھیوں کی طرف جانے والے راستے پر ملٹری پولیس کے دو سپاہی کھڑے تھے۔ جو سائیکل اور پیدل جانے والوں کو اس راستے پر جانے سے منع کر رہے تھے........ خوش قسمتی سے ملٹری پولیس کے اس دستے کا انچارج حوالدار فزیکل ٹریننگ سکول کسولی میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اسے سارے واقعے کا علم ہوا تو مجھے گلے لگا کر بولا۔

"بس تم دو دن صبر کرلو۔ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو یہ راستہ سب کے لیے بند صرف تمہارے لئے کھلا ہو گا۔"

اور ہوا بھی یہی' اب یہ عام گزرگاہ نہ رہی تھی۔ مگر میرے لئے اذنِ عام تھا۔ بلکہ ایک طرح سے میں ملٹری پولیس کے سپاہیوں کی نگرانی میں عشق کر رہا تھا۔ انہی دنوں فہمیدہ کا بھائی شدید بیمار ہو کر ملٹری ہسپتال داخل کر لیا گیا۔ شام کو فہمیدہ' اس کی ماں اور بہنیں اسے دیکھنے جاتیں۔ میں بھی کسی بہانے ہسپتال پہنچ جاتا اور کسی نہ کسی نکڑ پر اس فیملی سے ڈبھیڑ ہو جاتی۔ فہمیدہ ایک خاص ادا سے مسکراتی۔ اس کی بہنیں دزدیدہ نگاہوں سے بہن کو دیکھتیں۔ ماں کے رویے میں بظاہر بے نیازی ہوتی مگر اس بے نیازی میں ایک لطیف سی اپنائیت کا احساس ہوتا.........

لڑکے کی بیماری خاصی طول کھینچ گئی تھی۔ وہ کافی عرصہ ہسپتال میں رہا۔ اگرچہ اس عرصے میں حفظِ ماتقدم کے طور پر ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ تقریباً" ختم ہو گیا تھا مگر خط و کتابت جاری رہی۔ فہمیدہ کے گھر میں جو جمعدارنی کام کرتی تھی' وہ ڈاکیہ کے فرائض انجام



دیتی تھی۔ ہم دونوں اسے انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ وہ میرے سامنے فہمیدہ کی تعریفیں کرتی اور فہمیدہ کے سامنے میری دریا دلی کے افسانے بیان کرتی۔ وہ ہم دونوں کی کمزوریاں جان گئی تھی۔ ہم اس کی چالاکی کو سمجھتے تھے مگر اس کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے اور نہ ہی اس کی چالاکی کو برا سمجھتے تھے۔ بلکہ ایک حد تک وہ ہمیں اچھی لگتی تھی۔ کیونکہ اس کے آستین سے محبوب کے دامن کی خوشبو آتی تھی.........

جوں' جوں' اس کی عمر قانونی بلوغت کی طرف بڑھ رہی تھی' توں توں عزمِ سفر کی خواہش میں بھی شدت بڑھ رہی تھی۔ وہ مجھے یاد دلاتی کہ اب ڈھائی ماہ' اب ڈیڑھ ماہ اور اب صرف ایک ماہ باقی رہ گیا ہے۔ میں اسے تسلی دیتا کہ سارے انتظام ہو چکے ہیں اور معین تاریخ پر تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماں باپ کا گھر چھوڑ دو گی........ اس کا بھائی صحت یاب ہو کر واپس آگیا تھا۔ مگر بے حد لاغر تھا۔ گھر پر ہی رہتا تھا........ میں نے مشتاق کو تمام حالات سے مطلع کر دیا تھا۔ ہر بات طے ہو چکی تھی۔ مشتاق نے نوشہرہ میں کسی دوست کے پاس ٹھہرنا تھا اور اسی کی موٹر پر فہمیدہ کو لے کر راتوں رات نکل جانا تھا........

مشتاق کے پہنچنے سے دو دن پہلے میں فہمیدہ سے ملا۔ یہ ہماری طویل ملاقات تھی۔ اس رات ہم چار گھنٹے اکٹھے رہے۔ وہ بالکل تیار تھی۔ کپڑے' زیور اور ایک ہزار روپیہ نقد' جو گھر میں پڑے تھے' ساتھ لانے کو کہہ رہی تھی لیکن میں نے منع کر دیا اور سمجھایا کہ ماسوائے پہنے ہوئے کپڑوں کے اور کوئی چیز ساتھ نہ لائے۔ کیونکہ ہم یہ احساس پیدا کرنا نہیں چاہتے کہ ہم نے کسی لالچ کے تحت یہ کام کیا ہے........ یہ بھی طے ہوا کہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان وہ اسی کوارٹر میں آئے گی۔ اس کے اندھے اعتماد پر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ چند دنوں تک قبائلی علاقے میں رہے گی........ میں سوچ رہا تھا' اٹھتی جوانی کی محبت میں کس قدر استقلال اور قوت ہوتی ہے اور انسان دیوانگی کی حد تک مہم جوئی کے جذبے سے بھرپور ہوتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تدبیر کند بندہ' تقدیر زندخندہ' جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ مشتاق بھی پہنچ گیا۔ فہمیدہ بھی تیار تھی۔ اسی دن شام چار بجے فہمیدہ کے بھائی کی

طبیعت بگڑ گئی' فوراً" ہسپتال پہنچایا گیا۔ مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے' چھ بجے وہ انتقال کر گیا۔

تین بہنوں کا اکیلا بھائی' گھر میں کہرام مچ گیا......... مجھے اسی دن محسوس ہو گیا تھا کہ کاتبِ تقدیر نے ہماری ملن کی گھڑی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے.........!

مشتاق واپس چلا گیا۔ میں نے اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا......... اس ناکامی نے مجھے گہرا جذباتی صدمہ پہنچایا۔ میں فہمیدہ کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا اور اس کا تجزیہ کرنے سے بھی قاصر تھا......... تقریباً" ایک ماہ بعد مجھے وہ من موہنی صورت نظر آئی۔ میڈیکل سٹور کے پیرامیٹر کے ساتھ گھومتے ہوئے اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ تک ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر کھڑے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ اس نے کوئی حرکت کی' نہ میں نے کوئی اشارہ کیا۔ پھر وہ اندر چلی گئی۔ میں آگے نکل گیا۔ اس کے بھائی کی موت کے بعد یہ پہلا دن تھا کہ میرا دل دھڑکا تھا۔ اس دھڑکن میں محبت کی تازہ رمق تھی۔

اسی رات میں اس سے ملنے بھی چلا گیا۔ کھرچے ہوئے شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ فہمیدہ کھڑکی کی دیوار سے پشت لگائے بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے ہلکی سی ٹک ٹک کی تو وہ چونک کر کھڑکی کی طرف مڑی اور اگلے لمحے باتھ ورم کی طرف لپکی۔ برآمدے میں پہنچی تو بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی اور دبی دبی ہچکیوں کے ساتھ رونے لگ گئی۔ میرا دل بھی بھر آیا......... ذرا سنبھلی۔ افسوس کا اظہار کیا اور ماں سے بھی تعزیت کرنے کے لئے کہا تو وہ بولی.........

"آپ ان سے خود تعزیت کیوں نہیں کر لیتے۔ کل آپ نو دس بجے آئیں۔ ابو اس وقت گھر پر نہیں ہوتے.........!"

میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ کس دعوے اور دلیری سے یہ بات کہہ رہی تھی۔ دوسرے دن صبح نو بجے میں ان کی طرف گیا۔ ماں سے بالشافہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ بے حد پیار سے پیش آئیں۔ جو باتیں فہمیدہ نے ان گنت ملاقاتوں میں نہ پوچھی تھیں۔ انہوں نے



ایک ملاقات میں پوچھ لیں۔ لیکن ان کے لہجے میں ایسی اپنائیت تھی کہ دل مچل مچل اٹھا......... چائے آ گئی۔ دونوں چھوٹی لڑکیاں بھی ہمارے پاس بیٹھی تھیں۔ فہمیدہ بیڈ روم کا دروازہ ذرا سا کھولتی' جھانکتی' مسکراتی اور پھر غائب ہو جاتی......... باتیں ماں سے کر رہا تھا، نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ نہ ماں کو نظرانداز کر سکتا تھا' نہ دروازے کی حرکت کو۔ فہمیدہ میری اس بے بسی اور تذبذب سے محظوظ ہو رہی تھی۔ ماں چائے بنانے لگی تو فہمیدہ نے جھانک کر نیلا لفافہ دکھایا.........

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی منجھلی بہن ہالہ جو میرے قریب بیٹھی تھی، ہماری اشارہ بازی دیکھ کر مسکرائی......... جب میں وہاں سے اٹھا تو بہت ہلکا پھلکا تھا۔ ڈرائنگ روم سے باہر نکلا تو برآمدے میں فہمیدہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک خاص ادا سے لفافہ میری طرف بڑھایا۔ میں نے مسکرا کر نظریں اس پر جما دیں اور پھر لفافہ لے کر اسے تھینکس کہا لیکن جونہی چک اٹھا کر باہر نکلا، کیپٹن سعید کی بیوی نفرت اور رعونت کا مجسمہ بنے مجھے گھور رہی تھی.........میں نے بظاہر اسے نظرانداز کیا مگر دل میں کھٹکا محسوس کیا کہ کوئی نیا گل ضرور کھلے گا......... اور وہی ہوا۔ تقریباً" ایک گھنٹہ بعد جب میں پلاٹون کمانڈر کے ساتھ دفتر میں بیٹھا ہوا تھا' کیپٹن سعید بمع ایک صوبیدار کے اندر آ گیا اور نہایت غصے میں پلاٹون کمانڈر سے مخاطب ہوا۔

"یہی ہے تمہارا حوالدار.........؟"

اس نے ڈرتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ اب کیپٹن سعید بالواسطہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم کرنل بدیع الزمان کی کوٹھی گئے تھے.........؟"

"یس سر........." میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

"کس لئے.........؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا.........

"تعزیت کرنے۔"

"تعزیت کرنے۔!" وہ چیں بچیں ہو کر بولا۔ "کیا کرنل صاحب گھر پر موجود

تھے.........؟"

"جی نہیں۔" میں نے بھی تلخی سے جواب دیا۔ "مجھے جن سے تعزیت کرنا تھی' وہ گھر پر موجود تھے۔"

"شٹ اپ' تمہاری حیثیت ہی کیا ہے کہ افسروں کی کوٹھیوں میں یوں دندناتے پھرو۔"

"کیپٹن صاحب!" میرے دماغ میں بھی یکدم فتور آگیا۔ "اگر آپ نے حد سے تجاوز کیا تو اپنی بے عزتی کے خود ذمہ دار ہوں گے!!"

کیپٹن سعید میرے لہجے اور جلال سے گھبرا گیا۔ چند لمحے سختی سے گھورتا رہا۔ پھر غصے سے بولا۔

"او کے......... آئی ول سی یُو!"

ہمارے پلاٹون کمانڈر کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ کیپٹن سعید چلا گیا تو وہ کافی دیر تک مجھے ملامت کرتا رہا۔ میرے مستقبل اور اپنی ملازمت کے حوالے دیتا رہا۔ مگر میں نے اس کی باتوں کی طرف بہت کم دھیان دیا......... دراصل میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور کیپٹن سعید پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اتنے میں کمانڈنٹ کرنل کا اردلی پہنچ گیا۔ کرنل صاحب نے ہم دونوں کو دفتر طلب کیا تھا۔ پلاٹون کمانڈر اور زیادہ گھبرا گیا۔

کرنل صاحب کے سامنے پیشی ہوئی تو انہوں نے بھی پہلا سوال وہی کیا۔

"تم کرنل بدیع الزمان کے ہاں گیا تھا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ حیرت سے بولے۔

"میرا خیال تھا' تم میرے سامنے اعتراف نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں سر' میں چوری کرنے نہیں گیا تھا۔ وہاں ایک گھنٹہ بیٹھا رہا ہوں۔ چائے پی ہے۔ تعزیت کی ہے۔ وہ لوگ میرے ساتھ بے حد خوش اخلاقی سے پیش آئے........."

کرنل صاحب چند لمحے متانت سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے پلاٹون کمانڈر کو



باہر جانے کے لئے کہا۔ پلاٹون کمانڈر چلا گیا تو انہوں نے مسکرا کر مجھے پشتو میں کہا.........

"تو تم باز نہیں آئے؟"

"سر میرا قصور کیا ہے آخر۔" میں نے بھی پشتو میں جواب دیا۔ "لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں لوگوں کو صرف اس لئے کھلتا ہوں کہ وہ کرنل کی لڑکی ہے اور میں ایک معمولی حوالدار ہوں!"

"دیکھو خٹک۔" کرنل صاحب نرمی سے بولے۔ "مجھے احساس ہے' تم بے قصور ہو مگر میں تمہاری حمایت اس لئے نہیں کر سکتا کہ بدقسمتی سے ہم دونوں پٹھان ہیں۔ میں اس مسئلے کو پولیٹیکل مسئلہ نہیں بنانا چاہتا۔"

"یعنی میں اس لئے قابلِ تعزیر ٹھہرا کہ آپ کا ہم نسل ہوں۔ گویا جس نکتے سے مجھے فائدہ ملنا چاہئے تھا' وہی میرے لئے باعثِ نقصان ہو گا؟"

"ہاں حالات کا یہی تقاضا ہے کہ یہاں سے تمہاری ٹرانسفر ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک تمہاری اہلیت کا سوال ہے' میں نے کمیشن کے لئے تمہاری سفارش کر دی تھی۔ وہ تمہارا حق تھا لیکن اب اسی میں تمہارا بھلا ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔"

کرنل صاحب ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے تھے لیکن میں جان گیا تھا کہ بات میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ مجھے کرنل صاحب پر بھی غصہ آ رہا تھا کیونکہ میرے نقطۂ نگاہ سے وہ سچ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ کرنل بدیع الزماں کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ فہمیدہ سے بھی کسی کو پوچھنے کو جرأت نہ ہوئی۔ سارا نزلہ مجھ پر گر رہا تھا۔ کیونکہ بہ لحاظ عہدہ سب سے کمزور آدمی میں تھا......... بہت ممکن تھا کہ میں کرنل صاحب کو جلی کٹی سنا دیتا۔ لیکن جبر کر کے ضبط سے کام لیا کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا تھا اور میری ترکش میں ایک تیر باقی تھا......... میں فہمیدہ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا......... جرأت رندانہ کا یہ عالم کہ کرنل صاحب کے دفتر سے نکل کر سیدھا کرنل بدیع الزماں کی کوٹھی پہنچ گیا......... دراصل فہمیدہ کی محبت نے میرے ذہن سے ہر طرح کا خوف نکال دیا تھا۔ میں اپنے قلم رو کا بادشاہ تھا۔ اس بادشاہت کا تاج فہمیدہ نے میرے سر پر رکھ دیا تھا اور میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا

تھا.........

ڈرائینگ روم کا دروازہ فہمیدہ نے کھولا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں جبری ٹرانسفر کی خبر سنائی تو وہ بالکل بوکھلا گئی اور ٹک ٹک مجھے دیکھنے لگ گئی۔ میں نے ماں کو بھیجنے کے لیے کہا تو وہ ہونٹ چباتی ہوئی اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ماں آ گئی۔ میں نے سارا واقعہ سنایا تو وہ بے حد تحمل سے بولی.........

" بیٹا' جہاں آپ کی ٹرانسفر ہوتی ہے' چلے جائیں' وقت کا انتظار کریں اور ہم پر بھروسہ کریں۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ بغاوت کا زہر میری رگوں میں پھیل گیا تھا اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ فہمیدہ بھی آگئی تھی اور چپ چاپ' خاموش' اداس ماں کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ نگاہیں ملیں۔ ہم خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ میری اور میں اس کی بے بسی کو پا رہا تھا۔ ماں ہماری مجبوری اور دکھ کو سمجھ رہی تھی۔ بولی۔

" بیٹا! میں اپنی بیٹی کو جانتی ہوں۔ یہ سچی اور سیدھی لڑکی ہے۔ یہ آپ کو کبھی دھوکہ نہیں دے گی۔ ہم آپ پر بھی بھروسہ کرتے ہیں۔ اس وقت یہی مناسب ہے کہ آپ کو جو حکم ملے اس کی تعمیل کریں۔ ہم سب کی بہتری اسی میں ہے۔"

بات تقریباً" ختم ہو گئی تھی۔ میں ماں کی رائے کو رد نہیں کرسکتا تھا لیکن جدائی کے لمحے کا تصور بے حد اذیت ناک تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فہمیدہ بھی ہونٹ چبا رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور الوداعی انداز میں ماں کے سامنے جھک گیا۔ ماں نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے لیا اور میرے سر پر ہونٹ رکھ دیئے......... پیشانی چومی.........

فہمیدہ نے روتے ہوئے اپنا سر صوفے کے ہتھے پر رکھ دیا......... ایک بے حد حسین و جمیل لڑکی جو پچھلی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ منفرد تھی' جو میرے طبقے سے نہیں تھی' جس نے مجھے ناول نگار کہا تھا' جس نے مجھے پہلی بار یہ احساس دیا تھا کہ میری تحریر میں جادو ہے۔ قلمکار بننے کا پہلا بیج اسی نے میری روح میں بویا تھا۔ بہت ممکن ہے فہمیدہ میری زندگی میں نہ آتی تو آج میں " لیکھک" نہ ہوتا' یہی وجہ ہے جو میں کہتا ہوں کہ قدرت نے



جس شخص سے جو کام لینا ہوتا ہے' اسے ایسے پراسس میں سے گزارنے کا اہتمام وہ خود کرتی ہے۔ فہمیدہ سے جدائی بھی غالباً" اسی پراسس کا حصہ تھا.........

میرا تبادلہ آرڈیننس ڈپو لاہور ہو گیا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تبادلہ تھا' جیسے ایک بار زمانۂ جنگ میں ایک سو ستاون جی پی ٹی کمپنی سے نکالا گیا تھا۔ یہاں بھی میں ناپسندیدہ عہدے دار کا دُم چھلہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ کمپنی کمانڈر کے سامنے پیشی ہوئی۔ انہوں نے کہا۔

" تم تین ماہ کی ایڈورس رپورٹ پر ہو۔ اس عرصے میں تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو دوسری خراب رپورٹ کے بعد نوکری سے جواب مل جائے گا!"

"یس سر" میں نے جواب دیا۔

"کیا کیا تھا تم نے .........؟" انہوں نے پوچھا.........

میں نے سارا واقعہ بلاکم و کاست سنادیا تو وہ مسکرا کر بولے......... "آئی سی!"

یہ تین مہینے کیسے گزرے.........: میں ہر رات فہمیدہ کی یاد میں روتا رہا۔ یہاں ایک نیم پاگل صوبیدار میجر مل گیا تھا جو ہر روز مجھ سے فہمیدہ کا قصہ سنتا رہا۔ کوئی پارٹی ہوتی تو مجھ سے تقریر لکھواتا رہا اور خوب رٹا لگا کر میرے کمرے میں ریہرسل کرتا لیکن وہ معصوم آدمی تھا۔ تین ماہ بعد جب اس کے مشورے سے میری رپورٹ لکھی گئی تو شاندار الفاظ میں میرے کام اور صلاحیتوں کا ذکر کیا گیا تھا.........

لیکن اب ملازمت میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ فہمیدہ میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ رات کو اس کے خطوط نکال کر پڑھتا رہتا اور آنسو بہاتا رہتا۔ ہماری کور کے تمام جونیئر اور سینئر افسروں کو اس عشق کا علم ہو چکا تھا۔ صوبیدار میجر نے فہمیدہ کے خط کئی بار پڑھے تھے پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ فہمیدہ کی تصویر لے کر دس دس منٹ تک ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہتا تھا۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا .........

"واہ پٹھان' ڈاہڈی سونڑی کڑی اے!"

اس بوڑھے اور نیم دیوانے افسر کی نفسیات دیدنی تھیں .........

بہت امکان تھا کہ میں استعفیٰ دے کر فہمیدہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا کہ اچانک ملتان سنٹر طلب کر لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہماری کور میں جو حوالدار فسٹ کلاس انگلش اور فسٹ کلاس رومن اردو پاس ہیں' انہیں شاٹ کورس کے لیے سنٹر بلایا گیا ہے۔ کورس کے بعد کامیاب کیڈٹس کو جونیئر کمشنڈ افسر بنا دیا جائے گا۔

کوالیفکیشن کے مطابق پندرہ حوالدار سنٹر پہنچ سکے۔ یہ تین ماہ کا کورس تھا۔ سنٹر کے کمانڈنگ میجر مثال خان پٹھان تھے اور آرمڈ کور سے آئے تھے۔ ایک دن اچانک انہوں نے مجھے دفتر طلب کیا۔ دو چار سوال کر کے انہوں نے مجھے حیران کر دیا۔

پوچھا......... "تم احمدی ہو.........؟"

"آرمڈ کور کے میجر آفتاب کو جانتے ہو.........؟"

میں نے کہا......... "نہیں"

تو وہ حیران ہو کر بولے......... "میجر آفتاب نے تمہارے گھر کا ایڈریس مانگا ہے۔ آخر تم سے ان کا کیا واسطہ ہے۔ وہ پکا احمدی ہے؟"

میں سارا پس منظر سمجھ گیا۔ چونکہ فہمیدہ کے والد بھی احمدی تھے۔ ان لوگوں کو میرے گھر کے ایڈرس کی ضرورت شاید اس لیے تھی کہ مبادا فہمیدہ چلی گئی تو اسے کہاں تلاش کریں گے۔ لہٰذا یہ حفظِ ماتقدم تھا.........

میں نے میجر مثال خان کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ ہنس کر بولے "پھر کیا کیا جائے۔ تمہارا ایڈرس دینے میں کوئی حرج تو نہیں ؟"

"نہیں سر' کوئی حرج نہیں۔"

"مگر دیکھو ان کے پھندے میں نہ آنا۔ میجر آفتاب بے حد دھیما لیکن بہت چالاک آدمی ہے۔"

اس دن میں بہت خوش تھا کہ کسی نے کسی وجہ سے فہمیدہ کا ذکر آگیا تھا۔ اس کے لواحقین کو فکر لاحق تھی اور وہ میری سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتے تھے......... اسی دن میں نے ایک خط مشتاق کو لکھا اور دوسرا میجر آفتاب کو۔ مشتاق سے کہا......... کہ جب وہ



دسمبر کی چھٹیوں میں گھر جائے تو نوشہرہ سے ہوتے ہوئے کرنل بدیع الزمان سے فہمیدہ کے رشتے کی بات کرے.........

میجر آفتاب کو لکھا......... یہ جان کر کہ آپ میرے گھر کے ایڈرس کی تلاش میں ہیں بے حد خوشی ہوئی اور اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ دراصل یہ طاقت مجھے محبت نے عطا کی ہے......... اگر آپ ایک عام آدمی کی طرح پوچھتے ہیں تو میں آپ سے کسی فیض کی توقع نہیں رکھتا لیکن اگر آپ عالی ظرف ہیں تو پھر میں آپ سے توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ آپ میری اور فہمیدہ کی مدد کریں.........

خلافِ توقع چند دن کے بعد میجر آفتاب کا جواب موصول ہوا۔ اس شخص نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور نوشہرہ آنے کے لیے لکھا تھا۔ ایک ایسے شخص سے جو درپردہ میرے خلاف پیش بندیاں کر رہا تھا' کوئی امید باندھنا احمقانہ خوش فہمی تھی۔ پھر بھی حکایت یار کا معاملہ تھا۔ سوچا' کیوں نہ اس بہانے کوچہ یار کا پھیرا لگ جائے۔ لیکن مشتاق جو ان دنوں میرے معاملے میں بے حد مستعد تھا' کرنل بدیع الزمان سے ملا' رشتے کی بات ہوئی۔کرنل نے بے حد رعونت اور تکبر سے اس درخواست کو رد کر دیا......... یہ تو خیر ہونا ہی تھا۔ میری نا سمجھی تھی کہ فہمیدہ کے باپ کو فلمی باپ سمجھ رہا تھا جو بیٹی کے آنسو دیکھ کر رام ہو جائے گا۔

کورس ختم ہوا۔ میں امتحان میں فسٹ آگیا اور کمیشن مل گیا......... اب میں افسر تھا۔ باقاعدہ اردلی مل گیا اور سپاہی سلیوٹ پر سلیوٹ کرتے تھے۔ میجر مثال کی خواہش پر مجھے ٹریننگ سنٹر میں رکھ لیا گیا......... دس دن کی چھٹی لے کر نوشہرہ پہنچا۔ کوچہ حبیب ویران تھا اگرچہ کرنل بدیع الزمان نوشہرہ میں تھا۔ اسی کوٹھی میں رہتا تھا مگر دو ماہ پیشتر بچوں کو گاؤں واپس بھیج چکا تھا......... وہ جمعدارنی جس کے آستین سے دامنِ یار کی خوشبو آتی تھی' اب بھی کوٹھی کا کام کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ اس نے بے حد جذباتی لہجے میں ساری باتیں بتائیں کہ کس طرح فہمیدہ نے حالات کا مقابلہ کیا اور آرٹلری کے کسی لیفٹیننٹ کے رشتے سے صاف انکار کیا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر زبردستی کی گئی تو وہ

زہر کھالے گی یا بھاگ جائے گی۔ چنانچہ کوئی بس نہ چلا تو اس کو گاؤں واپس بھیج دیا گیا.........

اب ساری بات سمجھ میں آگئی تھی کہ میجر آفتاب نے میرا ایڈریس کیوں مانگا تھا۔ جمعدارنی کو انعام دے کر میجر آفتاب سے ملنے چلا گیا۔ یونیفارم میں تھا اپنا تعارف کرایا۔ میرے کندھے پر سٹار دیکھ کر وہ حیران رہ گیا......... اس کا رویہ بے حد شریفانہ تھا مگر اس کی باتوں میں لومڑی کی سی عیاری تھی۔ وہ بد شکل آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر انسان کی طبیعت بیزار ہو جاتی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ فہمیدہ کا ذکر بھی آیا۔ میں جو کچھ سمجھا وہ یہ کہ اس نے مجھے ایک جھوٹا آسرا دیا تھا تاکہ اگر کوئی عملی قدم اٹھاؤں تو عبوری طور پر اسے ملتوی کردوں اور ان کو وقت مل جائے کہ فہمیدہ کو ادھر ادھر کر سکیں۔

دراصل تین ماہ تو میں ایڈورس رپورٹ پر تھا۔ چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے بعد کورس میں پھنس گیا اور وقت نکل گیا۔ یوں میرا اور فہمیدہ کا رابطہ ٹوٹ گیا اور ہم بچھڑ گئے......... لیکن اس سب کے باوجود جہاں میجر آفتاب سے ملاقات دل شکن اور مایوس کن تھی، وہاں جمعدارنی کی باتوں نے مجھے بے حد تقویت پہنچائی۔ فہمیدہ اپنے پاؤں پر کھڑی تھی اور اسے زبردستی ناؤ میں ڈالنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی.........

ملتان سے ہمارا سنٹر ڈیرہ اسمٰعیل خان چلا گیا۔ چھ ماہ بعد میرا تبادلہ جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی کر دیا گیا۔ اس تبادلے پر مجھے خوشی ہوئی۔ جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی کا ماحول بے حد باوقار تھا۔ آب وہوا اچھی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہاں فہمیدہ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا آسان تھا۔ ایک ماہ کی تلاش کے بعد مجھے ایک ایسا سپاہی مل گیا جو فہمیدہ کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ بہت جیالا سپاہی تھا اور ہر طرح کے اقدام کے لیے فوراً آمادہ ہوگیا۔ چند دن کے بعد اس کی رخصت کا انتظام کر دیا گیا اور ایک تفصیلی خط دے کر اسے روانہ کردیا.........

دس دن کے بعد جب یہ سپاہی واپس پہنچا تو اس کی آنکھوں میں فتح مندانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے جیب سے فہمیدہ کا خط نکالا تو میں نے اسے بے ساختہ



گلے لگایا۔ لفافہ کھولا تو وہی جانی پہچانی خوشبو جو فہمیدہ کے خوبصورت بدن سے پھوٹتی تھی اور میرے حواس پر چھا جاتی تھی۔ تقریباً ایک سال بعد پھر میری روح کو بھیرویں راگ سنا رہی تھی.........

لکھا تھا.........

رحیم صاحب!

شکر ہے، آپ نے میری خبر تو لی۔ ایک سال کی کہانی ایک دو صفحوں میں کیسے بیان کروں۔ مجھ پر کیا گزری۔ کبھی فرصت میں سناؤں گی۔ قیدی کی طرح زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ باپ جو آنکھوں میں بٹھاتا تھا، دیکھنے کا روادار نہیں رہا۔ خاندان میں میرا وجود گالی بن گیا ہے۔ اس سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے پوری بے شرمی سے اعلان کردیا ہے کہ شادی کروں گی تو پٹھان سے، ورنہ زندگی گنوا دوں گی۔ لہٰذا کوئی خاندان کی بات کرتا ہے، کوئی نسل کی اور کوئی مذہب کی۔ سب مجھے سمجھاتے ہیں، میری بات کوئی نہیں سمجھتا۔ سب اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، میرے دل کی بات کوئی نہیں سنتا۔

آپ سے ملنے کی کتنی چاہ ہے۔ آپ کو دیکھنے کی کتنی حسرت ہے۔ دن میں کئی بار آپ کی یاد آتی ہے۔ رات کو جب تک آنکھ نہیں لگتی، آپ سے باتیں ہوتی ہیں۔ سوچتی ہوں، کسی دن چپکے سے آپ نکل آئیں گے، میں ہکی بکی دیکھتی رہ جاؤں گی۔ آپ مسکرائیں گے اور میں بے ساختہ آپ سے لپٹ جاؤں گی۔ ہاں میں دن رات ایسے ہی خواب دیکھتی ہوں.........

رحیم صاحب، آجایئے نا، آپ کو میری قسم، میرے دعوؤں کو سچ کر دکھایئے......... تاکہ میں آنکھ اٹھا کر کہہ سکوں، دیکھو وہ رات

آیا تھا۔ میرے رخساروں میں گڑے ہوئے دانتوں کے نشان دیکھ لو۔

وہ جیالا پٹھان آیا تھا.........!

خط پڑھ کر میں شدتِ جذبات سے کانپنے لگ گیا۔ فہمیدہ مجھے بلا رہی تھی۔ میرے لئے تڑپ رہی تھی۔ وہ مجھے بلا رہی تھی .........

سپاہی میری کیفیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "خیریت ہے صاحب جی.........؟"

"غلام محمد!" میں جذبات سے بھرپور لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہارا احسان نہیں بھول سکتا لیکن مجھ پر ایک اور احسان کر دو۔ مجھے اپنے گاؤں لے چلو مجھے فہمیدہ کا گھر بتا دو۔ میں اس سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہوں!!"

"مگر صاحب جی، یہ کیسے ممکن ہے گرمی کا موسم ہے۔ ان کا لمبا چوڑا خاندان ہے۔ سب لوگ باہر صحن میں سوتے ہیں۔ آپ اس لڑکی کو کیسے تلاش کریں گے؟"

" یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اپنی تقدیر کو آزمانا چاہتا ہوں۔ بس تم اس گھر کی نشاندہی کر دو۔ اس کے بعد اپنے گھر جا کر سو جاؤ۔"

میں دیکھ رہا تھا۔ غلام محمد خوف زدہ نظر آ رہا تھا مگر اس نے حامی بھرلی.........

" اچھا صاحب جی میں تیار ہوں۔"

پروگرام طے ہوا تو ایک دن جمعہ کی آدھی چھٹی کے بعد ہفتہ اور اتوار کا نائٹ پاس لے کر ہم دونوں راولپنڈی سے نکل پڑے۔ فہمیدہ کا گاؤں راولپنڈی سے ساٹھ میل دور خوبصورت پہاڑی علاقے میں واقع تھا۔ چالیس میل سڑک پکی تھی، باقی بیس میل کا راستہ کچا تھا۔ ہم شام کو وہاں پہنچ گئے اور گاؤں سے دو میل پیچھے اتر گئے۔ غلام محمد گاؤں چلا گیا اور مجھے وہیں انتظار کرنے چھوڑ دیا۔ یہ دو گھنٹے عجیب کش مکش اور اذیت میں گزرے۔ کھیت کے منڈیر پر بیٹھے بیٹھے طرح طرح کے خیال آتے رہے لیکن سب شکوک وشبہات، خوف اور خطروں کے باوجود ایک بات طے تھی کہ فہمیدہ سے ملنے آیا ہوں اور کوئے یار میں مرنے سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے.........!



غلام محمد آگیا، اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر۔ اس کے سر پر پانی کی چھوٹی سی گھڑی تھی۔ غلام محمد کے ہاتھ میں کھانا اور برتن تھے۔ وہ پراٹھے اور انڈے بنوا کر لایا تھا۔ لیکن مجھے تو جذبات کی پے در پے لہروں نے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ بمشکل دو نوالے لے سکا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ریوالور نکال کر میں نے لوڈ کیا، ٹارچ میں سیل ڈالے اور گاؤں کی طرف چل پڑے.........

یہ گاؤں ایک ٹیلے پر پھیلا ہوا تھا۔ دائیں بائیں بھی چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور پہاڑیاں تھیں۔ یہ خاصا بڑا گاؤں تھا۔ اکا دکا گھروں سے لالٹین کی مدھم مدھم روشنی آ رہی تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ عام گاؤں کی زندگی کی طرح اس گاؤں کے لوگ بھی سرِ شام سو گئے تھے۔ غلام محمد نے بھائی کو گھر بھیج دیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کی ڈھلانی گلی کے بعد ہم ایسی جگہ رک گئے، جہاں دائیں ہاتھ ایک بڑا حویلی نما دروازہ اور بائیں ہاتھ ٹیلے پر چھوٹا سا خوشنما بنگلہ تھا جو غالباً" مہمانوں کے لیے مخصوص تھا.........

خوش قسمتی سے دروازہ کھلا تھا۔ یہی فہمیدہ کا گھر تھا.........

غلام محمد نے سرگوشیوں میں سمجھایا۔ "بنگلے کے اُس طرف کھیت ہیں۔ فہمیدہ کی حویلی کے مخالف سمت میں بھی کھیت ہیں۔ کوئی حادثہ پیش آئے تو کھیتوں کی طرف نکل بھاگیں۔ اس کے بعد اپنا رخ سامنے اونچے پہاڑ کی طرف کر لیں۔ میں گھر نہیں جاؤں گا بلکہ بنگلے کے اُس طرف جھاڑیوں میں آپ کا انتظار کروں گا!"

میں الفاظ میں اس سپاہی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا تھا.........

جب وہ بنگلے کے اس طرف چلا گیا اور میں حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا تو میرا دم رک رک رہا تھا۔ حلق خشک ہو چکا تھا، رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا لیکن برابر دبے قدم میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلی مڈ بھیڑ دو بھینسوں سے ہوئی جو تھان پر بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ ایک آدمی کچھرا سا پہنے ننگی کھاٹ پر ننگے جسم بھینسوں کے پاس سو رہا تھا۔ اس آدمی کے بالکل قریب سے گزر کر چار پانچ قدم آگے بڑھا۔ دائیں

بائیں لمبا کھلا صحن تھا۔ صحن کے اس طرف کھیت تھے۔ میرے بالکل سامنے تین چار گز پر دو چار پائیوں پر مچھر دانیاں لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے ان میں کوئی سو رہا تھا۔ دائیں ہاتھ پانچ چھ قدم پر چھ سات چار پائیاں ایک ہی قطار میں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر لوگ سو رہے تھے۔ بائیں ہاتھ دو تین قدم پر ایک چار پائی پڑی تھی اس پر بھی کوئی سو رہا تھا.......... ایک دو منٹ تو یہی سوچتے گزر گئے کہ کس طرف جاؤ کہاں، تلاش کروں۔ لیکن قدرت میری مدد کر رہی تھی۔ تقدیر اگر کوئی چیز ہے تو وہ میری پشت پر تھی۔ میں اکیلی بچھی ہوئی چار پائی کی طرف مڑا' وہاں دو لڑکیاں سو رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کی روشنی کو محدود کیا اور بے حد احتیاط سے بٹن دبایا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ فہمیدہ کی منجھلی بہن ہالہ تھی۔ ٹارچ غیر ارادی طور پر بجھ گئی۔ دو بارہ اسی احتیاط سے روشنی کا دائرہ محدود کر کے ٹارچ کا بٹن دبایا تو دل یکبارگی حلق میں آپڑا.........

یا اللہ.......... یہ فہمیدہ تھی.........!

روشنی پھر بجھ گئی.......... میں ایک منٹ تک خاموش کھڑا۔ اس معجزے پر حیران ہوتا رہا۔ واقعی کوئی طاقت میری مدد کر رہی تھی۔ یقیناً" اُس کے نزدیک یہ ملاپ بیحد ضروری تھا.......... اب یہ ڈر کہ جاگنے سے وہ ڈر نہ جائے۔ اس کے چہرے کے بالکل قریب زمین پر بیٹھ گیا اور منہ اس کے کان کے قریب لے جاکر ہولے سے کہا.........

"فہمیدہ!"

وہ سوئی رہی۔ اب میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر دو تین بار فہمیدہ' فہمیدہ کہا تو وہ "ہیں" کر کے چونکی۔ میں نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے سے کہا.........

"میں ہوں رحیم فہمیدہ' میں رحیم ہوں!"

وہ ہڑ بڑا کر اٹھی اور پاگلوں کی طرح میرے منہ' ہاتھ' سر اور گردن پر دیوانہ وار ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ اس کی گگھی بندھ گئی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی اور بے تابی سے میرے کندھوں'



بالوں' کانوں' باری باری ہر چیز کو ٹٹول رہے تھے۔ میں نے ایسی کیفیت زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی.......... یہ نہایت ہی بھرپور اور سچا ردِ عمل تھا.......... جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے تو اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اپنا سر میرے سر پر رکھ دیا اور بے اختیار رو پڑی.........

اس کی بہن بے خبر سو رہی تھی۔ جب اس کا رونا ہچکیوں کی صورت اختیار کر گیا تو میں نے جھنجھوڑ کر اسے خبردار کیا۔ "ہوش میں آؤ فہمیدہ' کوئی جاگ پڑے گا۔" وہ ذرا سا سنبھلی مگر اگلے لمحے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ میں نے ہولے سے کہا۔

"باہر چلو۔ اوپر بنگلے کے قریب بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"ہاں چلو چلو.........." وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر اگلے لمحے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "ٹھہرو اندر چلتے ہیں کمرے میں۔"

اس نے لپک کر تکیے کے نیچے سے چابی نکالی' تالہ کھولا اور بیحد احتیاط سے دروازہ کھول کر مجھے اندر لے گئی۔ دوبارہ دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ ٹارچ لے کر میرے چہرے پر روشنی ڈالی۔ میں نے آنکھیں بند کر دیں۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اور زارو قطار رونے لگ گئی۔ اس کی ہر حرکت محبت میں رچی ہوئی تھی۔

اندر کمرے میں شدید گرمی تھی مگر ہم متوالے بانہوں میں بانہیں ڈالے ساری رات لیٹے باتیں کرتے رہے۔ ماں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ہماری محبت کا سارا نزلہ ماں پر گرا ہے۔ سب رشتہ داروں نے کرنل پر دباؤ ڈال رکھا ہے کہ اسے طلاق دے دیں کیونکہ جو کچھ ہوا ہے' اس کی مرضی اور ایما پر ہوا ہے' گرچہ ابھی تک طلاق نہیں ہوئی مگر وہ میکے میں ہے' مجھے یہ سب سن کر بے حد رنج ہوا.......... فہمیدہ نے کہا۔

"ماں کا خیال نہ ہوتا تو میں کب کی آپ کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے' جتنی توہین ہوئی ہے اور جس جس انداز میں ہوئی ہے' اس کے بعد بھی ان لوگوں میں رہنا گویا ڈھٹائی اور بے غیرتی کی انتہا ہے۔ مگر میں چپ رہی برداشت کرتی

رہی کہ ماں کے مستقبل کا تقاضا تھا' چھوٹی بہنوں کا سوال تھا۔ جہاں تک میری محبت کا مسئلہ تھا' میں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ محبت کے اعتراف میں مجھے کبھی جھجک نہ ہوئی۔ جس نے بھی پوچھا' ڈٹ کر جواب دیا۔ ہر الزام کو درست تسلیم کیا اور تسلیم و رضا پر فخر کیا کیونکہ یہی تو ایک پونجی تھی جو میرے لئے باعثِ افتخار تھی' جس پر میں ناز کر سکتی تھی......... رحیم صاحب' کل میں اس رشتہ دار عورت کو بتاؤں گی کہ آپ آئے تھے۔ اس عورت نے مجھے طعنہ دیا تھا کہ جس پٹھان کا اس بے شرمی سے نام لیتی ہو، سال چھ مہینے میں آیا نہیں۔تم جیسی کنجری پر کون تھوکتا ہے۔ اب صبح اسے بتاؤں گی۔ وہ جیالا پٹھان آیا تھا' اکیلا آیا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے مردوں کے بیچوں بیچ اپنی محبوبہ کو کھاٹ سے اٹھا کر' رات بھر اس کی بانہوں میں ڈالے رہا........."

میں نے کہا......... "اس طرح تو تم اپنے لیے اور خطرے کھڑے کر دو گی۔"

"کوئی پروا نہیں۔ وہ جوش سے بولی۔"مجھے اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں۔ آپ کا خیال نہ ہوتا تو میں اسی وقت باہر نکل کر سب کو جگاتی اور کہتی لو دیکھو' میرے پہلو میں کون کھڑا ہے......... رحیم صاحب' میں آج ہی کے دن کا انتظار کر رہی تھی۔ میری زندگی میں آج سے بڑا دن نہیں آئے گا......... آج کا دن میری زندگی کی معراج ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلی جاتی۔ شادی ہو جاتی' پھر بھی وہ سب کچھ آج کے مقابلے میں بہت کم ہوتا کیونکہ جو قدم آپ نے اٹھایا ہے۔ جس جرأت اور حوصلہ کا ثبوت دیا ہے' ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ تو زندگی کو داؤ پر لگا چکے ہیں۔ آپ تو پل صراط عبور کر کے مجھ تک پہنچے ہیں۔ میں اس فخر کو کیسے چھپا سکتی ہوں۔ کل ہی سب جان جائیں گے کہ اگر میں نے محبت کی تھی تو کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ جس کے لیے مروں گی' اس کے لیے مرنے میں بھی ایک شان ہے!"

میں نے اس انتہا پسند لڑکی کو سینے سے بھینچ بھینچ لیا۔ اس کے دعوے کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ یہ عجیب و غریب رات جو ہر ترغیب سے خالی تھی اور اب ختم ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بتادیا تھا کہ مرغ کی پہلی بانگ پر مجھے کوچ کرنا ہوگا اور جب مرغ نے پہلی بانگ دی تو وہ چونکی.........



"یااللہ خیر.........!"

میں ہنس پڑا تو وہ بولی......... "تین ماہ پیشتر میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپ ملنے آئے ہیں۔ جانے کیا حادثہ ہوا کہ جونہی آپ باہر نکلے' شور برپا ہوا۔ سارا گاؤں آپ کے پیچھے لگ گیا۔ آپ بھاگ رہے ہیں اور لوگ آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ پھر ایک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی.........؟"

میں نے اسے پیار کیا......... تسلی دی۔ وہ کاپی پنسل اٹھا کر لے آئی اور مسکرا کر بولی۔"جو میں کہوں گی لکھیں۔"

میں نے ہنس کر کہا......... "کہو!"

"لکھیں.........!

میں آیا تھا......... میں آتا ہی رہوں گا.........

میری اور فہمیدہ کی محبت میں کوئی طاقت آڑے نہیں آسکتی.........'

میں نے لکھ دیا......... تو وہ بولی......... "ٹھیک ہے۔ دستخط کر دو۔"

میں نے دستخط ثبت کردیئے۔ پھر اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور بولی.........

"اس پر بھی دستخط کر دو۔"

میں نے اس پر بھی دستخط کر دیئے تو اس نے میرا رومال بھی لے لیا۔ میرے ریوالور کیس سے دو گولیاں بھی نکال لیں۔ پوچھا۔ "ریوالور کا بور کیا ہے؟"

میں نے کہا......... "بتیس بور۔"

بولی......... "بالکل ٹھیک' ابو کے ریوالور کا اڑتیس ہے۔ اب میں اس سے کہہ سکوں گی کہ یہ ابو کے ریوالور کی گولیاں نہیں ہیں اور ہاں یہاں میرے رخسار پر دانت گاڑ دو........."

میں نے یہ بھی کر دیا۔ ٹارچ کا بٹن دبایا تو دیکھا' اس کے گلابی رخسار پر میرے دانتوں کی گہری مہر لگ چکی تھی.........

گاؤں کے مرغ بانگ پر بانگ دے رہے تھے۔ اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔

ہالہ کی چارپائی تک میرے ساتھ آئی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ باہر اسی طرح اندھیرا تھا۔ پَو پھٹنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے اس کی پیشانی چومی اور پھر اس سوگوار لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر اسی احتیاط کے ساتھ باہر نکل گیا.........

بنگلے کے قریب پہنچ کر نیچے کھیتوں کی طرف ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ اسی لمحے غلام محمد نے کھانس کر اپنی ثابت قدمی اور موجودگی کا احساس دلایا۔ میں جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا' آواز کی طرف گیا۔ ٹارچ کا بٹن دوبارہ دبایا۔ غلام محمد میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے لپک کر اسے گلے لگایا۔ میری کامیابی پر وہ بہت خوش تھا۔ بے حد خوش۔ ایک طرح سے یہ خود اس کی بھی کامیابی تھی۔ شام تک ہم دونوں واپس جی ایچ کیو پہنچ گئے۔

کافی دن تک مجھ پر اس ملاقات کا نشہ طاری رہا۔ رات کو بستر میں لیٹتا تو ایک ایک کر کے تمام جزئیات آنکھوں کے سامنے آجاتیں۔ نوشہرہ کی معصوم فہمیدہ' ایک سال کی جدائی کے بعد کس قدر جوشیلی' جذباتی اور دلیر ہوگئی تھی۔ اس نے محبت کے لیے سب کچھ تج دیا تھا اور اعلانیہ اعتراف کرتی تھی اور اس پر فخر کرتی تھی۔ میں سوچتا تھا' مجھ سے جو عبارت لکھوائی تھی' نوٹ پر دستخط لیے تھے' رومال' ریوالور کی گولیاں اور رخسار پر محبت کی مہر تو دوسرے دن کیا طوفان اٹھا ہوگا اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا.........؟!!

بہرحال یہ تو طے تھا کہ ان مصیبتوں کو وہ خود گلے لگارہی تھی اور اسی میں اس کی خوشی تھی' اسی میں اسے تسکین مل رہی تھی۔ ممکن ہے بعض اقدار پسند لوگ اسے منفی رویہ کہیں......... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فہمیدہ جیسی بے زبان اور معصوم لڑکی ایسا رویہ اختیار کرنے سے پہلے کن کن اذیتوں سے گزری ہوگی۔ کسی کو کیا علم کہ جن لوگوں نے اسے خودسری پر مجبور کیا' انہوں نے اس پر کیا کیا الزام لگائے ہوں گے' کیا کیا ستم ڈھائے ہوں گے......... ظاہر ہے کہ جب احترام و اعتماد کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور گھٹن کی انتہا ہو جاتی ہے تو ردِ عمل یقین ہو جاتا ہے۔ پھر جو اظہار ہوتا ہے' اس میں زور ہوتا ہے' شدت ہوتی ہے اور ایسے اظہار کا توڑ ڈھونڈنا ناممکن ہو جاتا ہے......... میں سمجھتا ہوں کہ فہمیدہ کا ردِ عمل بالکل فطری تھا.........



اور اب صورت حال یہ تھی کہ اس نے جو دعوے کئے تھے' وہ سچ نکلے۔ جس شخص کے لیے بدنام ہوئی تھی' وہ اس کے لیے مرنے کو تیار تھا اور یہی اسے بتانا تھا کہ اس کا تعلق خاطر محض جنسیت پر مبنی نہیں تھا۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس کا اظہار اور اس کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ جس معاشرے میں محبت کے تقدس کو تسلیم نہیں کیا جاتا' جس ماحول میں محبت کے پنپنے کے مواقع کچل دیئے جاتے ہیں وہاں محبت کا ڈھنڈورا پیٹنا کوئی معنی نہیں رکھتا......... اکثر دیکھا گیا ہے کہ محبت کی صداقت ہمارے سماج میں منفی نتائج پر ختم ہوتی ہے.........

تقریباً" دو ماہ بعد سپاہی غلام محمد کی معرفت فہمیدہ کا خط ملا۔ یہ خط جتنا دلچسپ تھا......... اتنا ہی درد انگیز بھی.........

لکھا تھا.........

رحیم صاحب!

لیجئے۔ میں اس قابل ہوئی کہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ ان لوگوں نے تو مجھے اپنے طور پر مار ڈالا تھا لیکن تقدیر میرے ساتھ تھی۔ ان کو مزید نیچا دکھانے کی خاطر زندگی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہر تین ماہ کے بعد آپ کو بلاؤں اور پھر تین ماہ کے لیے زندہ درگور کر دی جاؤں۔ ایک رات محبوب کی آغوش میں گزاروں اور تین ماہ مشقِ ستم بنی رہوں......... اور یوں زندگی بیت جائے.........!

رحیم صاحب......... میں نے وہی کیا جو آپ سے کہا تھا......... صبح سب سے پہلے لوگوں نے وہ چاند دیکھا جو رخسار پر طلوع ہوا تھا۔ سب سے پہلے ہالہ نے پوچھا......... میں نے آپ کا نام لیا تو بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر دوسری نے' پھر تیسری نے۔ پھر ہر ایک کی نظر پڑتی گئی......... سب گونگی ہوگئی تھیں۔ کسی

کو پوچھنے کی جرات نہ ہوئی کیونکہ آپ کے رومال کی خوشبو نے سب کو مسحور کر لیا تھا۔ سرگوشیاں ہوئیں۔ بات مردوں تک پہنچی۔ کسی نے رائفل اٹھائی۔ کسی نے تلوار' کسی نے ہاتھ چلایا' کسی نے ٹھوکر ماری میں گیند کی طرح لڑھکتی رہی اور کہتی رہی' وہ آیا تھا۔ وہ آیا تھا۔ وہ آتا ہی رہے گا!!

سب مار مار کر ہار گئے۔ میں مار کھا کھا کر نہ ہاری۔ میں نے دیکھا۔ موت کا خوف نہ رہے تو انسان کی طاقت دو چند ہو جاتی ہے۔ آپ کے ریوالور کی گولیاں چھین لی گئیں۔ آپ کی تحریر پھاڑ دی گئی۔ آپ کا رومال جلا دیا گیا۔ رخسار پر طلوع ہونے والا چاند خون میں ڈوب گیا......... لیکن انہیں کون سمجھائے کہ میری روح میں جو نام تحلیل ہو گیا ہے' اسے کون کھرچ سکتا ہے۔ ایک ہالہ ہی ہے جو میری روح کا روگ جانتی ہے' اسی نے میرے زخموں پر پھاہے رکھے۔ وہی میرے دکھ بانٹتی ہے' اسی نے مجھے بچایا ہے۔ اب کی آپ آئیں تو اسے ضرور ملنا۔ اسے کتنی تمنا ہے' آپ کو دیکھنے کی.........

اگر ان لوگوں نے مجھے مار ڈالا تو پھر وہی آپ سے پیار کرے گی۔ یہ بات ہم دونوں بہنوں میں طے ہو چکی ہے۔ وہ بھی میری طرح آپ پر نچھاور ہو جائے گی۔ یہ بھی پہلی مثال ہو گی کہ ایک بہن نے پیار کیا دوسری نے اس کی حفاظت کی......... پہلی بہن ہار گئی' دوسری نے اسے پروان چڑھایا۔ یقین کیجئے' جس دن میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی' ہالہ آپ کے پاس پہنچ جائے گی.........!!

آپ میرے خط کا جواب نہ دیجئے گا۔ چند دنوں تک میں آپ کو دوسرا خط لکھوں گی۔ صرف اتنا پیغام بھیج دیجئے کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہے۔

* *

فہمیدہ کا خط پڑھ کر میری کیفیت عجیب ہو گئی تھی۔ یہ خوشی اور غم کی دوہری کیفیت تھی۔ دل بھرا بھرا سا' آنکھوں میں آنسو مگر شادکامی کا نشہ بھی تھا۔ ناقابل فراموش اور ناقابل بیان مسرت کی یلغار تھی......... پیار کا یہ عجیب انداز کہ میں ہار گئی تو میری بہن میرے پیار کو پروان چڑھائے گی۔ یعنی وہ لڑکی جو سن بلوغ کو ابھی چھو رہی تھی۔ پیار کے معاملے میں بڑی بہن کی طرح پختہ تھی.........

گویا چراغ سے چراغ جلتا رہے گا.........

انہی دنوں کی بات ہے۔ صدر بازار میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اپنا ایک ہم جماعت ریاض شاہ مل گیا۔ ریاض شاہ کا چچا ہمارے گاؤں میں تھانیدار تھا۔ غالباً" چھٹی یا ساتویں کلاس میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ ان دنوں وہ ایم ای ایس میں اوورسیئر تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس کا گاؤں فہمیدہ کے گاؤں سے میل ڈیڑھ میل دور تھا۔ اس امداد کو میں نے غیبی امداد سے تعبیر کیا۔ جونہی میں نے فہمیدہ کے باپ کا نام لیا وہ چونکا۔ دو چار لمحے سوچنے کے بعد بولا.........

"ارے تم وہی تو نہیں ہو جس سے کرنل کی لڑکی نے پیار کیا تھا؟"

میں ہنس پڑا........." فرض کرو' میں وہی ہوں......... مگر تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"واہ! وہ تو سارا علاقہ جانتا ہے۔ کرنل کی آرٹلری کا ایک کیپٹن میرا کلاس فیلو ہے۔ اس نے مجھے ساری تفصیل بتائی ہے.......... مگر وہ لڑکی بے حد جی دار ثابت ہوئی۔ زبردست دباؤ کے باوجود ابھی تک کسی سے شادی پر آمادہ نہیں ہوئی۔"

"تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں.......... میں اسے کہاں دیکھتا۔ بس شہرت ہی سنی ہے۔"

"اچھا میں تجھے دکھاؤں گا۔ اس کا ایک خط پڑھ کر ہی اندازہ کر لینا کہ وہ کیا لڑکی ہے۔"

وہ مصر ہوگیا اور اسی وقت خط دیکھنے کے لیے ضد کرنے لگا۔ میں اسے ساتھ لے گیا۔ صندوق میں تہہ در تہہ رکھے ہوئے خطوط میں سے فہمیدہ کا آخری خط نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے خط ایک بار پڑھا۔ دوسری بار پڑھا۔ اب وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ دراصل اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ آہستہ سے بولا..........

"اگر تم پسند کرو تو یہ سارے خطوط آج رات کے لیے مجھے دے دو۔ کل لوٹا دوں گا۔"

میں نے بنڈل پکڑاتے ہوئے کہا "یاد رکھو۔ یہ ایک معصوم لڑکی کی امانت ہے!"

اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اگلے دن وہ آیا تو میں نے اس سے کہا..........

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس بار تم میرے ساتھ جاؤ گے اور میں تمہارے گھر ٹھہروں گا۔"

"ہاں ضرور۔" وہ بے حد یقین سے بولا۔ "اس یکتائے محبت لڑکی کی خاطر مرنا عین ثواب ہے۔ جب چاہو چلو۔ جب بھی آواز دو گے، حاضر پاؤ گے!"

غالباً دسمبر کا مہینہ تھا کہ فہمیدہ کا ایک اور خط آیا۔ اس نے مجھے بلایا تھا۔ لکھا



تھا، آپ ضرور آئیں۔ یہ فیصلہ کن ملاقات ہوگی یا تو میں مستقل آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی یا ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔ ان دونوں میں سے جو فیصلہ بھی ہوگا، اس کا کلی اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس خط سے جہاں مجھے مسرت ہوئی کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گا کیونکہ فیصلے کا اختیار میرے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا، وہاں ایک دبی دبی سی تشویش بھی موجود تھی کہ بچھڑنے کی بھی آخر کوئی بنیاد ہوگی۔ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ میں یہ خط لے کر ریاض شاہ کے پاس پہنچا۔ خط پڑھ کر وہ فوراً تیار ہوگیا۔ دوسرے دن پانچ پانچ دن کی چھٹی لے کر ہم دونوں روانہ ہوگئے۔ شام تک ان کے گاؤں پہنچ گئے۔ میں اسی رات فہمیدہ سے ملنے پر بضد تھا مگر ریاض شاہ نہیں مان رہا تھا۔ اس کا خیال تھا، صبح اسے اطلاع کریں گے تاکہ وہ تیار ہو سکے۔ سنبھل سکے اور کوئی ضروری انتظام کرنا ہو تو کر سکے۔ اس کا خیال صحیح تھا مگر میں اپنی بے چینی کا کیا کرتا۔ محبوب مجھ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا اور ہر لمحہ میرے لیے پہاڑ بن رہا تھا.......... لیکن ریاض شاہ جتنا نڈر آدمی تھا، اتنا ہی محتاط اور ہوشیار بھی تھا۔ اس نے مجھے جانے نہ دیا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ فہمیدہ کو رقعہ لکھا۔ ریاض شاہ کی دو بھانجیاں فہمیدہ کے گاؤں کے گرلز سکول میں پڑھتی تھیں۔ وہیں فہمیدہ کی چھوٹی بہنیں بھی پڑھتی تھیں۔ چھٹی کے بعد یہ دونوں بچیاں فہمیدہ کی بہنوں کے ساتھ ان کے گھر گئیں۔ چار بجے فہمیدہ کا رقعہ لے کر واپس آگئیں..........

سب معاملات ٹھیک تھے۔ فہمیدہ چشم براہ تھی۔ البتہ ہدایت کی گئی تھی کہ گلی کی طرف کا بڑا دروازہ بند ہوگا اور میں گلی کے نکڑ سے مڑ کر کھیتوں کی طرف سے آؤں۔

ریاض شاہ نے اس شام بے حد پر تکلف کھانا پکایا تھا مگر میری جذباتیت کا یہ عالم کہ بھوک کا کوسوں دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ میری کیفیت دیکھ کر وہ محظوظ ہو رہا تھا اور دیکھ رہا کہ طویل عرصے کے بعد محبوب سے ملنے کا سچا ردعمل کیا ہوتا ہے۔

شدید اصرار کے باوجود اس نے مجھے اکیلے نہ جانے دیا۔ سردی کے دن تھے۔ اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ایک جیب میں ٹارچ تھی اور دوسری میں ریوالور.......... تقریباً دس

بجے ہم وہاں پہنچ گئے۔

گاؤں میں مکمل سناٹا تھا۔ ریاض شاہ ضد کررہا تھا کہ وہ صبح تک پہرہ دے گا لیکن بصد اصرار و تکرار اسے واپس بھیج دیا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر کھیتوں کی طرف سے ہوتا ہوا، جب میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ درِ محبوب پر دستک دی تو اگلے لمحے منتظر فہمیدہ نے دھیرے سے کنڈی کھول دی اور احتیاط سے دروازہ کھول دیا۔ میں اس پر عقاب کی طرح جھپٹا اور آغوش میں سمیٹ لیا.........

کچھ دیر بعد اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبا کر اپنی مظلوم محبوبہ کو دیکھا۔ جس نے تہمتوں، ملامتوں کے علاوہ ڈھیر سارے جسمانی اور روحانی مظالم سہے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی اور بہت خوش تھی۔ اس کی گردن پر اور پیشانی پر زخموں کے ہلکے ہلکے نشان تھے۔ میں نے ان مندمل نشانوں پر عقیدت سے باری باری ہونٹ رکھے۔ اب اس نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے کر روشنی مجھ پر ڈالی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ کافی دیر تک اس نے بٹن دبائے رکھا۔ پھر نہایت سکون اور تسلی سے اپنا سر میری چھاتی پر رکھ دیا.........

کمرے کی غربی دیوار کے ساتھ بستر لگا ہوا تھا اور اس پر براق چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس سفید چادر پر کوئی داغ نہیں تھا......... ہم دونوں لیٹ گئے اور دیر تک ایک دوسرے کو چومتے رہے۔ اچانک اس نے ٹارچ اٹھا کر گھڑی میں وقت دیکھا اور چونک کر بستر میں اٹھ بیٹھی.........

" ساڑھے گیارہ بج گئے۔ رات بیت رہی ہے اور ہم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا؟"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر لٹا دیا اور آغوش میں لے کر کہا.........

"اچھا سناؤ، کیا بات تھی؟"

" وہ میرے بالوں میں ہاتھ ڈبوتے ہوئے بولی.........

" آپ تو جانتے ہی ہیں کہ رشتہ داروں کے دباؤ پر ابا نے ماں کو گھر سے نکال دیا



تھا۔ اب جب کہ ان کو یقین آگیا ہے کہ وہ زبردستی مجھے شادی پر مجبور نہیں کرسکتے تو ان لوگوں نے ایک اور پینترا بدلا ہے۔ میرے سامنے شرط رکھی گئی ہے اگر میں شادی پر رضا مند ہو جاؤں تو ماں واپس آجائے گی۔ اس کا اجڑا ہوا گھر دوبارہ بس جائے گا اور اگر حسبِ سابق انکار کیا تو اس کو طلاق ہو جائے گی۔ ظاہر ہے آپ سے مشورہ کئے بغیر میں فیصلہ نہیں کرسکتی تھی چنانچہ اب صورتِ حال یہ ہے اگر آپ محبت کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ میں اسی وقت آپ کے ساتھ چل پڑوں گی اگر آپ ماں کا خیال رکھتے ہیں تو پھر مجھے ان لوگوں کی مرضی کے مطابق شادی کرنا ہوگی........."

معاملہ بے حد سنجیدہ تھا۔ فہمیدہ نے ایک طرح سے مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ گو فیصلہ میرے ہاتھ میں تھا مگر غیر شعوری طور پر مجھے احساس ہوا کہ ایک بار پھر تقدیر نے پانسہ پلٹ دیا ہے۔ فہمیدہ نے میرے بالوں سے ہاتھ نکال کر میرے چہرے پر رکھ دیا اور پیار سے تھپتھپاتے ہوئے بولی.........

" آپ چپ کیوں ہوگئے۔ فیصلہ میرے نہیں آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتی ہوں آپ جو فیصلہ کریں گے اس پر اسی وقت اور اسی لمحے عمل ہوگا۔ دنیا میں کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز ہو!"

" جانم!" میں نے اسے بے حد عقیدت سے چومتے ہوئے کہا "تمہیں بچاتا ہوں، خود کو بچاتا ہوں تو اس بے گناہ عورت کا مستقبل ختم ہو جاتا ہے، جس نے ہمارے پیار میں رخنہ ڈالنے کی بجائے پروان چڑھایا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ماں بچتی ہے تو تم تباہ ہو جاؤ گی۔ ہم دونوں کے خواب بکھر جائیں گے۔"

" رحیم صاحب، جب اس شرط کے بارے میں ماں کو علم ہوا تو اس نے کہلوا بھیجا۔ 'بیٹی! میری پروا نہ کرنا جو ہونا تھا ہو چکا۔ میرا اور تمہارے ابو کا اعتماد اب بحال نہیں ہوگا......... تم اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ جہاں تیرا جی چاہے چلی جا۔ جہاں تیری روح بستی ہے وہیں جا کر بسیرا کر!'

" ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" میں جذباتی ہو گیا۔ "ایک ماں کا یہی فخر ہوتا ہے، یہی

ماں کا کردار ہوتا ہے........مگر ہمارا فرض کیا ہے کہ سب کچھ سمیٹ لیں اور اس عظیم ماں کو تنہا چھوڑ دیں۔ ابھی تمہاری دو بہنیں اور ہیں۔ کیا ہم ان دونوں کو بھی ماں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ کر دیں گے؟ کیا ہم اس خاندان کو سدا کے لیے بکھیر دیں گے؟ نہیں، فہمیدہ نہیں، ہم ایسا نہیں کریں گے۔ تم ماں کو واپس لے آؤ۔ اس گھر کو پھر سے بسالو۔ ہاں تم ان کی مرضی کی شادی کر لو!"

فہمیدہ ایک لمحے کے لیے چونکی۔ پھر مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "یہی ہونا تھا مجھے اپنے مقدر کا پتہ تھا!"

"تو کیا تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"منظور ہے، منظور ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ میرا مقدر ہی یہی ہے۔ میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کو کیسے مٹا سکتی ہوں۔"

"فہمیدہ یہی درست فیصلہ ہے۔"

"بالکل درست ہے۔ وہ رو رہی تھی۔ "یہ ایک شریف آدمی کا فیصلہ ہے۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ فخر کروں گی کہ میں نے غلط آدمی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔"

"فہمیدہ، تم سے بچھڑ کر مجھ پر جو بیتے گی، مجھے اس کا شدید احساس ہے لیکن میں ضبط کروں گا۔ اپنے آپ پر جبر کروں گا۔ خود کو یہ سمجھا کر صبر کروں گا اگر کوئی ہماری خاطر بربادیوں کو گلے لگا سکتا ہے تو ہم بھی ان کی خاطر محرومیوں کو اپنا سکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے ایسا ہی ہوگا۔"

جب وہ رو رو کر تھک گئی اور اس کے دل کا غبار قدرے ہلکا ہوا تو میں نے اسے سینے سے دباتے ہوئے کہا۔

"آج ہم جی بھر کر پیار کریں گے۔ آج ہماری ملن کی آخری رات ہے۔"

"ہاں۔" وہ دعوے سے بولی "نوشہرہ کی ملاقاتوں میں جو کچھ بچایا تھا، آج اس کی حفاظت نہیں کروں گی کیونکہ اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ میں نے سب کچھ اپنی محبت پر نچھاور کر دیا ہے........ لیکن یہ ہماری ملن کی آخری رات کیوں ہوگی۔ ابھی تو



آپ تین چار دن یہیں ہیں۔ جب تک آپ کی چھٹی باقی ہے۔ آپ ہر رات آئیں گے۔"

"ہاں آؤں گا، ضرور آؤں گا۔ تمہاری قربت کی یہ تین راتیں میرے لیے تین صدیوں کی مسرتوں سے کم نہیں ہیں۔"

چنانچہ مس سارا اور گیتا کے بعد فہمیدہ تیسری لڑکی تھی، جس نے مجھے جیون کے امرت رس سے شاد کام کیا۔ اور یوں زندگی کی ایک بے حد خوبصورت رات ختم ہو گئی!

صبح کاذب، جب میں کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو فہمیدہ نے مجھے روکا۔ "ہالہ سے مل کر جائیں۔ اس نے سخت تاکید کی تھی۔"

ہم دونوں دوسرے کمرے میں گئے۔ ہالہ کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی سو رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی سے اس لڑکی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور منہ سکیڑتے ہوئے بولی۔

"کیا ہے باجی، کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں سو جا........" فہمیدہ نے اسے ڈانٹا اور ہالہ کو کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ میں نے اسے بغل میں لے کر پیار کیا۔ ٹارچ جلا کر دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی اور شرما رہی تھی۔ اس کا قد خاصا بڑھ گیا تھا۔ وہ لڑکپن کی حدود پھاند کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے دو چار باتیں کیں مگر وہ جواب دینے کی بجائے ہنستی رہی۔ آنکھیں اٹھاتی لمحہ بھر دیکھتی اور پھر آنکھیں جھکا لیتی........

فہمیدہ ہنستے ہوئے بولی........ "صبح سے کتنی خوش تھی۔ بار بار آپ کا ذکر کرتی رہی اور اب بات نہیں کرتی، ہنسے جاری ہے۔"

ہالہ نے مسکراتے ہوئے لب سکیڑے۔ ایک لمحہ بہن کو دیکھا، پھر میری طرف، پھر حسب معمول شرما کر گردن نیچے کر لی۔ میں نے ہنس کر کہا........،

"اچھا تو پھر ہم جاتے ہیں۔ کل تم سے باتیں کریں گے۔"

فہمیدہ نے احتیاط سے دروازہ کھولا اور میرے ساتھ باہر نکل آئی۔ باہر خاموشی اور تاریکی تھی۔ البتہ ستارے جاگ رہے تھے۔ فہمیدہ میرے سینے سے لگتے ہوئے بولی۔ "شام کو

ضرور آیئے گا۔"

"آؤں گا.........!" میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بے تحاشہ چوما اور پھر آخری بار اس کی روشن پیشانی پر بوسہ دے کر رخصت ہوگیا۔

واپس پہنچا تو پو پھٹ رہی تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ ریاض شاہ نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ مسکرا کر گلے لگایا۔ لالٹین کی بتی اٹھا کر رات کی روئداد سنی۔ بہت خوش ہوا اور اس فیصلے کو بہت سراہا کہ ہم نے ماں کی خاطر سینوں پر پتھر رکھ لیے ہیں۔ دوپہر کو جب اس نے کھانے کے لیے اٹھایا تو فہمیدہ کا یہ پیغام بھی سنایا کہ گھر والوں کو شک ہوگیا ہے اور میں شام کو فہمیدہ کے ہاں نہ جاؤں.........

مجھے اس خبر سے شدید مایوسی ہوئی۔ ابھی تین دن کی چھٹی باقی تھی۔ گذشتہ رنگین رات کا نشہ ابھی تک طاری تھا اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ ابھی میں نے فہمیدہ کا آخری بوسہ نہیں لیا تھا اور نہ اسے الوداعی سلام کہا تھا۔ میرا ردِعمل دیکھ کر شاہ نے رات کے لیے گانے بجانے کا اہتمام کیا۔ خوب محفل جمی مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا' توں توں میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا اور فہمیدہ کے پاس پہنچنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اب میرے دل میں یہ خیال بھی آرہا تھا' ممکن ہے فہمیدہ نے پیغام نہ بھیجا ہو اور شاہ محض حفظِ ماتقدم کے طور پر مجھے روک رہا ہو۔ لہٰذا میرے ذہن میں فتور آگیا اور شاہ کے کان میں محفل ختم کرنے کو کہا.........

سب لوگ چلے گئے۔ ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ میں نے شاہ سے کہا.........

"تم مجھے رسیوں میں جکڑ دو تو بھی رسیاں تڑوا کر چلا جاؤں گا۔ فہمیدہ میرا انتظار کر رہی ہے!"

شاہ نے بہت سمجھایا۔ منت سماجت کی لیکن جب میرے تیور دیکھے تو خود بھی جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اب خوشامد کی میری باری تھی آخر میری ضد کے سامنے وہ ہار گیا۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے کوٹ پہنا' ریوالور لوڈ کیا اور خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ پلک جھپکتے میں ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے ہوگیا۔ لیکن یہ سفر تو وہ سفر تھا'



جس کا خواب فہمیدہ نے چھ ماہ پیشتر دیکھا تھا اور مجھے سنایا تھا آج اس کی تعبیر کا دن تھا۔

ابھی میں فہمیدہ کی دہلیز سے چار پانچ قدم دور تھا۔ دروازے کے سامنے کوئی سایہ نظر آگیا۔ سوچا' فہمیدہ کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ ٹارچ کا بٹن دبایا تو سیاہ پتلون اور سفید قمیض میں ایک دبنگ جوان کھڑا ملا۔ میں فوراً" پیچھے مڑا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "کون ہے؟"

میں جواب دیئے بغیر کھیتوں کی طرف اتر گیا۔ وہ میرے پیچھے بھاگا اور بلند آواز سے "چور چور" کہتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ میں نے ریوالور نکالا اور مڑتے ہوئے ہوا میں فائر کر دیا۔ وہ پیچھے کو بھاگا اور دیوار کے اوٹ ہوگیا۔ دراصل اسے نشانہ بنانا مقصود نہیں تھا لیکن اس کے شور سے سارا گاؤں جاگ اٹھا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اب سوائے بھاگنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لوگ لالٹین اور ٹارچیں لے کر باہر نکل آئے اور میرا پیچھا کرنے لگے۔ میں نے گلی کی بجائے کھیتوں کا رخ کیا۔ ایک کھیت کے منڈیر پر کانٹے دار جھاڑی کی اونچی باڑھ تھی۔ میں نے اسے اس طرح پار کیا' جیسے تیراک پانی چیر کر نکلتا ہے۔ زندگی تھی کہ کنوئیں میں گرنے سے بچ گیا جہاں سے میں گزرا تھا وہاں سے کنوئیں کا کنارا فٹ ڈیڑھ فٹ دائیں طرف رہ گیا تھا۔ پینتیس چالیس آدمی میرا پیچھا کر رہے تھے اور میں کوئی خاص رخ متعین کئے بغیر نامعلوم سمت میں بھاگا جا رہا تھا۔ چار پانچ سو گز تک یہ لوگ میرا پیچھا کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ نو جوان میرے قریب آگئے تھے۔ یہی وہ فیصلہ کن لمحے تھے کہ میں خود کو ان کے حوالے کرتا اور تکہ بوٹی ہو جاتا اور یا یہ کہ سامنا کرتا' مقابلہ کرتا اور مرجاتا۔ کسی کو عمداً" گولی مارنے کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ میں محبت کا راہی تھا' ڈاکو یا قاتل نہیں تھا۔ چنانچہ اگلے لمحے کھیت کے منڈیر کی آڑ لے کر اندھا دھند ہوائی فائرنگ شروع کردی۔ وہ نو جوان جو مجھ سے دس بارہ قدم دور تھے' پیچھے کو بھاگے۔ کسی نے کہا.........

"اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں!"

اب لالٹینیں اور ٹارچیں واپس گاؤں کی طرف بھاگی جارہی تھیں۔ میں نے ریوالور دوبارہ لوڈ کیا اور ہوائی فائرنگ جاری رکھی......... خطرہ ٹل چکا تھا۔ فہمیدہ کے خواب کی

تعبیر سامنے آگئی تھی۔

مگر اے کاش! زندگی کے پاس اس سے زیادہ مہربانی کرنے کا ظرف ہوتا۔ وہ مجھے موقع دیتی اور میں فہمیدہ سے کہتا۔ ”سچے لوگوں کے خواب ہمیشہ سچے ہوتے ہیں!“

جب میں واپس شاہ کے گاؤں کی طرف جارہا تھا تو طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ ایک تو یہی کہ فہمیدہ نے کتنا سچا خواب دیکھا تھا۔ ہم یقیناً“ سچے تھے کہ چھ ماہ بعد پیش آنے والے واقعے کی خبر ہمیں چھ ماہ پیشتر ہوگئی تھی۔ دوسرا یہ کہ آج میں نے نیا جنم لیا ہے۔ کنوئیں سے بال بال بچنا‘ چالیس آدمیوں کے نرغے سے صاف نکل جانا گویا قدرت کو مجھ سے کوئی کام لینا مقصود ہے.......... اور تیسرا یہ کہ فہمیدہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں تو اب زندگی میں کیا باقی رہ گیا ہے۔ وہ مقصد کیا ہو سکتا ہے جس کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے ؟“

شاہ کے گاؤں میں مزار پر چراغ جل رہا تھا۔ دو تین میل کا چکر کاٹ کر اب میں نے اسی چراغ کا رخ کر لیا تھا۔ تقریباً“ دو بجے واپس آگیا۔ شاہ نے حیرت و پریشانی سے ساری کہانی سنی تو بولا۔ ”اب کیا کرنا چاہیے؟“

” اسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ میں نے رائے دی۔ ”بات یہ ہے کہ فہمیدہ تو مرتے دم تک راز افشا نہیں کرے گی لیکن ہالہ پر سختی کی گئی تو ممکن ہے بات نکل جائے اور میرے ساتھ تم لوگ بھی پھنس جاؤ!“

ریاض شاہ نے اثبات میں سر ہلایا اور فوراً“ تیار ہوگیا۔ صبح جب سورج طلوع ہو رہا تھا تو ہم ایک پہاڑی راستے کے ذریعے پکی سڑک پر نکل آئے۔ شاہ نے مجھے راولپنڈی جانے والی بس پر بٹھایا اور خود وہیں گاؤں کی طرف جانے والی بس کے انتظار میں بیٹھ گیا..........

تقریباً“ گیارہ بجے میں واپس یونٹ پہنچا تو سب حیران تھے کہ ابھی تو دو دن کی چھٹی باقی ہے اور میں آگیا ہوں۔ کھیت کی باڑھ عبور کرتے وقت سینکڑوں کانٹے میرے ہاتھوں‘ ٹانگوں اور رانوں میں چبھ گئے تھے اور ان میں جلن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے تک اردلی سوئی



سے میرے جسم پر چبھے ہوئے کانٹے نکالتا رہا.......... اس سے اس کی نفسیات بھی دیکھنے کے لائق تھیں۔ وہ کانٹا نکال کر قلمی انگلی کے آخری پور پر رکھتا‘ پھر کنکھیوں سے میری طرف دیکھتا جیسے پوچھ رہا ہو..........

” صاحب جی‘ یہ ایک ہزار ایک کانٹے کہاں سے چبھو کر لائے ہو؟“

لیکن جب میں اس کی طرف دیکھتا تو وہ جھٹ سے نگاہیں پھیر کر کوئی کانٹا نکالنے لگ جاتا.......... سپاہی غلام محمد آیا۔ میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ جب اسے علم ہوا کہ میں اور فہمیدہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے ہیں تو اسے بے حد افسوس ہوا.......... صاحب جی‘ یہ تو بہت غلط ہوا۔ اس لڑکی نے آپ کے لیے بہت ظلم سہے تھے“۔

” ہاں غلام محمد۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”لیکن وہ جی دار لڑکی ہے۔ وہ اس ظلم کو بھی سہہ لے گی۔“

یہ عجیب بات تھی کہ فہمیدہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو جانے کے باوجود میری ذہنی کیفیت وہ نہیں تھی‘ جو نوشہرہ میں اس سے زبردستی الگ کیے جانے کے بعد ہوئی تھی۔ تب میں تڑپتا تھا‘ روتا تھا لیکن اب اس کی جدائی میں عجیب سی گھمبیرتا اور سرشاری تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک انوکھے اٹوٹ رشتے میں بندھ چکے ہیں۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی.......... اور ہم کبھی سرنگوں نہیں ہوں گے..........

تقریباً“ دو ماہ بعد فہمیدہ کا آخری اور بالکل آخری خط موصول ہوا۔ لکھا تھا..........

رحیم صاحب!

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ صحیح سلامت نکل گئے۔

دراصل وہ لڑکی جو اس رات ہالہ کے پاس سو رہی تھی‘ جاگ اٹھی تھی۔ اس نے صبح سب کو بتا دیا تھا کہ رات کوئی آدمی آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ کو نہ آنے کا پیغام بھیج دیا تھا لیکن ایک غیبی آواز آرہی تھی کہ آپ آجائیں گے۔ آپ ضرور آئیں گے۔

شکر اللہ کا......... آپ بہت دیر سے آئے۔ دس بجے تک تین آدمی پہرہ دیتے رہے۔ اس کے بعد دو سو گئے۔ ایک احتیاطاً" میرے کمرے کے باہر ٹہلتا رہا......... ان کا خیال تھا' میں آج رات آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

تقریباً" گیارہ سوا گیارہ کا وقت ہوگا' جب ہماری گلی میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے یقین تھا' یہ آپ ہوں گے اور وہی ہوا۔ دو چار منٹ کے بعد فائر کی آواز آئی اور پھر اف خدایا' میں اپنے خواب کی تعبیر دیکھ رہی تھی.........!

رحیم صاحب......... ہالہ میرے پاس کھڑی تھی۔ ہم دونوں تھر تھر کانپ رہی تھیں لیکن اس کے باوجود میرا ایمان بے حد مضبوط تھا۔ میرے ہاتھ میں چھری تھی۔ خدانخواستہ آپ کے متعلق کوئی بری خبر سنتی تو اسی وقت چھری سینے میں گھونپ دیتی لیکن آپ نے تو مردوں والا کام کیا۔ سب کو بھگا دیا۔ جب یہ سب لوگ شکست خوردہ واپس آئے تو ان کی شکلیں دیکھنے کے لائق تھیں۔ اپنی بے عزتی پر پردہ ڈالنے کے لیے مشہور کر دیا کہ چور اور ڈاکو تھے لیکن میں ان کے دلوں کی بات جانتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے باز پرس نہ کی۔ کوئی مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا' الٹا سب مجھ سے خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ ہاں۔ ماں آ گئی ہیں۔ وہ آپ کو سلام کہتی ہیں۔ دعائیں دیتی ہیں۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ آپ پر فخر کرتی ہیں اور اب نئی سنئے۔ ایک ہفتے کے بعد میری شادی ہو جائے گی......... ایک ایسے شخص سے جس سے میں زندگی کی آخری سانس تک محبت نہ کر سکوں گی لیکن یہ آپ کا حکم ہے۔ ایک ایسے آدمی کا حکم جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔

قبل ازیں لوگ محبت کے لیے مرتے تھے اور فخر کرتے تھے۔ اب



لوگ محبت کے لیے جینا سکھاتے ہیں تو میں ضرور جیوں گی' کیونکہ وہ شخص جو میرے لیے مرنا جانتا ہے تو میں اس کے کہنے پر جینے کا عذاب کیوں نہ سہوں گی.........

رحیم صاحب' میری دلی دعا ہے کہ آپ کا لمحہ لمحہ مسرتوں میں گزرے مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایک دن آپ بڑے آدمی بنیں گے......... غالباً" یہ میرا آخری خط ہے پھر شاید کبھی آپ کو خطاب نہ کر سکوں گی۔ کبھی آپ کو دیکھ نہ سکوں گی......... وہ جو آپ کی محبت نے زندگی کو چند انمول گھڑیوں سے نوازا ہے۔ وہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ اسی کے سہارے یہ طویل زندگی بیت جائے گی......... شاید بیت جائے!

غم نصیب فہمیدہ

تو گویا یہ باب بھی ختم ہوا اور میں ابھی جوان تھا۔ تیئس چوبیس برس کا کڑیل جوان۔ رام پیاری گئی زرینہ گئی......... افروزہ گئی......... سارہ گئی' تن تارا گئی اور پھر گیتا اور......... اور اب فہمیدہ' ایک سے ایک حسین' سچی قربان ہونے والی......... اور میں ہوں کہ سب کو چاہا۔ ٹوٹ کر چاہا۔ جسے نہ چاہا' گلے کا ہار بن گئی اور جن کو جی بھر کر چاہا' تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر گم ہو گئیں.........

شاید یہی خود سپردگی کا احساس ہی زندگی ہے مگر ایسی بے ساختہ خود سپاری کے مواقع زندگی کب تک دیتی رہے گی.........

میں سوچ رہا تھا' کیا میرے ساتھ یہی ہوتا رہے گا کہ محبتیں کرتا رہوں اور بچھڑتا رہوں......... رام پیاری جو میرے ساتھ کوہ سفید تک جانے کے لیے تیار تھی۔ اس لئے بچھڑ گئی کہ میرے پاؤں میں ابا کی محبت کی زنجیریں تھیں۔ وہ سنجیدہ اور مقدس روح جو آنکھوں آنکھوں میں میری روح سے ہمکلام ہوتی تھی' اس لئے کھو دی کہ میں عمر کے لحاظ سے جرات و عمل کے اس دور میں داخل نہ ہوا تھا کہ محبت کے لیے زندگی داؤ پر لگا دی جاتی ہے۔

زرینہ کا ہر لمحہ ہنستا کھیلتا چہرہ' اس لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا کہ محبتوں کی ان

گنت یورشوں نے مجھے قوتِ فیصلہ سے محروم کئے رکھا۔ میرا خیال تھا کہ آنے والا ہر دن یومِ انتخاب ہوگا لیکن جب تین سال کی غیر حاضری کے بعد لوٹا تو وہ موتیے کی کلیوں کی طرح ہنستی کھیلتی زرینہ غائب تھی اور اس کے ہونٹوں کی بہاریں اجڑ چکی تھیں۔

اور وہ شہزادیوں جیسی آن والی افروزہ جس کی نیلی آنکھڑیوں میں برکھا رُت کا سکھ، جس کی قدو قامت میں قلو پطرہ کی تمکنت اور جس کے جسم سے آہوئے ختن کے نافے کی مہکاریں اٹھتی تھیں، اس لیے بچھڑ گئی کہ اس کا نازک اور حسین ہاتھ میرے گریبان تک نہ پہنچ سکا۔ وہ چیختی رہی "گلو گلو" کہہ کر دھاڑیں مارتی رہی اور میں، جب آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ رفتِ منجمد لوگوں کا ساتھ نہیں دیتا.........

پھر سارا آئی۔ غرور اور سرپرستی کے دعوے نچھاور کرتی ہوئی۔ تن دے بیٹھی، من دے بیٹھی، دھن بھی دے بیٹھتی اگر میں ذی شعور ہوتا اگر میں خام نہ ہوتا تو ایسی عورت کو کیسے نظر انداز کرتا جو لاکھوں کی جائیداد کی اکیلی وارث تھی......... جو میرے لئے لڑتی تھی۔ جس نے میدانِ جنگ میں محبت کی جنگ کا ایک اور محاذ کھول لیا تھا مگر میں اپنی فطرت کا کیا کرتا ذہن کچھ سوچتا لہو کچھ کرتا۔ میری فطرت تو خود میری تقدیر کی تعمیر کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سارا گئی اور تن تارارا آگئی۔

ناگابل کی بد کی ہوئی ہرنی، جو دنیا کی ساری عورتوں سے مختلف تھی۔ کوہ نور ہیرے کی طرح کہ اس جیسا دنیا میں دوسرا نہیں ہے۔ محبت کے تاج میں جڑنے کے لائق بستی بستی نگر نگر ڈھونڈو تو اس جیسی دوسری نہ ملے۔ ایسی بن سندری میرے حصے میں آئی مگر جنگ اسے بھی کھا گئی، نہ میں ایسا بے اختیار ہوتا کہ مرم چھوڑتا اور وہ دنیا چھوڑ جاتی۔ سو ایسی بے بضاعتی کا کیا علاج کہ جو چاہے نہ پائے اور جیتی بازی ہار جائے.........!

یہ سب کچھ عجیب تھا۔ یہ حکایت ہی عجیب تھی۔ قصۂ زمین، ناگابل نہ سہی، دامن ہما لہ سہی......... بازار مصر کھلا تھا۔ ایک بار پھر نیلام ہوا۔ ایک من موہن مکھڑے نے سودا چکایا۔ وحشیہ سمجھ کر گلے لگایا تو ایک ہزار ایک بھیدوں کو پایا۔ یہ گیتا تھی کہ من نکال کر پاؤں میں ڈال دیا۔ شریر کا ذائقہ ایک طرف، ہماری تو آتماؤں کا گروپ بھی ایک تھا۔ اس کا سانس میرے سینے سے نکلتا تھا اور میرا سانس اس کے گلے سے اترتا تھا۔ ایسا سمبندھ، ایسی لگن، ایسا اٹوٹ پریم کہ بدھ کی شکتی کا احساس ہو۔ لیکن جب بندھن ٹوٹا تو اس پریم لڑی کا ایک ایک موتی آب ہوگیا۔ سب کچھ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں تنہا کھڑا تھا، ہمیشہ کی طرح تنہا!

زندگی کی بے معنویت پر سوچ رہا تھا کہ کوہِ ندا سے ساتویں بار صدا آئی۔ یہ ایک زشگفتہ کلی کے چٹخنے کی صدا تھی۔ اس صدا میں جیون کی مہک تھی۔ اس مہک میں وہی پہلی سی بے خودی تھی، فہمیدہ کا پیار بالکل الہام کی طرح میری روح میں اترا تھا۔ میں نے سوچا تھا یہ آخری ہے۔ بالکل آخری۔ فہمیدہ کو پاکر میری روح کے سارے زخم مندمل ہو جائیں گے، پھر کوئی خواہش باقی نہ رہے گی۔ زندگی کی تکمیل ہو جائے گی ......... لیکن قدرت کو شاید تکمیل سے دلچسپی نہیں، اگر تکمیل ہی مقصود ہوتی تو فرشتے کافی تھے۔ پھر انسان کو بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی......... غالباً" یہی وجہ تھی کہ فہمیدہ کو پاکر گنوا دیا.........

میں سوچ رہا تھا......... لہو کے ایما پر جہاں میں موت کی وادیوں میں گھوم آیا، وہاں اگر میرے لہو میں خود غرضی کا تھوڑا سا شائبہ ہوتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا کیونکہ پھر مجھے ماں کے مستقبل کی پروا نہ ہوتی۔ پھر میں فہمیدہ کا ہاتھ پکڑ کر کوہِ سفید کے دامن تک پہنچ سکتا تھا لیکن میں کیا کرتا۔ میں اپنی فطرت کے تابع تھا۔ وہ اچھی تھی یا بری، نادانستہ نیکی کا موجب بھی وہی تھی اور نادانستہ بدی کی محرک بھی وہی.........

میری زندگی کی ترتیب و تشکیل وہی کرتی تھی.........

دو چار مہینے اور گزر گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ فوج میں میرا دل مزید نہیں لگ رہا۔ مگر یہ بھی علم نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کہاں جا کر خیمہ گاڑنا ہے۔ فہمیدہ نے پہلے خط میں مجھے افسانہ نگار کہا تھا۔ غالباً" یہ بات میرے تحت الشعور کے کسی گوشے میں بیٹھ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی سے بے اعتنائی اور مایوسی کے اس دور میں "کالی لڑکی" کے عنوان سے میں نے پہلا افسانہ لکھا۔ یہ افسانہ ڈرتے جھجکتے میں نے کیپٹن آغا بابر کو جو اُن دنوں ایک فوجی اخبار کے مدیر تھے، بھیج دیا۔ ان کا خط آیا، لکھا تھا۔

اگر یہ نقش اول ہے تو نقش ثانی خدا جانے کیا ہوگا۔ اگر آپ نے افسانوی مشق ترک کر دی تو یہ اردو ادب پر ظلم عظیم ہوگا!

اگر کیپٹن آغا بابر مجھے اس طرح کا خط نہ لکھتا اور افسانہ نہ چھاپتا تو شاید "کالی لڑکی" میرا پہلا اور آخری افسانہ ہوتا۔ لیکن آغا بابر کے اس مختصر خط نے نہ صرف میرے سینے میں ہلچل مچا دی بلکہ میرے اندر ایک زبردست تحریک پیدا کی۔ میں نے سوچا جو کچھ آغا بابر نے کہا ہے' مجھے خود کو اس کا اہل ثابت کرنا ہے......... سات حسین و بے مثال لڑکیوں سے ناکام محبت ہی میرا کل اثاثہ تھا......... معاشی' سیاسی اور سماجی پختگی کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا' نہ مجھے انسانی ذہن کے تضادات کا شعور تھا۔ مطالعہ بھی اتنا وسیع نہیں تھا اور نہ زندگی کے تجربوں اور اونچ نیچ کا علم رکھتا تھا۔ البتہ خام جذبات کا ایک طوفان سینے میں موجزن تھا۔ یہ لاوا باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس طرح میں نے اس وادی پُرخار میں قدم رکھا۔

دو چار افسانے لکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس عمل سے کچھ جذباتی سکون مل جاتا ہے۔ دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے اور کچھ الجھنیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ افسانوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن مجھے احساس تھا کہ افسانہ لکھنے پر مجھے ابھی مکمل عبور حاصل نہیں ہوا۔ میرے لہجے میں کچا پن تھا۔ زبان بھی بامحاورہ نہیں تھی اور فنی لوازمات کا درس بھی کہیں سے نہیں لیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ میں اپنی لکھی ہوئی چیزوں کا نہایت سختی سے جائزہ لیتا۔ جس طرح قرآن مجید کی آیتوں میں رد و بدل نہیں ہو سکتا' اسی طرح میں کوشش کرتا کہ جس تحریر کو حتمی کہہ دوں' وہ اتنی صاف سادہ اور شستہ ہو کہ ردو بدل ناممکن ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں خود تنقیدی کا مریض بن گیا۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سہل پسندی سے بچ گیا.........

دن گزرتے رہے۔ اب زندگی میں صرف اتنی دلچسپی رہ گئی تھی کہ ہمہ وقت اچھی کتابوں کی تلاش میں رہتا۔ کبھی کبھار افسانہ لکھ لیتا جو تواتر سے چھپتا رہتا۔ اچھی کتاب جو میرے مزاج کے قریب ہوتی' جی چاہتا کبھی ختم نہ ہو......... روسی ناول نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ اکثر روسی مصنف انسانی جذبات و احساسات کا ایسے لطیف انداز میں ذکر کر جاتے ہیں کہ قاری پھڑک اٹھتا ہے۔ یوں تو مجھے ٹالسٹائی' چیخوف ترگنیف دستووسکی اور گورکی سب کے انداز پسند آئے مگر پشکن ذہنی طور پر میرے بہت قریب تھا۔ اس کے انداز میں



رومانیت' ڈرامائیت' انانیت اور آفاقیت اس طرح گڈمڈ ہو جاتے کہ کسی کا بھی الگ وجود نہ رہتا۔ اس سب کے امتزاج سے ایک ایسی سچائی جنم لیتی جو میرے جذبے اور احساس کو مسخر کر لیتی۔اس کی ہر کتاب کے ایک ایک ورق اور ایک ایک لفظ کو میں چبا چبا کر ہضم کرتا......... آج بھی جب کوئی اچھی کتاب پڑھنے کو نہیں ملتی۔ میں پشکن کی کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگ جاتا ہوں اور اس میں پہلے کی طرح تازگی محسوس کرتا ہوں۔

فرانسیسی ادب میں بھی میں نے پائے کی چیزیں پڑھی ہیں لیکن اشتراکیت سے پہلے کے روسی کردار مشرق کے مزاج سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ روس کے ناول کا مجھ پر نسبتاً زیادہ اثر ہے.........

جی ایچ کیو میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس عرصہ میں تقریباً" سارا اردو ادب کھنگال ڈالا۔ یہاں پڑھنے کے لیے کتابیں وافر تھیں اور وقت بھی کافی مل جاتا تھا لیکن جیسا کہ میرے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ میرے مزاج میں قرار اور سکون نہیں تھا اور کچھ قدرت کو بھی یہی منظور تھا کہ میری زندگی میں اتھل پتھل ہوتی رہے تاکہ اس رگڑے میں تراش خراش جاری رہے اور میرا اصل باہر آسکے۔

ایک دن جی ایچ کیو کے کیمپ کمانڈنٹ سے میرا جھگڑا ہوگیا۔ میرے پلاٹون کے ایک نائیک کی بے عزتی کی گئی تھی لیکن بات اتنی طول کھینچ گئی کہ انکوائری شروع ہو گئی۔ کوئی الزام ثابت نہ ہونے کے باوجود مجھے یہ کہہ کر فوج سے سبکدوش کردیا گیا کہ آپ کی خدمات کی مزید ضرورت نہیں میجر کی ترقی بھی رک گئی۔

اگرچہ ذہنی طور پر میں فوج کا آدمی نہیں تھا اور پنشن کی خاطر مزید بیس پچیس سال سروس کرنا میرے لیے دشوار مرحلہ تھا لیکن اس طرح خلافِ توقع اور اچانک ملازمت کے چلے جانے سے میں پریشان بھی ہوا' کیونکہ یہ اقتصادی مسئلہ تھا۔ روپیہ میرے پاس نہیں تھا۔ زمین کچھ باپ دادا نے بیچ دی تھی' کچھ خود ہم بیچ باچ کر فارغ ہو بیٹھے تھے۔ چنانچہ میں کوہاٹ چلا گیا اور مشتاق کے پاس جاکر ڈیرہ جمایا۔ مشتاق اب ایک کامیاب وکیل بن چکا تھا۔ میں تین مہینے ان کے ہاں رہا۔ یہ فرصت کے دن تھے۔ میں افسانے لکھتا رہا۔ فلم کے لیے بھی ایک دو کہانیاں لکھیں۔ یہیں میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ لاہور جاکر قسمت آزمائی

کروں گا مگر کسی کو دل کی بات نہ بتائی کہ مبادا ناکام ہو جاؤں تو لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنوں۔ چنانچہ بستر باندھ لیا اور یہ کہہ کر لاہور چلا گیا کہ ہومیوپیتھک ڈاکٹر بننے کے لیے کالج میں داخلہ لینا ہے.........

داتا کی نگری کی پچیس تیس لاکھ کی آبادی میں صرف ایک شخص کو جانتا تھا۔ یہ ہمارے کور کا نائب صوبیدار عالم دین تھا' جس نے میرے ساتھ اکٹھا کیڈر پاس کیا تھا۔ مجھے انہی کے پاس رہنا تھا کیونکہ کسی ہوسٹل' ہوٹل یا کرائے کے مکان میں رہنے کی جیب اجازت نہیں دیتی تھی......... میں اعتراف کروں گا کہ اگر لاہور میں یہ فرشتہ سیرت آدمی میری دستگیری نہ کرتا تو شاید ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا۔ نہ صرف یہ کہ ایک پورا سال میں ان پر بوجھ بنا رہا بلکہ یہ بھی کہ اس کی قربت کی وجہ سے ملحقہ کوارٹر میں ایک ایسی لڑکی کو دیکھ لیا جو آئندہ میری زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔

راشدہ ان دنوں آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی' جب میں نے اسے پہلی بار پائنچے اٹھائے' صحن دھوتے دیکھا تھا تو یکبارگی دل اچھلا تھا اور سوچا تھا......... کہ تقدیر ایک بار پھر مجھے کہاں کھینچ لائی ہے...... ! اگرچہ راشدہ نے مجھے کبھی لفٹ نہیں دی تھی اور نہ کبھی نامہ و پیام ہوا تھا لیکن جب بھی میں اسے اپنے کوارٹر میں سے دیکھتا' میرے جسم میں ایک لہر سی دوڑ جاتی اور میری یکسوئی ختم ہو جاتی۔ اسی بے چینی کے عالم میں سائیکل اٹھاتا اور باہر نکل جاتا اور پھر رات گئے لوٹتا۔

وہ جو کہتے ہیں' خالی پیٹ عشق نہیں ہوتا تو کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ گھر والے اور عزیز و اقارب سمجھ رہے تھے' ڈاکٹری پڑھنے گیا ہوں......... اور میں صبح گھر سے نکلتا' کسی باغ کے کنج میں بیٹھ جاتا اور افسانے لکھتا۔ جس دن افسانے کا موڈ نہ بنتا تو شہر کی طرف نکل جاتا اور اس شہر نا پرساں میں مارا مارا پھرتا۔ کئی مہینے آدمیوں کے اس جنگل میں بھٹکتا رہا......... کوئی بھی رازداں نہ ملا' کوئی بھی مونس و غمخوار نہ بنا......... جیب خالی' سینہ بنجر مگر عزم و استقلال کی لاٹھی ہاتھ میں تھی۔ میکلوڈ روڈ اور رائل پارک میں بہت سے فلمی دفاتر کے بورڈ پڑھے مگر انا نے سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہ دی۔ اس زمانے میں انور کمال



پاشا کا طوطی بولتا تھا۔ سوچا کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ سیدھا حکیم احمد شجاع (مرحوم) کے پاس پہنچا اور وہ ان دنوں قرآن کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ میں نے مدعا ظاہر کیا تو بولے.........

"فلمیں تو میرا بیٹا انور کمال بناتا ہے۔"

عرض کیا......... "جانتا ہوں لیکن آپ کی وساطت سے ملوں گا تو ہلکے پن کا احساس نہ ہوگا۔"

حکیم صاحب وضع دار آدمی تھے۔ مسکرائے۔ جوتی پہنی اور بغل والی کوٹھی میں انور کمال کے پاس لے گئے۔ وہاں دس بارہ آدمی بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب نے کہا۔

" یہ خان صاحب سرحد سے آئے ہیں۔ کچھ وقت نکال کر انہیں سن لیجے۔" انور کمال نے خوش آمدید کہا۔ حواریوں نے تنقیدی نگاہوں سے دیکھا۔ پاشا نے نام پوچھا.........

عرض کیا......... "رحیم گل۔"

پاشا پھڑک اٹھا......... "اچھا اچھا۔ میں نے آپ کے افسانے پڑھے ہیں واہ خوب!" فوراً" سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "کوئی کہانی ہے آپ کے پاس' سنائیے۔"

میں فلم تکنیک کو نہیں سمجھتا تھا مگر کہانی سنا دی۔ پاشا اس قدر متاثر ہوئے کہ سٹوری ڈیپارٹمنٹ میں ملازم رکھ لیا۔ یوں میری فلمی زندگی کا آغاز ہوا۔

شام کو اپنے دوست عالم دین کو یہ خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس دن راشدہ کو دیکھا تو دل پھر سے مچل گیا۔ اب میں باقاعدگی سے پاشا کی کوٹھی جاتا۔ مکالمے لکھتا۔ کہانیوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ یہاں میری ملاقات سیف الدین سیف' قتیل شفائی' شاطر غزنوی (مرحوم)' بابا عالم سیاہ پوش (مرحوم)' خلیل الرحمٰن (خلیل قیصر) (مرحوم)' آغا حسینی اور جعفر ملک سے ہوئی......... بابا ایم ایس ڈار پروڈکشن منیجر تھے اور معین شاہ (مرحوم) جنرل منیجر کہلوانا پسند کرتے تھے۔ پاشا باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لئے بے حد لاڈ لا بھی تھا۔

یہ پاشا کا وہ دور تھا۔ جب وہ رات دو بجے تک بلا ناغہ جاگتا۔ مکالمے لکھتا۔ کہانیوں پر گفتگو کرتا اور اس کے بعد سوتا......... صبح دس ساڑھے دس بجے اس کی آنکھ

کھلتی........ بیڈ ٹی پیتا........ اخبار پڑھتا' شیو کرتا' بارہ بجے باتھ روم جاتا' ایک بجے ناشتہ کرتا اور تقریباً" دو بجے براق کرتہ پاجامہ پہنے نہایت طمطراق سے ڈرائنگ روم میں آتا جہاں دس پندرہ آدمی دو تین گھنٹیوں سے اس کے منتظر ہوتے........ کوئی کہتا........ "آج آپ کے چہرے پر بے حد رونق ہے۔" کوئی کہتا۔ "آج آپ کی پیشانی بہت چمک رہی ہے!" تیسرا کہتا۔ "یہ چمک تو روزِ ازل سے ہے۔!!" چوتھا گرہ لگاتا........ "یہ ابد تک رہے گی!!"

پاشا جو بے حد ذہین آدمی تھا اور جانتا تھا کہ ہر چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی آئی ہے۔ خوشامدیوں کے نرغے میں آجاتا کہ فطرتِ انسانی کا یہی تقاضا تھا۔ ذہانت جیسی طاقت ور چیز' ہمیشہ خوشامد جیسی کمزور چیز سے زیر ہوتی آئی ہے........ شام تک دربار لگا رہتا۔ تقسیم کار آتے' نمائش کار آتے' شاعر آتے' ادیب آتے' ایکٹر آتے' موسیقار آتے........ فلم کے ہر شعبے کے فن کار کے لیے ضروری تھا کہ پاشا کے حضور حاضری دیں........ صرف مدعا بیان کریں اور فیض پائیں........

پاشا بخیل آدمی نہیں تھا مگر مجموعہ اضداد تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں تھیں' بہت سی خوبیاں تھیں لیکن غور سے تجزیہ کیا جاتا' موازنہ کیا جاتا تو خوبیوں کا پلڑا بھاری ہوتا۔ جس طرح اس میں کام کے آدمی کی شناخت کا جوہر تھا' اسی طرح اس کے خمیر میں نیکی کا عنصر بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کہانیوں میں یا عملی زندگی میں کسی جذباتی سچوایشن سے دوچار ہوتا تو اس کے آنسو نکل آتے۔ یہی وہ لمحے ہوتے جب وہ مجھے اچھا لگتا اور شرفِ انسانی کا مظہر بن جاتا........

مجھے پاشا کے وہ دن بھی یاد ہیں' جب کرکٹ کے ٹسٹ میچ ہوا کرتے تھے اور وہ پورے سٹاف کے لیے فسٹ کلاس کے ٹکٹ خرید لیتا تھا اور پانچ دن پورا جشن ہوتا۔ پھر مجھے اس کے وہ دن بھی یاد ہیں' جب وہ قذافی سٹیڈیم میں اکیلا میچ دیکھنے جاتا تھا۔ خدا جانے کون سی کلاس میں بیٹھتا تھا اور سٹیڈیم سے پیدل ذیلدار پارک جاتا تھا........ اور اس کے شاگرد جنہیں پاشا کے سامنے سگریٹ پینے کی ہمت نہ ہوتی تھی' کاروں میں فراٹے بھرتے



ہوئے اور دھول اڑاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ مگر اس پیدل آدمی پر کسی کی نظر نہ پڑتی تھی' جس کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے انہیں کاریں نصیب ہوئی تھیں۔

مجھے پاشا کے عروج کا سماں بھی یاد ہے۔ جب وہ کراچی سے نئی فلموں کا ایگریمنٹ کر کے واپس آرہا تھا تو سارا سٹاف اور متعلقہ ایکٹر اس کے استقبال کے لیے لاہور ریلوے سٹیشن پر موجود تھے۔ سب کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کے ہار تھے۔ سب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک بابا عالم سیاہ پوش تھا جو استقبال کرنے والوں میں نہیں تھا۔ معین شاہ ہنس رہا تھا اور بار بار یاددہانی کرا رہا تھا۔ "لیجئے دس منٹ رہ گئے۔ پانچ منٹ رہ گئے' لو سگنل بھی ہوگیا مگر بابا عالم نہیں پہنچ سکا' آج بابا مارا گیا دوستو' صاف مارا گیا!"

وہ قہقہے پر قہقہے لگا رہا تھا۔ سٹاف کے دوسرے لوگ بھی محظوظ ہو رہے تھے کیونکہ بابا عالم کی نیاز مندی تو مثالی چیز گنی جاتی تھی........ خدا خدا کر کے گاڑی آگئی لیکن جس وقت گاڑی رک رہی تھی تو یاروں نے پاشا کا چہرہ بعد میں دیکھا بابا عالم سیاہ پوش کا چہرہ پہلے دیکھ لیا........ وہ پھولوں کا ہار پہنے' کھڑکی سے سر نکالے' استقبال کرنے والوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر کورنش کر رہا تھا اور ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ معلوم ہوا' بابا عالم سیاہ پوش استقبال کرنے اوکاڑہ پہنچ گیا تھا!

ایک بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ پاشا نے جتنے ہدایت کار جتنے اداکار اور جتنے فنکار فلمی صنعت کو دیئے ہیں' شاید ہی کسی اور نے دیئے ہوں۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ فنی طور پر بالغ نظر آدمی تھا۔ وہ بہت کم وقت میں فیصلہ کرتا تھا مگر اس کے ایسے فیصلے عموماً" درست ہوتے تھے کیونکہ فن کی پہچان اور پرکھ کا مادہ اسے نہ صرف وراثتاً ملا تھا بلکہ فطرتاً" بھی ودیعت ہوا تھا۔

لیکن پے در پے کامیابیوں نے اسے خود پسند اور مغرور بنادیا تھا اور یہی چیز اس کے زوال کا باعث بنی۔ غیر محسوس انداز میں وہ لوگ ایک ایک کر کے اس سے الگ ہوتے گئے جو اس نے نہایت ژرف نگاہی سے اپنے اردگرد جمع کئے تھے۔ اس کی خود اعتمادی نے اسے

احساس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ اپنے دوستوں سے الگ ہوگیا ہے اور اس کے اردگرد ذہانت کا جو ہالہ رقصاں تھا' اس کی لے آہستہ آہستہ اکھڑ رہی ہے......... وہ پاشا جس کے مکالموں کی دھوم تھی اور جس کی فلمیں ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں سلور جوبلی مناتی تھیں۔ وقت کے شکنجے میں آیا تو اس کی خود اعتمادی کو ایسی بلا کھا گئی کہ اس نے "میرے محبوب" کے نام سے ہندوستانی فلم کا چربہ بنا ڈالا.........

دراصل اسی دن پاشا مرگیا تھا۔ یہ فلم اس کے تابوت میں آخر کیل تھی!

پاشا کی ملازمت کے دنوں کا واقعہ ہے۔ مجھے کراچی سے ایک خاتون کا خط موصول ہوا۔ یہ عورتوں کے ایک پرچے کی مدیرہ تھیں۔ انہوں نے میرا ایڈریس ایک ادبی پرچے سے حاصل کیا تھا' جہاں میرے افسانے چھپتے تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے کے لیے افسانہ مانگا تھا۔ میں نے افسانہ لکھ کر بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس خاتون کا خط آیا۔ اس نے سالنامے کے لیے افسانہ اور تصویر مانگی تھی۔ میں نے دونوں چیزیں بھیج دیں لیکن جب افسانے اور تصویر کی رسید کی شکل میں شمسہ کا خط آیا تو میں نے اس کے خط میں دبی دبی سی چھیڑ اور شوخی محسوس کی۔ یوں لگا گویا میری تصویر نے شمسہ کو کوئی زیر لب پیغام پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ اس کی تحریر کی شوخی نے مجھے بھی اکسایا اور میں نے بھی پھول کی تہہ در تہہ پتیوں میں چھپی ہوئی خوشبو کی طرح' دھیمے دھیمے' کومل کومل لہجے میں اسے چھیڑا.........

بس پھر کیا تھا۔ مضراب اٹھانے کی دیر تھی کہ نغمے پھوٹ پڑے......... شمسہ نے میری خواہش پر اپنی تصویر بھی بھیج دی تو میں نے اسے لکھا۔ یہ تم نے گیتا بالی کی تصویر بھیج دی ہے۔ مذاق نہ کرو' اپنی تصویر بھیج دو۔ اس نے ایک کی بجائے چار پانچ تصاویر مختلف پوز میں بھیج دیں۔ ہر تصویر میں کسی نہ کسی طور گیتا بالی کی جھلک موجود تھی مگر یہ گیتا بالی نہ تھی' واقعی شمسہ کی تصاویر تھیں۔ ایک بار پھر محبت کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی تھی.........!

شمسہ کے خطوط میں ایسی بے ساختگی اور والہانہ پن تھا کہ راشدہ سے میری توجہ ہٹ گئی۔ یہ بالکل ایسا ہوا جیسے افروزہ کو اچانک پاکر میں رام پیاری اور زرینہ سے غافل ہو گیا تھا......... خط و کتابت کا یہ عالم کہ وہ روز مجھے ایک خط لکھتی۔ میں بھی روزانہ اسے



خط پوسٹ کرتا۔ کئی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا......... محض تصاویر کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کے قریب اور قریب تر ہوتے چلے گئے۔ میں اگر رات کے تین بجے بھی شوٹنگ سے واپس آتا تو سونے سے پیشتر اسے خط لکھتا کہ یہ میری خوشی تھی اور مجبوری بھی۔ شمسہ زور دیتی رہی کہ کراچی آؤں۔ اسے دیکھوں' پرکھوں اور پھر کوئی فیصلہ کروں۔

میرا بھی دل مچل رہا تھا کہ جاؤں' گیتا بالی کو دیکھوں' اسے آغوش میں لوں اور اسے اپنانے کے اسباب پیدا کروں......... کراچی جانے سے پہلے مجھ پر انکشاف ہوا کہ شمسہ نے پرچہ محض اپنی ادبی ذوق کی تسکین کے لیے نکالا ہے۔ ورنہ یہ اس کا اقتصادی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ وہ ایک جج کی لڑکی ہے۔ اس انکشاف کی وجہ سے میں ایک حد تک خوف زدہ بھی ہوا کیونکہ امکان تھا کہ آگے جاکر فہمیدہ کی طرح وہ بھی میرے لئے طبقاتی مسئلہ بن جاتا اور میں ایک بار پھر جذباتی شکست و ریخت سے دوچار ہوتا۔

چنانچہ میں نے اسے خط لکھا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے اب تک مجھے اپنے سماجی مقام کا احساس نہیں ہونے دیا اور تم نے اظہار برتری کے شوق میں یہ نہیں جتایا کہ تم ایک جج کی صاحبزادی ہو۔ مگر اس کے مقابلہ میں مَیں اپر کلاس چھوڑ مڈل کلاس کا آدمی بھی نہیں ہوں۔ پھر یہ خلیج کیسے عبور ہوگی۔ میں تمہارے لواحقین کی نظر میں تمہاری محبت کا مستحق کیونکر ٹھہر سکتا ہوں۔ نہیں شمسہ نہیں' مجھے کراچی نہ بلایئے۔ میری اور تمہاری قدریں مختلف ہیں اور یہ اختلافات آسانی سے ختم ہو جائیں گے۔ ہمارا معاشرہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا.........!

جواب میں شمسہ نے کہا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک ادیب کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں......... تم کن قدروں کی بات کرتے ہو۔ محبت سے بڑی قدر اور کیا ہوسکتی ہے......... خیال خام سہی مگر میں جذباتی رویے کو معاشی رویے پر ترجیح دیتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہاری تنخواہ چار سو روپے ہے مگر میں نے تم سے کب کہا کہ میرے لیے نوکر رکھو۔ میرے لیے موٹر خریدو اور ہنی مون منانے میرے ساتھ ہونولولو چلو۔

میرے پیارے ادیب

ایسی باتیں نہ کرو۔ دل دکھانے کی باتیں۔ میں خیال پرست لڑکی ہوں۔ مجھے جس

خیالی شہزادے کی تلاش تھی' مل چکا ہے۔ تم صرف افسانے لکھتے رہنا۔ جب تک جی چاہے سوتے رہنا' میں نوکری کروں گی۔ تمہارے لیے سہولتیں پیدا کروں گی۔ تمہیں معاشی فکروں سے آزاد کردوں گی اور اس کے عوض بس ایک نگاہِ مہر کی طالب!

تو پھر بہکی بہکی باتیں نہ کرو اور میری بات مان لو کراچی آجاؤ۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ میں جج کی صاحبزادی ہوں یا تمہاری باندی؟

نتیجہ یہ کہ مجھے کراچی جانا پڑ گیا......... ایک دبلی پتلی' نازک' خوبصورت ہنسی اور خوبصورت باتیں کرنے والی لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ آئی اور چھا گئی۔ ہم خطوط میں ایک دوسرے سے اس قدر گھل مل چکے تھے کہ نہ اسے شرمانے کی ضرورت تھی اور نہ مجھے جھجکنے کا خیال آیا۔ وہ آتے ہی پلنگ پر نیم دراز ہوگئی۔ اور کاغذ پنسل اٹھا کر لکھا.........

"کہیے' گل صاحب' میں آپ کو پسند آئی؟"

میں نے جواباً" اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے اور اس کا منہ بند کردیا۔ پورے دس دن اس کی زلفوں کی چھاؤں میں گزار دیئے .......... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس بارے میں وہ مکمل طور پر با اختیار تھی.......... مسلسل ناکامیوں نے جہاں مجھے مایوس کر دیا تھا' وہاں اس غیر متوقع کامیابی سے بوکھلا گیا تھا اور سمجھ نہیں آرہا تھی کہ اس گنجِ گراں قدر کا کیا کروں؟

وہ معزز باپ کی بیٹی تو خیر تھی ہی اور بھی اس میں ان گنت خوبیاں تھیں۔ دلکش شخصیت کے علاوہ نہایت صاف ستھرا ادبی ذوق۔ بے حد ہنس مکھ' نہایت حاضر جواب' سلیقہ شعار اور قرینے سے کپڑا پہننے والی اور پھر یہ کہ اپنی خاندانی وجاہت اور اقتصادی خوش حالی کی پروا نہ کرتے ہوئے محض شخصیت سے رشتہ جوڑ رہی تھی۔ مجھے شمسہ سے شادی کرلینا چاہیے تھی لیکن بوجوہ یہ شادی نہ ہو سکی۔ اس کا تفصیلی ذکر میں نے اپنے ناول "پیاس کا دریا" میں کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی شمسہ ہی تھی اور یہ ناول شمسہ کی خواہش پر تحریر ہوا تھا۔ اشاعت سے پہلے شمسہ کی والدہ نے اس کا مسودہ پڑھ لیا تھا لیکن اس عالی ظرف خاتون نے نہ تو مجھے مسودہ میں کسی رد و بدل کے لیے کہا اور نہ اشاعت سے منع کیا۔ بلکہ خوش ہو کر بولی۔



"بعض اوقات حقیقتیں افسانوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔"

شادی کے بعد شمسہ سے ملاقات ہوئی۔ ناول کا ذکر آیا تو وہ بولی.........

"آپ نے ابھی تک چھپوایا کیوں نہیں؟"

میں نے کہا......... "آپ کی شادی ہوگئی ہے۔ مجھے احساس ہے۔ آپ کے میاں آپ سے ناراض نہ ہو جائیں۔"

"ارے نہیں' ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ سب جانتے ہیں۔"

"تو پھر چھپ جائے گا۔"

شمسہ کی والدہ مجھے بے حد پسند کرتی تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ شمسہ سے میری شادی ہو جائے لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ آزردہ خاطر نہ ہوئیں۔ انہوں نے مجھ سے خط و کتابت جاری رکھی۔ اگرچہ انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن میں ان کی خواہش جان گیا تھا کہ شمسہ نہ سہی ان کی منجھلی لڑکی سے میری شادی ہو جائے۔ شمسہ کی چھوٹی بہن زاہدہ سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اس کی منجھلی بہن سلطانہ کو نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس کے ایک ناکام رومانس کا ذکر سن چکا تھا اور یہ بھی کہ وہ خاصی طرح دار لڑکی ہے اور شمسہ سے کچھ کم سج دھج نہیں رکھتی۔ اماں بھی خطوط میں اس کا ذکر بہت ذومعنی انداز میں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اُسے دیکھنے اور ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔

ادھر کبھی کبھار راشدہ پر نظر پڑ جاتی۔ یہ ان سب کے مقابلے میں سیدھی سادی لڑکی تھی جو ہمہ وقت گھر کے کام کاج میں مصروف ہوتی۔ عشق کرنے کے لیے اس کے پاس فرصت ہی کہاں تھی۔ سکول جاتی تو بہنوں کے ساتھ واپس آتی تو دو چار منٹ بعد حسبِ معمول گھر کا صحن دھوتی یا ہانڈی پکاتی یا نلکے پر کپڑے دھو رہی ہوتی۔ اسے گھر کے کاموں میں جتا دیکھ کر مجھے عجیب لگا۔ یعنی اچھا بھی کہ چلو اس مصروفیت کے بہانے وہ نظر تو آجاتی ہے لیکن تنقید بھی کرتا کیونکہ اسے ہنستا کھیلتا دیکھنے کا بھی ارمان تھا.........

* *

انہی دنوں میرے دوست کا تبادلہ ہوگیا اور مجھے چھاؤنی چھوڑ کر شہر آنا پڑا۔ میکلوڈ روڈ پر بیت القیام ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا اور یوں صحیح معنوں میں شہری زندگی کا آغاز ہوا۔ پاشا کی ملازمت چھوڑنے کے بعد اسٹوڈیو میں آنے جانے کا سلسلہ بھی بڑھ گیا۔ اس رابطے کا یہ فائدہ ہوا کہ میری دو کہانیاں بک گئیں اور زندگی میں پہلی بار میرے پاس ہزاروں روپیہ آگیا........

شہر میں رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ادبی اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا اور ادیبوں' شاعروں سے متعارف ہوتا گیا مگر اس تعارف سے ذہنی دھچکوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جن لوگوں کی کتابیں پڑھی تھیں۔ قدرتی طور پر ان کا احترام دل میں موجود تھا اور ان سے ملنے کا بھی اشتیاق تھا لیکن بالمشافہ گفتگو کے مواقع ملے تو شدید مایوسی ہوئی کیونکہ ان میں اکثریت کھوکھلے لوگوں کی تھی۔ ان کی رگوں میں لہو کی جگہ زہر بھرا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں دور دور تک مہر و محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

لیکن جلد احساس ہوگیا کہ قصور ان کا نہیں میرا ہے۔ کیونکہ فطرتاً میں ابھی تک نیک اور معصوم تھا........ میں نے صرف محبتیں کی تھیں۔ انسانی نفرتوں اور کدورتوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا یا یہ کہ بہت کم واسطہ پڑا تھا۔ اب اچانک میں انسان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ رہا تھا........





فلم رائٹر کی حیثیت سے میرا ہر قدم کامیابی کی طرف اٹھ رہا تھا اور میری ساکھ بنتی جارہی تھی۔ "نغمہ دل" پہلی کہانی تھی جس میں میں نے پٹھان کے ہاتھ سے نسوار کی ڈبیہ چھین کر اس کے ہاتھ میں رائفل تھما دی تھی اور پہلی بار صحیح معنوں میں پٹھان ثقافت کو پیش کیا۔ "عجب خان" میری دوسری فلم تھی۔ جس نے تقریباً پوری دنیا میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے........ یہ قلم ہی تھا' جو کھینچ کر مجھے لاہور لے آیا۔ یہ قلم ہی تھا' جس نے قلم کاری کے ساتھ ساتھ مجھے ہدایت کار بنا دیا اور فلم ساز بھی........ اور جس نے کسی حد تک مجھے مالی آسودگی بخشی........

شہر آنے کے بعد بھی راشدہ کے والد سے رابطہ قائم رہا۔ فلمی مصروفیات' فلمی چمک دمک اور فلمی معاشقوں کے باوجود راشدہ بہرطور میرے دل کے گوشے میں دبکی بیٹھی تھی' اس لئے گاہے گاہے چھاؤنی چلا جاتا۔ قسمت یاوری کرتی تو راشدہ کی جھلک نظر آجاتی اور دل خوش ہو جاتا........

ایک دن اچانک اماں کا ٹیلیگرام ملا کہ وہ بمعہ زاہدہ اور سلطانہ کے کراچی سے لاہور آرہی ہیں۔ میرا دل یکبارگی اچھلا۔ ایک اور رومان دامن واکئے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شام کو سٹیشن پہنچا۔ گاڑی ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔ ٹرین ابھی تک رکی نہیں تھی کہ زاہد چلائی........

"وہ کھڑے ہیں گل بھائی۔"

میں ہنس پڑا۔ ماں بھی مسکرائیں۔ سفید شلوار' سفید دوپٹہ نیلے اور سرخ پھولوں والی قمیض میں ملبوس ایک لڑکی کی جھلک بھی نظر آئی تھی۔ میرا دل دھڑکا۔ یہی ہوگی سلطانہ؟ اماں اور زاہدہ اتر آئیں۔ زاہدہ سے سلام دعا ہوئی۔ اماں سے ایک دو باتیں ہوئی۔ قلی کو سامان اتارنے کے لیے کہا۔ سامان اتر گیا۔ اماں نے ڈبے میں نظر ڈالی۔ سلطانہ کھڑکی میں بیٹھی مخالف سمت دیکھ رہی تھی........

"اری اتر بھی سلطانہ' ادھر کیا دیکھ رہی ہے۔" اماں نے اسے ٹوکا۔ سلطانہ اس طرح چونک کر کھڑی ہوگئی گویا اماں اس بے نیازی کے معنی سمجھ گئی ہوں........ میں

مسکرایا........

اس نے دوپٹہ ٹھیک کیا۔ وہ مجھ سے نظریں بچا رہی تھی اور یہ احساس پیدا کر رہی تھی گویا اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ میں نے بھی اُس کے اس احساس کو زندہ رکھنا مناسب جانا اور بظاہر اس کے وجود سے لاپروا ہوگیا........

قلی نے سامان اٹھا لیا تھا۔ میں اور اماں آگے آگے وہ دونوں بہنیں پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچ کر قلی نے سامان اتارا۔ اماں اسے پیسے دے کر فارغ ہوئیں تو انہوں .... نے مسکرا کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ "اری سلطانہ ان سے ملو۔ یہی ہیں تمہارے گل بھائی!"

سلطانہ نے مسکرا کر سلام کیا۔ پہلی بار ہماری نگاہیں ملیں........ شوخ آنکھیں، پہلے گلاب کی پنکھڑی کی طرح نرم، ملائم اور ملیح چہرہ، بے حد سبک، نازک اور خوبصورت ہاتھ، لمبا قد اور لچکیلا اور تیکھا ناک نقشہ۔ یہ تھی سلطانہ!

خوبصورت نہیں تھی مگر حسین ضرور تھی۔ یعنی اس کی آنکھیں آہو کی طرح نہیں تھیں۔ اس کے ہونٹ عنابی نہیں تھے۔ اس کا چہرہ کتابی نہیں تھا۔ اس کے دانت موتیوں کی لڑی نہیں تھے اور اس کے جسم میں اجنتا اور ایلورا کی حسیناؤں کے زاویے بھی نہیں تھے لیکن جب آدمی اس کے سراپے کا جائزہ لیتا تو محسوس کرتا کہ وہ نہایت دلکش چیز ہے۔ اس دلکشی کو پکڑا نہیں جاسکتا تھا۔ اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ یہ دلکشی اس کے مجموعی وجود سے پھوٹتی تھی۔ بس یہی میرے نزدیک حسین ہونے کی تعریف تھی۔

دو دن کی ملاقاتوں کے بعد محسوس ہوا کہ پہلی محبت کی ناکامی، اس کے دل پر مایوسی اور شکستگی کی مہریں نہیں لگا سکی ہے۔ اس کی نگاہیں افق پر نہیں اپنے قدموں میں ہیں اور وہ زندگی سے بھرپور لڑکی ........لارنس کی خوبصورت روشوں پر سیر کے لیے نکلتے تو یہی ہوا کہ اسے اپنے پہلو میں پایا۔ اگر میرے قدم تیز ہوگئے تو دیکھا کہ اماں اور زاہدہ پیچھے رہ گئیں اور وہ میرے ساتھ آگے نکل آئی۔ اگر میرے قدم ڈھیلے پڑ گئے تو وہ بھی میرے ساتھ پیچھے رہ گئی ........وہ بے باکی سے کالج، امتحان اور کراچی کی باتیں کرتی رہی۔ چلتے



چلتے کئی بار ہمارے ہاتھ اور جسم ٹکراتے مگر وہ بالکل نہ چونکتی۔ شاید ذہنی طور پر اس نے اس اتصال کو محسوس کیا ہو، جیسے میں نے کیا تھا۔ مگر بظاہر ہم اسے اتفاق ہی سمجھتے رہے........

اگلے روز ہم شاہی مسجد اور شاہی قلعہ دیکھنے گئے........ شیش محل دربارِ عام، دربار خاص یہ سب نام وہ کتابوں میں پڑھ چکی تھی مگر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بہت حیرت زدہ اور مرعوب نظر آ رہی تھی۔ جہانگیر کی خواب گاہ کو وہ نہایت شوق اور تجسس سے دیکھ رہی تھی۔ زاہدہ پرانے سکوں اور ہتھیاروں کے متعلق اماں سے باتیں کر رہی تھی۔ سلطانہ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ میں نے قریب ہو کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ جیسے خواب سے جاگ پڑی۔ مسکرا کر بولی۔ "جہانگیر سوتا کہاں ہوگا؟"

اس کا یہ سوال بے حد فطری اور ذومعنی تھا۔ پہلی بار جب میں یہاں آیا تھا تو خود میرے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوا تھا........ میں نے تصور میں دیکھا تھا کہ نور جہاں اور جہانگیر شاہانہ تمکنت سے بیٹھے ہوں گے اور ان گنت با ادب کنیزیں، ہاتھوں میں مورچھل لیے دھیمے دھیمے ہلا رہی ہوں گی۔ شاہی خلوت کدے کا خیال اپنی جگہ بے حد رنگین اور دلچسپ تھا........ باہر نکلے۔ وہ ایک جھروکے میں کھڑی ہوگئی۔ میں نے کہا۔

"ان جھالیوں اور جھروکوں سے شہزادیاں باہر کا نظارہ کیا کرتی تھیں۔"

سلطانہ بولی۔ "آپ کو وہ جگہ معلوم ہے جہاں مہرالنسا کھڑی تھی اور شہزادہ سلیم نے اسے کبوتر پکڑا دیئے تھے؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے دوسرا سوال کیا........" سلیم نے انار کلی سے بھی سچا عشق کیا تھا اور نور جہاں سے بھی اسے سچی محبت تھی۔ کیا ایک آدمی دو عورتوں سے سچی محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا........ "سلطانہ، ہم دونوں ناکامئ محبت کا زہر پی چکے ہیں مگر پھر بھی زندہ ہیں، ہنستے کھیلتے ہیں۔ ہمیں زندگی پر یقین ہے۔ ہم مایوس نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ اتنی وسیع کائنات میں حسین صورتوں اور پُر خلوص

دلوں کی کمی نہیں؟"

وہ خاموش تھی اور بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتارہی ہو...... جیسے میری بات سمجھ گئی ہو۔ اتنے میں زاہدہ آگئی۔ "چلو بھئی اماں بلا رہی ہیں۔ واپس چلنا ہے۔"

"ابھی تو تہہ خانہ نہیں دیکھا۔ نیچے چلیں گے' زاہدہ۔" سلطانہ نے جواب دیا۔

"نا بھئی میں تو نہیں جاؤں گی۔ بہت گرمی ہے۔ تم گل بھائی کے ساتھ ہو آنا مگر جلدی لوٹنا۔ میں اماں کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

زاہدہ چلی گئی۔ میں اور سلطانہ تہہ خانے کی طرف بڑھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دو چار سیڑھیاں اترے تو وہ رک گئی اور بولی۔ "ذرا آہستہ اتریئے گل بھائی' مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں کھڑا ہوگیا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ کیا تھا' پھولوں کی لڑی میرے ہاتھ میں تھمادی گئی۔ میں نے یہ نازک اور خوبصورت ہاتھ چوم لیا۔ میں نے دیکھا' نیم اندھیرے میں اس کی شوخ آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس میں محبت کا بے اختیارانہ اظہار تھا۔ میں نے دھیرے سے کھینچا تو وہ ریشم کے ڈھیر کی طرح میری آغوش میں سما گئی۔

کافی دیر تک ہم بغل گیر رہے۔ اس نے سر میرے شانے پر رکھا ہوا تھا اور اب آہستہ آہستہ اس میں دانت چبھو رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور سلطانہ' مجھے بے حد پیاری لگی۔

عین اس لمحے اوپر سے باتوں کی آواز آئی۔ شاید کوئی تہہ خانے کی طرف آرہا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور خاموشی سے نیچے اتر گئے۔ قلعے کے بیرونی فصیل پر کچھ مزدور کام کر رہے تھے۔ سب نے سلطانہ کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ سلطانہ کو اس کی خبر نہ تھی۔ اس پر ابھی تک نشہ طاری تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر سرخی کی ہلکی سی لہر تیر رہی تھی......



اگلے دن ہم شالیمار گئے۔ حسب معمول میں اور، اماں اور زاہدہ الگ ہو گئے۔ سلطانہ نے پوچھا۔

"یہ باغ بھی شاہ جہاں نے بنوایا تھا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو وہ بولی...... "یہ عجیب بادشاہ تھا۔ ساری زندگی ایک ہی عورت سے محبت کرتا رہا اور محبت بھی ایسی کہ تاج محل بنا ڈالا!"

میں نے پوچھا...... "تمہیں اس کی استقامت پسند نہیں آئی؟"

"پسند تو ہے۔" وہ تشکیک کے لہجے میں بولی...... "لیکن بادشاہ ہو کر اس کے مزاج میں اتنا ٹھہراؤ' کچھ عجیب لگتا ہے بلکہ اَن نیچرل لگتا ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ شاہ جہاں فطرتاً انجینئر تھا۔ آرٹسٹ نہیں تھا' اس لئے اس کی طبیعت میں لا اُبالی پن بھی نہیں تھا۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا مگر اس کی حیرت میں تازگی اور شگفتگی تھی۔ گویا ابھی ابھی ہمارا تعارف ہوا ہو اور دونوں کو اس پر مسرت ہوئی ہو۔ دراصل وہ نیچر کے ہاتھوں کھیلنے والی لڑکی تھی۔ اس لیے لا ابالی پن کی ترکیب اچھی لگتی تھی۔ کسی حد تک یہ اس کی فطرت کی ترجمانی تھی۔ ہم نے بہت جلد ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا وہ اسی موڈ میں بولی۔

"چلئے باہر چلتے ہیں۔ مجھے ان بڑے بڑے باغوں کی ترتیب و تنظیم بالکل پسند نہیں۔"

میں نے اماں کو آواز دی اور باہر چلے گئے۔ کھلی فضا اور ہرے بھرے کھیت اسے بہت اچھے لگے۔

"دیکھئے نا' قدرت کی بے ترتیبی میں کتنا حسن ہے۔ پودے' گھاس' درخت جہاں ان کی مرضی ہوتی ہے' اگ آتے ہیں۔ مجھے تو اس میں بھی ایک تنظیم نظر آتی ہے۔ کیا آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے؟"

میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ

جو کچھ کہہ رہی تھی اپنی افتادِ طبع سے کہہ رہی تھی۔ شاید اپنی باتوں کی گہرائی یا گیرائی کا اسے علم نہ ہو لیکن میں اس کی باتوں کے نفسیاتی پس منظر کو سمجھ رہا تھا۔ وہ میری مسکراہٹ کے تسلسل کو دیکھ کر قدرے جھینپی ........

"کیوں، میری باتیں آپ کو عجیب لگ رہی ہیں، لیکن میں اپنے محسوسات چھپا نہیں سکتی۔ یہ میری کمزوری ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اس کا پھول سا ہاتھ چوم لیا۔ تمہاری باتیں میرے دل کو لگ رہی ہیں ........

"میں خوش ہو رہا ہوں۔ تم ذہنی اور قلبی طور پر میرے بہت قریب ہو۔"

"ہوں۔!" اس کی شوخ آنکھیں رقص کرنے لگیں۔ "مجھے بھی آپ اچھے لگتے ہیں۔"

اس کا نازک ہاتھ سہلاتے ہوئے، میں نے پوچھا۔ "سلطانہ زندگی کی قدروں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

وہ جھٹ بولی۔ "ایک حد تک یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن زندگی میں انتہائی ڈسپلن مجھے پسند نہیں!"

اس کا یہ جواب بھی حسبِ توقع تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی میں ذرا سا بھی تصنع نہیں ہے لیکن اس کی پہلی ملاقات کا رویہ یاد آیا تو میں نے پوچھا۔ "سلطانہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کھری لڑکی ہو لیکن ایک بات تو بتاؤ۔ پہلے دن سٹیشن پر تمہاری حرکت اور ہر ادا غیر قدرتی تھی مجھے لگا جیسے تم بن رہی ہو!"

وہ ہنس پڑی۔ "ہاں میں بن رہی تھی۔ دراصل بات یہ کہ اماں آپ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ان کی زبردست خواہش ہے کہ میری شادی آپ سے ہو جائے۔ وہ موقع بے موقع آپ کا ذکر میرے سامنے اس طرح کرتی تھیں کہ آپ کی شخصیت مجھ پر اثر انداز ہو۔ آپ کی تصویر تو میں نے دیکھی ہی تھی۔ آپ کا ذکر سن سن کر حجاب اور خوشی بھی ہونے لگی۔ اور کچھ عرصہ بعد واقعی ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرے سامنے میرے منگیتر کا ذکر ہو



رہا ہو۔ یہی وجہ تھی، جب میں لاہور پہنچی تو ایسا لگ رہا تھا، جیسے میرا اپنے منگیتر سے پہلی بار سامنا ہو رہا ہو!"

میں گھمبیر ہو گیا اور اسے نئی نظروں سے دیکھا۔

"سلطانہ، بالکل یہی ردِ عمل میرا تھا۔ اماں کے خطوط میں تمہارا ذکر پیار کی تھپکی کی طرح مجھے سکون بخشتا تھا۔ اور جب کبھی سہواً" تمہارا ذکر نہ ہوتا تو ایسا لگتا گویا برسوں سے اماں کا خط نہیں ملا۔ دراصل میں اماں کے خط کے ہر سطر اور ہر لفظ میں تمہیں تلاش کرتا تھا اور جس سطر میں تمہارا ذکر ہوتا تھا، اسے بار بار پڑھتا تھا۔ یقین جانو، میں ان الفاظ میں تمہارے جسم کی خوشبو محسوس کرتا تھا!"

سلطانہ کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کی شوخ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ سرشار تھی۔ محبت کے پیغام نے اس کے دل کے تاروں کو لرزا دیا تھا۔ میں نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے دو تین بار پلکیں جھپکائیں۔ پھر نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ایک لازوال مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلتی ہوئی میرے سینے میں اتر گئی۔

ہم واپس باغ میں آگئے۔ اماں اور زاہدہ چائے پی رہی تھیں۔ سلطانہ نے لپک کر تھرماس سے چائے انڈیلی۔ پہلے خود ایک گھونٹ بھرا پھر مجھے پکڑا دی۔ اماں نے فوراً" ڈانٹا........ "یہ کیا بدتمیزی ہے سلطانہ، جھوٹی چائے کیوں دی انہیں!"

"کوئی بات نہیں اماں! سلطانہ نے مچلتے ہوئے کہا۔ "رائٹر لوگ چھوت چھات کے قائل نہیں ہوتے!"

اماں نے میری طرف دیکھا۔ "یہ تو ہے ہی بدتمیز، گرا دیں چائے۔ میں آپ کو اور دیتی ہوں۔"

"نہیں اماں!" میں نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔" اس میں برائی کیا ہے؟"

زاہدہ نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ سلطانہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔

"جلدی کیجئے نا گل بھائی۔ ہائے اماں، کتنی ہلکی میٹھی، سٹرونگ چائے بنائی ہے۔"

"تیرا سر........!" اماں نے اسے لاڈ سے ڈانٹا۔ سلطانہ نے کپ میرے ہونٹوں

سے کھینچ لیا اور اس میں دوبارہ چائے انڈیل کر مزے سے پینے لگ گئی۔ آنکھوں آنکھوں میں اس نے اماں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جتانا چاہتی تھی کہ اماں کتنی اچھی ہیں۔ کتنے پیار سے ڈانٹتی ہیں اور کیسے بیلنس کرتی ہیں!

زاہدہ بھی ہمارے گٹھ جوڑ کو سمجھ گئی تھی۔ بظاہر تو وہ جیلس نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر شام کی سیر کو اس نے ہمارے ساتھ جانا ترک کردیا۔ میں اس کی وجہ یہ سمجھا کہ وہ ہمیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔

شام کو ہم اکثر مال پر گھومتے۔ کبھی اماں ساتھ ہوتیں کبھی ہم دونوں۔ ڈنر مال کے کسی ہوٹل میں کرتے۔ تقریباً" پندرہ دن وہ لاہور رہے۔ اس عرصے میں اس کی کئی خامیاں اور کئی خوبیاں مجھ پر عیاں ہوئیں.........

سب سے نمایاں خوبی یہ کہ وہ والہانہ محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اس میں بلا کی تڑپ اور زندگی تھی۔ وہ نہایت ہی مکمل اور بھرپور لڑکی تھی۔ خامی یہ کہ وہ کچے دھاگے سے اپنے ماضی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پہلی محبت کا داغ اس کے دل سے کبھی نہ مٹ سکے گا......... لیکن اس کے باوجود وہ مجھے پسند تھی کہ اس میں چاہت کا بے پناہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ سپردگی جانتی تھی۔ وہ محبوبہ تھی مگر اس کی چاہت میں ایک عاشق کا سا جارحانہ انداز تھا۔

کراچی جانے سے ایک دن پہلے' وہ اکیلی میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں شیو کر رہا تھا۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کراچی کب آئیں گے۔!"

میں نے کہا........."جب آپ بلائیں گی"۔

"بس آپ فوراً" آجائیے۔ ایک ہفتے کے بعد آجائیے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا......... "آجاؤں گا!"

"آجاؤں گا نہیں' آنا پڑے گا۔ میں آپ کو کالج کے لڑکوں سے ملاؤں گی۔ بڑا مزہ آئے گا!"

"کیا مزہ آئے گا.........؟"



"ارے صاحب' بہت مزہ آئے گا۔ جانتے ہیں' لڑکوں نے لڑکیوں کے کیسے کیسے نام رکھ چھوڑے ہیں مثلاً" بند لفافہ' اندھیرا راز اور زرد گلاب!"

"زرد گلاب خوب نام ہے۔"

"پسند آیا۔" وہ خوش ہوگئی۔ "مجھے بھی زرد گلاب پسند ہے۔ معلوم ہے' یہ میرا نام ہے!"

مجھے اس کی بات اچھی نہ لگی۔ زرد گلاب' جس نے بھی یہ نام رکھا تھا' نہایت موزوں تھا لیکن سلطانہ نے اس کا اظہار جس فخر سے کیا تھا' مجھے پسند نہ آیا۔ اس لئے میں نے دل ہی دل میں مخلوط تعلیم پر کڑی تنقید کی۔ میں نے اس سے کہا۔

"سلطانہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم لڑکیوں کے کالج میں داخلہ لے لو؟"

"واہ .........!' وہ حیرت سے بولی۔ "آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ؟"

"یہ اعتماد کی بات نہیں سلطانہ۔ بس میرا دل نہیں مانتا۔ مخلوط تعلیم کو میرا ذہن قبول نہیں کرتا!"

"کمال ہے آپ رائٹر ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

"میں سچ کہتا ہوں' مجھے یہ پسند نہیں۔ تم سرے سے پڑھنا چھوڑ دو۔ مجھے یہ صورت قبول ہوگی لیکن جس بات کو میرا وجدان نہیں مانتا۔ اس کے لیے کوئی بھی مجھے قائل نہیں کرسکتا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گئی۔ "آپ کہتے ہیں تو میں چھوڑ دوں گی' مگر" وہ رک گئی......... اپنا مفہوم ادا کرنے کے لیے اسے صحیح الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے نرمی سے کہا۔

"سلطانہ' میں تمہاری تعلیم کا مخالف نہیں ہوں۔ تم بے شک لڑکیوں کے کالج میں تعلیم جاری رکھ سکتی ہو لیکن میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ تمہارے چاروں طرف تمہارے عاشقوں کا ہجوم ہو اور تم ان کی تعداد میں اضافے سے خوش ہوتی رہو۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح میرے چہرے کو تک رہی تھی' جیسے

کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو......... میں شیو کر چکا تھا۔ نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا تو وہ سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اٹھائی تو وہ آنکھیں بند کر کے ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں ہنس پڑا اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سر میری گود میں رکھ لیا اور سسکیاں لے کر رونے لگ گئی۔ میں نے اس کے ملائم خشک بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں اور دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ یہ بے حد خوبصورت احساس تھا۔

اچانک اس نے سر اٹھایا اور روتے ہوئے غصے میں بولی......... "آپ یہ اس لئے کرتے ہیں کہ میں آپ کے سامنے بے بس ہو گئی ہوں۔ آپ جان گئے ہیں نا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ ہاں کرتی ہوں، جبھی آپ مجھے ستاتے ہیں۔ حکم چلاتے ہیں، ہاں جبھی جبھی!"

اس نے دوبارہ سر میری گود میں رکھ لیا اور رونے لگی۔ میں نے جھک کر ہونٹ اس کے ریشمی بالوں پر رکھ لیے۔ اس کے جسم سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی اور میری سرمستی میں اضافہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر اٹھایا اور اس کے پیلے رخسار چوم لئے۔

"ہوش میں آؤ، سلطانہ۔ کل تم واپس جا رہی ہو۔ میں اس طرح تمہیں الوداع کیسے کہوں گا"۔

"آپ تو خوش ہو کر مجھے الوداع کہیں گے، فاتح جو ٹھہرے......... لیکن بہت زیادہ پُر اعتماد نہ رہنا۔ میں پل میں بدل جانے والی لڑکی ہوں!"

"اچھا بھئی اچھا۔" میں ہنس پڑا۔ "مگر اب خدا کے لیے موڈ ٹھیک کر لو......... منہ ہاتھ دھو لو پھر جا کر کہیں چائے پیتے ہیں!"

"میں چائے نہیں پیئوں گی۔"

"تو پھر؟"

"بس میں جاتی ہوں۔ ایسی بے بس بھی نہیں، جیسا آپ سمجھتے ہیں۔"



"عقل کی باتیں کرو، سلطانہ۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ ایک دو لمحے چپ رہی، پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی.........

"بس میں جاتی ہوں!"

اس کا خیال تھا کہ میں اسے روکوں گا۔ لیکن میں نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا چلی جا!"

اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اشکبار تھیں اور اس میں شدید روحانی اذیت کا تاثر تھا مگر میں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ اس نے ہونٹ چبائے ایک دو لمحے کھڑی رہی پھر شدید اضطراب کے ساتھ آنسو ضبط کرتے ہوئے چلی گئی۔

شام کو حسبِ معمول وہاں گیا۔ اماں اور زاہدہ ملیں مگر سلطانہ ڈرائنگ روم میں نہ آئی۔ کافی دیر باتیں کرنے کے بعد اماں کو اس کی غیر موجودگی کا خیال آیا۔ "اری جا زاہدہ، سلطانہ کو بلا۔"

زاہدہ چلی گئی تو میں نے مسکرا کر اماں سے کہا۔ "آج وہ نہیں آئے گی۔ اماں!"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"ہماری لڑائی ہو گئی ہے۔"

"لڑائی؟" وہ حیرت سے بولیں۔ "کیوں کس بات پہ؟"

"بات تو معمولی تھی مگر آہستہ آہستہ اہم بن گئی۔"

"آپ بیٹھئے میں اسے بلاتی ہوں۔"

اماں چلی گئیں مگر تھوڑی دیر بعد ہنستے ہوئے واپس آگئیں۔ "وہ تو رو رہی ہے۔ کیا کہہ دیا آپ نے؟"

"یہی کہ تم لڑکوں کے کالج میں نہیں پڑھو گی۔"

"ارے.........!" اماں زور سے ہنس پڑیں۔ "اس بات پر تو وہ پورے گھر اور سارے خاندان سے لڑ پڑی تھی۔"

"اور جیت گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دن کھانا نہ کھایا تو اس کے ابا فوراً" مان گئے۔"

"تو چلیے آج بھی کھانا نہ کھائیے‘ اسے بھوکا ہی رہنے دیجیے۔"

اماں برابر ہنستی رہی......... اگلے دن انہوں نے جانا تھا۔میں سٹیشن پہنچ گیا۔ سلطانہ نے دیکھتے ہی منہ پھیرلیا۔ میں نے بھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ اماں سے باتیں کرتا رہا۔ زاہدہ سے چوٹیں ہوتی رہیں۔ سلطانہ دوسری طرف منہ کیے کتاب پڑھتی رہی‘ اتنے میں گاڑی کی روانگی کا وقت ہوگیا......... اماں نے پیار سے مجھے گلے لگایا۔ زاہدہ نے ہاتھ ملایا۔ سلطانہ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور کتاب میں محو تھی۔ یہ آزردہ بے نیازی تھی۔ میں زاہدہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور نیچے اتر آیا۔ گارڈ نے وسل دی۔ سلطانہ نے چونک کر سر اٹھایا۔میں کھڑکی کے پاس ہی کھڑا تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ میں بالکل سنجیدہ تھا۔ وہ بھی چوکڑی بھول گئی۔ اس نے اوپر کا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ میں نے زرد گلاب کا تازہ پھول جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے کانپتے ہوئے خوبصورت ہاتھ سے پھول تھام لیا۔

میں نے زاہدہ کی طرف دیکھا۔ زاہدہ اماں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے.........

آٹھ دن کے بعد اس کا خط آیا۔ صرف ایک جملہ لکھا تھا۔ میں نے لڑکیوں کے کالج میں داخلہ لے لیا ہے!

اگلے دن اس کا ایک اور خط ملا۔ لکھا تھا.........

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کا حکم مانا ہے۔ سچ کہتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے شکست ہوئی ہے۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ کوئی مجھ پر حکم چلا سکتا ہے۔میں نے زندگی میں پہلی بار محکوم بننے کا مزہ چکھا ہے!

دو دن بعد ایک اور خط ملا۔ لکھا تھا.........

زرد گلاب سوکھ گیا ہے مگر میرے دل کا گلاب ہرا بھرا اور



شاداب ہے۔ میں نے زرد گلاب کی سوکھی پتیاں کتاب کے صفحوں میں بکھیر دی ہیں۔ لیکن اس کی نکہتیں میں نے اپنی روح میں سمیٹ لی ہیں۔ آج میں جتنی خوش ہوں کبھی بھی نہ تھی۔ میرے پیارے کبھی بھی نہ تھی۔!

ابھی میں اس کے خطوط کا جواب دے ہی رہا تھا کہ ایک اور خط آگیا۔ لکھا تھا۔

گل صاحب‘ آپ کے پیار کا انداز اتنا متاثر کن ہے کہ میں اپنا ماضی بھول گئی ہوں۔ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے سچائی کو اب پایا ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے خوف نہیں آ رہا۔ آپ مجھ پر حکم چلاتے ہیں۔ اس میں ایک دعویٰ سا ہوتا ہے۔ایک انوکھی سی اپنائیت ہوتی ہے۔ ایسی اپنائیت میں نے پہلے نہیں دیکھی۔ اس لیے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر میں نے پہلے کوئی غلطی کی ہے تو وہ محض ایک جذباتی دھوکا تھا......... آپ کو پا لینے کے بعد میں اس دھوکے کو سمجھی ہوں۔ آپ کو نہ صرف دل نے پایا ہے بلکہ میرے دماغ اور میرے وجدان نے بھی پورا پورا محسوس کیا ہے۔

آپ کا احساس میرے شعور اور میرے لہو میں ایک ساتھ دوڑ رہا ہے۔ مجھے بھولئے گا نہیں۔ مجھے چھوڑیئے گا نہیں اور مجھ سے بچھڑیئے گا نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں تو اور ہوں گی مگر مجھ جیسی محبت کرنے والی دوسری نہیں ہوگی۔

سلطانہ کو میں اتنا پسند کرنے لگا تھا‘ جتنا کہ وہ مجھے پسند کرتی تھی۔ میں نے اتنی ہی گرویدگی اور والہانہ پن سے جواب دیا۔ بلکہ چند دنوں کے بعد خود بھی کراچی پہنچ گیا۔ میں ایک دوست کے ہاں ٹھہرا۔ وہ ان دنوں شام کُٹیا صدر کے ایک فلیٹ میں مقیم تھا۔ صبح نہا دھو کر تقریباً" دس بجے سلطانہ کی طرف گیا۔ انؑ کا فلیٹ صدر کی ایک اونچی بلڈنگ میں سب سے اوپر کے فلور میں تھا۔ چونکہ بغیر اطلاع کے پہنچا تھا‘ اس لئے اماں مجھے دیکھ کر حیران ہوئیں اور خوش بھی‘ کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہیں۔ سلطانہ نظر نہ آئی تو میں نے اماں سے پوچھا۔ "زاہدہ اور سلطانہ کہاں ہیں؟"

اماں میری جلد بازی اور تجسس پر ہنس پڑیں......... اور پیار سے بولیں۔

"زاہدہ ناظم آباد گئی ہے۔ بڑی آپا کے ہاں اور سلطانہ نفیسہ کے ہاں ہوگی۔ ٹھہریئے' میں فون لاتی ہوں۔ آپ اس سے بات کریں۔"

اماں نے نمبر بتایا۔میں نے ڈائل کیا۔ ادھر سے کسی لڑکی نے فون اٹھایا۔ میں نے کہا۔ "یہاں سلطانہ ہوگی' اسے فون دیجئے۔" لڑکی نے پوچھا......... "آپ کون بول رہے ہیں؟"

میں نے اماں کی طرف دیکھا۔ مجھے اس لمحے شرارت سوجھ رہی تھیں مگر ضبط کرتے ہوئے کہا......... "آپ شاید مجھے نہ پہچان سکیں' اس لئے سلطانہ کو فون دیجئے۔"

ایک دو لمحے خاموشی کے بعد اسی لڑکی کی آواز آئی......... "ہیلو میں سلطانہ بول رہی ہوں۔"

"محترمہ آپ سلطانہ نہیں نفیسہ بول رہی ہیں۔ فون انہیں دے دیں۔ میں گل بول رہا ہوں۔"

"ارے .........!" نفیسہ ایک دم چونکی اور ہنس پڑی......... "اری سلطانہ' وہ تمہارے گل صاحب بول رہے ہیں!"

اب ٹیلی فون سلطانہ نے لیا۔ "ہیلو!"

"جی .........!"

"کیا واقعی آپ گل صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں بالکل۔"

"ارے واہ' کہاں سے بول رہے ہیں۔ کب آئے آپ؟"

"کل شام کو پہنچا تھا۔ اس وقت تمہارے گھر سے بول رہا ہوں۔"

"اچھا! میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا لیکن اس کا ردِ عمل اور خوشی کا اظہار اس کی آواز سے عیاں تھا۔ پندرہ منٹ بعد ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہوئے ہنستی ہوئی اندر



آگئی۔ اماں چائے بنانے اٹھ گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا.........

"چھوڑو بھی"۔ وہ دبے لہجے میں بولی۔ "نفیسہ میرے ساتھ آئی ہے۔"

پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آ جاؤ نفیسہ' اندر آجاؤ۔"

ایک لمبی گوری چٹی لڑکی سلیٹی رنگ کے ریشمی سوٹ میں ملبوس مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ ایک خاص ادا سے سلام کیا۔ پھر ہنس پڑی' سلطانہ نے تعارف کرایا۔

"یہ میری سہیلی نفیسہ ہے۔ ان کے ابا بہت بڑے افسر ہیں اور نفیسہ تو خیر آپ کو جانتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ جانتی ہیں۔ تبھی ایسا کُھل کر ہنسیں۔ ہماری حماقتوں پر ہنسی ہوں گی نا۔"

"نہیں گل صاحب نہیں"۔ وہ مسکراتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "دراصل آپ کا ذکر اتنا زیادہ ہوتا رہا ہے' اب اچانک آپ کو دیکھا تو عجیب سا لگا!"

سلطانہ نے بیٹھنے کے لیے کہا......... اور بولی۔ "میں تو آپ کے خط کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے نفیسہ سے کہہ رہی تھی۔ آج کل میں آپ کا خط آنے والا ہے۔"

"میں نے سوچا' خط دو دن میں پہنچے گا' میں ایک دن میں پہنچ جاؤں گا۔"

نفیسہ ہنس پڑی......... اچھا کیا آگئے۔ بے چاری کا برا حال تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں چودہ گھنٹے میرے پاس گزارتی تھی اور چودہ گھنٹے آپ ہی کا ذکر رہتا تھا۔"

"مگر میں نے تو اسے اتنا مواد نہیں دیا تھا۔"

"ارے صاحب' یہ تو صدیوں کا مواد لے کر آئی ہے۔ بس نہ پوچھئے کیا کیا کہتی ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ سلطانہ بھی ہنس رہی تھی۔ اتنے میں اماں چائے لے آئیں۔ سلطانہ چائے بنانے لگی۔

اماں بولیں......... "جتنے دن آپ کراچی رہیں گے' شام کا کھانا یہیں کھانا۔"

میں ہنس پڑا۔ اماں بولیں......... "آپ سمجھتے ہیں' میں یونہی تکلفاً کہہ رہی

ہوں۔ جی نہیں، آپ کو آنا ہی ہوگا۔"

میں نے مسکرا کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ ان میں صاف پڑھا جاسکتا تھا۔

"ہاں نہ ہی ہوگا۔"

شام کو جب ایک سو سے زیادہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا تو ذرا ستانے کے لیے ٹھہر گیا۔ ان کے فلیٹ کا دروازہ جو گیلری میں کھلتا تھا، بند تھا۔ دروازے کے چھوٹے سے سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھا..........

سلطانہ گیلری میں کھڑی کسی کو اشارے کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ سامنے کی بلڈنگ میں دو لڑکے کھڑے اسے اشارے کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے میں چکرا گیا اور محسوس ہوا کہ گر پڑوں گا لیکن آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پالیا اور واپس جانے کی بجائے نہایت صبر اور ضبط سے کال بیل پر ہاتھ رکھا۔

گھنٹی بجی تو وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ بولٹ کھول کر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور اس کی باچھیں کھل گئیں..........

"ہاں۔ آپ آگئے۔ میں انتظار کر رہی تھی مگر میں نے آپ کو نیچے دیکھا نہیں۔ آیئے نا۔ ارے آپ چپ کیوں ہیں؟ آپ کو پسینہ بھی آ رہا ہے۔ آپ کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا ہے!"

میں مسکرا پڑا۔ یہ عجیب بے بسی، بے کسی اور خفت بھری مسکراہٹ تھی..........

"آپ بیٹھیے میں پانی لاتی ہوں۔ یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے..........؟"

وہ اندر کو لپکی۔ میں نے سامنے بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکے غائب ہو چکے تھے۔ مجھے ایک اور دھچکا لگا۔ سلطانہ مجھے پانی کا گلاس تھما کر بولی.......... "دیکھیے دونوں بھاگ گئے آپ کے ڈر سے۔ ابھی مجھے چھیڑ رہے تھے۔ اشارے کر رہے تھے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا.........."تم بھی تو اشارے کر رہی تھیں۔"

"ہاں میں کر رہی تھی۔ بنا رہی تھی۔" وہ بے حد معصومیت سے بولی۔ "ایسا



کرنے میں مزہ آتا ہے نا!"

"سلطانہ.........." میں نے غصے میں کہا۔

وہ حیرت سے بولی "تو کیا ہوا۔ ایسا مذاق تو ہم دن میں کئی بار کرتے ہیں۔ کالج کے لڑکے ہمیں کتنا تنگ کرتے ہیں مگر ہم بھی ایسی ڈھیٹ ہیں، ذرا بھی پروا نہیں کرتیں۔"

میں نے اب نئی نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ یہ واقعی الہڑ، معصوم اور خام ہے۔ اسے اصلاح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا پھول سا ہاتھ تھام لیا.......... "بیٹھو!"

وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔

"سلطانہ، یہ شائستگی نہیں ہے کہ جو ان لڑکی نوجوان لڑکوں سے اشارہ بازی کرتی رہے۔ دیکھنے والے ایسی حرکتوں کو برا سمجھتے ہیں اور حقیقت میں یہ ہے بھی برائی۔ اس سے ذہن خراب ہو جاتا ہے۔ آدمی راہ سے بھٹک جاتا ہے اور بد نامی الگ ہوتی ہے۔"

اس کی شوخ آنکھیں گھمبیر ہوگئیں.......... "مگر میں آپ کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتی۔"

"بس تو پھر کسی اور چیز سے دل نہ بہلاؤ۔ یہ طفلانہ حرکتیں چھوڑ دو۔ مجھ سے محبت کرتی ہو تو مجھ میں گم ہو جاؤ، جیسے میں تم میں گم ہو چکا ہوں۔"

اس کی گول گول شوخ آنکھوں میں حیرت تھی اور اقرار بھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ چند لمحے خاموشی سے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے اپنا سر میرے گھٹنے پر رکھ دیا۔ اماں جانے کس وقت دروازے میں آکر کھڑی ہوگئی تھیں۔ میری آنکھیں ان سے چار ہوئیں۔ اماں مسکرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ میں ہنس پڑا۔ سلطانہ نے جھٹ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی کومل کومل نتھنوں والی ناک کھینچی..........

"بے وقوف لڑکی۔ اماں ہمیں دیکھ کر چلی گئیں!"

"سچ، نہیں!" اس کے لہجے میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

"نہیں کیا، ابھی ابھی تو گئی ہیں"۔

"کیا کہیں گی دل میں، کتنی بے شرم ہوں۔"

"اتنی حیادار ہو تو سر سنبھال کر رکھتی۔"

"ہوں۔ دل میں خوش ہوتے ہیں، اوپر سے باتیں بناتے ہیں۔"

"خوش تو تم بھی ہوتی ہو۔"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سلطانہ ٹیلی فون کی طرف گئی۔میں گیلری میں ٹہلنے لگا۔ گیلری کے ایک کونے میں لکڑی کے بنے ہوئے ایک بہت بڑے گملے میں گلاب کا پودا لگا تھا۔ جس کی ایک ٹہنی پر اکلوتی کلی چٹخنے والی تھی........ ٹیلی فون پر سلطانہ کی عجیب وغریب گفتگو نے مجھے چونکا دیا۔ پانچ منٹ، سات منٹ، وہ برابر بولے جارہی تھی۔ ہنسی مذاق، رومان اور محبت کی باتیں، گزشتہ ملاقاتوں کا ذکر۔ اب مزید برداشت کی تاب نہ رہی۔ میرا خون کھول اٹھا۔میں پاگلوں کی طرح اس کی طرف بڑھا اور تڑاخ سے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ کٹی ہوئی ڈالی کی طرح فرش پر جاگری۔ ٹیلی فون کا چونگا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا........ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک اور طمانچہ اس کے گال پر دے مارا........

"کیا ہوگیا ہے آپ کو........" وہ گال مسلتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ میں نفیسہ کے دوست سے بات کر رہی تھی!"

نفیسہ کی بچی!........" میں چلایا۔ میں اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر ایک اور تھپڑ مارا........ اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے اور لڑھکتی ہوئی دور جا پڑی لیکن دوسرے لمحے اٹھ کھڑی ہوئی........

"ماریں اور ماریں۔ اگر آپ مجھ پر شک کرتے ہیں تو اور ماریں۔ جان سے مار ڈالیں۔ وہ نفیسہ کا دوست تھا، میں سچ کہتی ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں حماقتیں کر سکتی ہوں آپ کو دغا نہیں دے سکتی۔"

میرا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے میری آنکھوں میں



آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹ تھرتھرائے اور وہ صوفے پر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔

اماں آگئیں۔ انہوں نے حیرت سے یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولیں۔"کیا ہوا گل؟"

میں نے ایک لمحہ کے لیے ان کی طرف دیکھا، لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کے بعد چپکے سے مڑا اور بوجھل بوجھل قدموں سے ایک سو سے زائد سیڑھیاں اتر گیا۔

رات کو جب ٹھنڈے دل سے سوچا تو مجھے سلطانہ کی بات یاد آگئی۔ جب میں نے اس سے پوچھا تھا........

"سلطانہ! زندگی کی قدروں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" تو وہ بے ساختہ بولی تھی........" ایک حد تک یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن زندگی میں حد سے زیادہ ڈسپلن مجھے پسند نہیں!"

مجھے احساس ہورہا تھا کہ میرا سلوک جارحانہ تھا۔ سلطانہ کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ گھر کے آزاد ماحول کی وجہ سے بگڑی ہوئی ضرور ہے مگر قابلِ اصلاح ہے۔ اس میں لچک ہے۔ اس کا ذہن گندہ نہیں ہے اور وہ صاف دل کی لڑکی ہے۔ مجھے اپنے سلوک پر افسوس ہورہا تھا۔

صبح میں نے فون کیا۔ اماں نے فون اٹھایا۔ میں نے رات کے واقعے پر معذرت کی اور سلطانہ کو بلانے کے لیے کہا۔ اماں نے ہنس کر اسے آواز دی۔ سلطانہ آئی۔ میں کافی دیر تک "ہیلو ہیلو" کرتا رہا........ اس نے کوئی جواب نہ دیا........

"دیکھو سلطانہ، تم بات نہیں کرو گی تو میں دل کی بات کیسے بتاؤں گا۔ مجھے کل کے واقعے پر بے حد افسوس ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی تو میں نے دھمکی دی........ "ٹھیک ہے اگر تم نہیں بولتی تو میں فون بند کرتا ہوں۔ "میں آج ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

"جی!" وہ چونک کر بولی۔ "نہیں نہیں!"

" تو پھر سنو' میرا دوست نو بجے دفتر چلا جائے گا۔ یہاں میں اکیلا ہوں۔ کالج جانے کی بجائے ادھر آجانا۔ آج ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔"

" آجاؤں گی۔ وہیں شام کٹیانا؟"

"ہاں........"

میں شیو سے فارغ ہوا تھا کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو سلطانہ کھڑی تھی۔ اندر آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی اور بے اختیار رونے لگ گئی۔ میں نے معذرت کرنا چاہی تو وہ بولی۔

" نہیں' غلطی میری ہے۔ میں رات بھر سوچتی رہی ہوں۔ آپ نے مجھے ٹھیک مارا۔ میں آپ کی خاطر سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ جو بات آپ کو ناپسند ہو' نہیں کروں گی۔"

میں نے اسے سینے سے لگایا اور خوب پیار کیا........ اب وہ روزانہ صبح میرے پاس آتی اور کالج ٹائم تک رہتی........ اس میں بلا کی تڑپ تھی۔ وہ اپنی بہن شمسہ سے بالکل مختلف تھی۔ وہ کئی گھنٹے میرے سنگ گزارتی اور کسی لمحے اس کی گرم جوشی کم نہ ہوتی۔ اس کے انگ انگ سے محبت کے سوتے پھوٹتے تھے۔ وہ ایک مسلسل آبشار تھی........

جج صاحب شام کو کلب جاتے تھے۔ اس لئے میں بلا ناغہ شام کا کھانا وہیں کھاتا۔ ایک دن ڈنر پر شمسہ اور اس کے شوہر سے ملاقات ہوگئی........ وہ صاف ستھرا اور نیک دل پروفیسر تھا' مگر اس کا المیہ یہ تھا کہ قد میں شمسہ سے بہت چھوٹا تھا۔

کھانا کھا کر جب کافی پینے کے لیے ڈرائنگ روم میں آگئے تو موقع پا کر شمسہ نے کہا........ "مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

میں نے کہا........ ضرور' جب چاہیں حاضر ہوں۔"

" کل چار بجے اسی کیفے میں ہماری ملاقات ہوگی' جہاں پہلی بار میں نے آپ کو چائے پلائی تھی۔"

" ٹھیک ہے میں وقت پر پہنچ جاؤں گا"۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں میاں بیوی چلے گئے۔ میں اور سلطانہ حسبِ معمول گیلری میں آگئے۔ جہاں رات گئے تک ہماری باتیں ختم نہ ہوتیں۔ میں نے اسے بتایا کہ کل شمسہ سے ملاقات ہو رہی ہے تو وہ اچھل پڑی۔

" ہاں مجھے شبہ تھا' وہ ایسا کرے گی۔ آپ کی شادی میرے ساتھ ہو جائے' وہ یہ پسند نہیں کرتی۔"

" تو گویا وہ مجھے شادی کرنے سے منع کرے گی۔"

" ہاں۔ سو فی صد' آپ دیکھ لیجئے گا........ میں روزانہ آپ سے ملنے جاتی ہوں۔ یہ سب وہ جانتے ہیں مگر اماں کی وجہ سے بول نہیں سکتے۔"

" انہیں کیا اعتراض ہے۔ کیا وہ تمہیں خوش دیکھنا پسند نہیں کرتے ؟"

" کم از کم آپ کے معاملے میں شمسہ یہ پسند نہیں کرتی۔ اس طرح وہ ساری زندگی احساس کمتری میں مبتلا رہے گی!"

سلطانہ کی بات میرے دل کو لگی۔ اس نے اس ملاقات کی مخالفت بھی نہ کی........ اگلے دن مقررہ وقت پر شمسہ سے ملاقات ہوگئی۔ اسے واقعی میری اور سلطانہ کی ملاقاتوں کا علم تھا۔ اس نے لگی لپٹی بغیر کہہ دیا کہ سلطانہ سے شادی نہ کروں۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولی........

" ایک ہزار' ایک وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ میں ساری زندگی اس سے جیلس رہوں گی۔ دوسری وجہ یہ کہ میرے بھائی' میرے ابا' میرے شوہر سب جانتے ہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی رہی ہوں۔ اماں کی وجہ سے شاید وہ لوگ آپ کی مخالفت نہ کر سکیں مگر ان کے دل میں کانٹا تو چبھا رہے گا اور دل سے کوئی بھی آپ کی عزت نہیں کرے گا۔ پھر یہ شکوک و شبہات جنم لیتے رہیں گے۔ میں کتنی بھی خالی الذہن ہو کر آپ سے ملوں' میرے شوہر کے دل میں رقابت ضرور پیدا ہوگی۔ خود آپ احساس کے کن کن مراحل سے گزریں گے؟ کیا سلطانہ کو چین آئے گا' جب آپ اتفاق سے میرے گھر چائے پی رہے ہوں گے؟ آپ میرے بچوں تک سے پیار کرتے ہوئے ڈریں گے۔ آپ کتنے ہی ہلکے پھلکے

رہیں' لوگ باتیں کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ آپ خود کو ہمیشہ کے لیے امتحان میں ڈال دیں۔ مجھے بھی ہرن کی طرح چوکس رکھیں۔ سلطانہ کو بھی نفسیاتی مریضہ بنادیں اور متعدد زندگیوں کو الجھن میں ڈال دیں؟"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ سماجی قدروں کے ہیولے ایک ایک کر کے سامنے آرہے تھے۔ شمسہ نے جو کچھ کہا' میں نے اس کی تائید یا تردید کی ضرورت نہ سمجھی۔

شام کے کھانے پر سلطانہ کے بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میری یہ دوسری ملاقات تھی۔ وہ شادی شدہ تھے اور والدین سے الگ رہتے تھے۔ انہوں نے اصرار کے ساتھ اگلی شام کے کھانے کی دعوت دی۔

جب میں اور سلطانہ گیلری میں اکیلے رہ گئے تو وہ ساری باتیں زیر بحث آئیں جو چائے پر شمسہ سے ہوئی تھیں۔ سلطانہ بپھری ہوئی تھی اور مقابلہ پر تلی ہوئی.........

وہ کہہ رہی تھی......... "کل بھائی جان بھی آپ سے یہی کہیں گے۔ یہ دعوت یونہی نہیں ہوئی۔ یہ ان لوگوں کی سازش ہے۔ یہ لوگ مجھے تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی انا کی خاطر یہ سب کچھ کر گزریں گے۔ میں جانتی ہوں' اماں کے سوا میرا کوئی دوست نہیں ہے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں' کسی کی پروا نہیں!"

وہ رو پڑی۔ یہ عجب صورتِ حال تھی۔ غالباً" اس شام روز کی طرح میں چہک بھی نہیں سکا تھا۔ اس لئے وہ میری خلافِ معمول متانت سے بھی گھبرا گئی تھی......... میں نے اسے بہلایا پھسلایا مگر اس بہلانے میں وہ بے ساختگی نہیں تھی جو اس کے احساس میں گدگدی پیدا کرتی اور اس کی روح میں زرد گلاب کھل سکتا.........

دوسرے دن بھائی جان کی دعوت میں بالکل وہی ہوا' جس کی پیش گوئی سلطانہ نے کی تھی۔ ان کا رویہ بالکل ممتحن جیسا تھا۔ فرمانے لگے۔ "گل صاحب' میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ دو چار باتیں ہیں اگر دوستانہ ماحول میں زیرِ بحث آجائیں تو کوئی حرج نہیں!"

میں نے کہا۔ "کوئی حرج نہیں۔"



فرمانے لگے......... "آپ سلطانہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

عرض کیا......... "ہاں! میں اسے پسند کرتا ہوں.........!"

فرمایا......... "آپ شمسہ کو بھی پسند کرتے تھے ؟"

"ہاں' میں نے اس سے بھی محبت کی تھی۔"

کہنے لگے......... "مگر آپ نے اس سے شادی نہیں کی؟"

" مجھے اپنی بدنصیبی اور کوتاہی کا احساس ہے۔"

" تو پھر مہربانی کر کے سلطانہ کا خیال بھی چھوڑ دیجئے۔ ہمارے خاندان میں تفرقہ نہ ڈالیے۔ ابا کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ شمسہ کے شوہر بھی مخالفت کریں گے......... ایک اماں ہیں......... جو آپ سے بہت متاثر ہیں اور ہم سب کی مخالفت کے باوجود وہ چاہیں گی تو یہ شادی یقیناً ہو جائے گی۔ لیکن اس سب کے باوجود آپ سے گذارش ہے کہ اس خاندان کی بہتری کے لیے اس رشتے کا خیال چھوڑ دیں۔ خود آپ کی بھلائی بھی اسی میں ہے۔"

کچھ ایسا لگا کہ میں اخلاقی دباؤ کے نیچے دبتا جا رہا ہوں۔ کیونکہ کل کی طرح آج بھی ایک احساس مجھے دبوچے ہوئے تھا۔ بھائی جان مجھے خاموش دیکھ کر بولے۔

" اگر آپ پسند کریں تو ابا سے بھی مل لیجئے گا۔ وہ میری طرح واضح بات شاید نہ کریں لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان کے رویے میں گرم جوشی نہیں ہے۔"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اقدار و اخلاقیات کا جو وسیع جال پھیلا ہوا ہے' اس کا ایک خانہ میں بھی ہوں۔ میں جو زیادہ حساس ہوں' زیادہ جذباتی ہوں' محض جال کا ایک حصہ ہوں۔ کون سی ترجیح اور کیسی ترجیح کہ زرد گلاب اور سرخ گلاب اور سیاہ گلاب سب پر اپنا حق جتاؤں......... اور کہوں......... کہ میں ادیب ہوں۔ مجھے رنگوں سے محبت ہے مجھے پھولوں سے محبت ہے اور یہ کہ مجھے معاشرتی بکھیڑوں میں نہ الجھاؤ کہ جکڑا جاؤں گا اور فطرت کی راہ سے ہٹ جاؤں گا.........

تو یہ سازش ہے' بقول سلطانہ۔ ان لوگوں کی جو اپنی انا کی تسکین کی خاطر دوسروں کے کلیجے مسلتے ہیں اور میرے نزدیک یہ سازش ہے۔ ان لوگوں کی جو مجھ جیسے دل و ذہن

نہیں رکھتے۔ جو مجھ جیسی جنسی وسعت نہیں رکھتے......... جو فطرتوں کو کچل دیتے ہیں!

میں دل گرفتہ اس دعوت سے چلا آیا۔ اس دعوت سے ہی نہیں' اگلے دن میں نے کراچی بھی چھوڑ دی۔ میں جانتا تھا سلطانہ آئی ہوگی۔ اس نے شام کٹیا کی دیواروں سے سر ٹکرایا ہوگا۔ اس کی شوخ آنکھوں میں آنسو ہوں گے اور وہ زخمی دل لے کر واپس گئی ہوگی۔ اس حسرت و امید کے ساتھ کہ لاہور پہنچ کر معذرت کا خط لکھوں گا اور اچانک واپسی کی بنیادی وجہ بیان کروں گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہم ایک دوسرے کو کھو چکے تھے۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے تھے.........

❖ ❖

ایک بار پھر میں نے خود کو کتابوں میں غرق کر دیا.........

یہ میری زندگی کا تجرباتی دور تھا۔ کتابوں میں جن خوبصورت باتوں اور نمائندہ کرداروں سے میرا تعارف ہوا تھا، زندگی میں ان سے بالکل مختلف لوگوں سے واسطہ پڑا......... میں لوگوں کے دلوں میں جھانکتا چلا گیا۔ ان کی روحوں میں اترتا چلا گیا لیکن انسان کے ذہن میں ایسا کوئی گوشہ نہ ملا' جہاں دو گھڑی بیٹھنے کو جی ماناہو۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ جو لوگ سمجھوتے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مالی خوش حالی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کی فطرت اس کے بَرعکس ہوتی ہے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں.........

میں نے ایک ہزار ایک مثالیں دیکھیں کہ اوسط درجہ کے ذہن کے لوگ بلکہ اس سے بھی کم اہلیت کے لوگ خود کو حالات کے مطابق ڈھال کر کاروں اور کوٹھیوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اصولوں کے لیے جیتے ہیں، مثال ضرور بن جاتے ہیں مگر مادی خوش حالی کی دیوی ان سے دور رہتی ہے۔

یہی وہ دن تھے' جب میں نے کمیونزم کا بغور مطالعہ کیا.........

کتابی طور پر مجھے کمیونزم نے متاثر کیا۔ لیکن جب تقابل کیا تو دیکھا کہ مغربی ممالک جہاں کمیونزم نہیں ہے' کمیونسٹ ممالک سے زیادہ خوش حال ہیں۔ خود مشرق میں جاپان ہے جو تمام مغربی ممالک اور ہر کمیونسٹ کنٹری سے زیادہ ترقی یافتہ ہے تو پھر کمیونزم کیونکر

ضرروی اور حرفِ آخر ہوا۔

مشرقی جرمنی، پولینڈ، چیکو سلواکیہ، ہنگری، یوگوسلاویہ اور بلغاریہ کو کیمونزم کی ضرورت نہیں تھی۔ جس طرح فرانس، سپین، بلجیئم، ہالینڈ، برطانیہ، سویڈن اور ڈنمارک وغیرہ کو کیمونزم کی ضرورت نہیں ہے۔ مشرقی یورپ کا معاشرہ بھی کیمونزم سے زیادہ ترقی یافتہ تھا بلکہ دیکھا جائے تو مشرقی یورپ کو زبردستی کیمونسٹ بنا کر ان کی ترقی روک دی گئی ہے۔

کیمونزم کا چارم صرف ان ممالک کے لیے ہے جو آج بھی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی سی زندگی گزار رہے ہیں اور طبقاتی سماج کے شکار ہیں۔ جو رات کو خواب دیکھتے ہیں اور صبح اس کی تعبیر ڈھونڈتے ہیں۔ جو نہیں جانتے کہ کسی منجمد سماج میں انسانی روح کو کیونکر راحت مل سکتی ہے۔ دراصل ایسے ممالک کو انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان کے ذرائع اور وسائل محدود ہوتے ہیں۔ تعلیمی، سائنسی اور فنی شعور سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ شاٹ کٹ تبدیلی چاہتے ہیں۔ یوں وہ کیمونزم کو راہِ نجات سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ جمہوری نظام میں زیادہ بہتر شکل میں میسر آسکتا ہے۔ آخر کینیڈا، امریکہ، مغربی جرمنی، فرانس، جاپان اور ان جیسے دوسرے ممالک کو کیمونزم کی کیا ضرورت ہے۔

مزدور اور کسان کا نام بار بار اچھالا جاتا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ روس کے مزدور اور امریکہ کے مزدور میں کتنا فاصلہ ہے۔ چین اور جاپان کے مزدور میں کتنا فرق ہے، کیمونسٹ کنٹری کا مزدور اور کسان بمشکل زندہ ہے۔ جبکہ جاپان کا مزدور ڈیوٹی کے بعد کار میں گھر جاتا ہے اور امریکہ کا کسان ساری دنیا کو اناج مہیا کرتا ہے اور پھر مکان، روٹی اور کپڑے کے مسائل بھی وہاں نہیں ہیں۔ ہر آدمی پاسپورٹ حاصل کرسکتا ہے۔ جہاں مرضی ہو، جاسکتا ہے مگر کیمونسٹ سماج میں تو اپنے شہر سے باہر جانے کے لیے بھی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندورن ملک ایسی بے جا پابندیاں انسانی فطرت کو کچل دینے کے مترادف ہیں......... جمہوریت میں انسان اپنی مرضی اور منشا کے مطابق زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ ووٹ کی بے پایاں طاقت اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہر چار پانچ سال بعد



بھرپور انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور اپنی مرضی کا حاکم چنتا ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف کیمونسٹ ممالک میں ایسی سہولتیں قطعی مفقود ہیں۔ ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے۔ فرد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ ووٹ کا استعمال برائے نام رہ جاتا ہے اور ایک سخت گیر غلام معاشرہ انسانی فطرت کو کچل کر رکھ دیتا ہے .........

میں نے کیمونزم کے ہمنوا لوگوں کو یہاں بھی دیکھا جو نہایت ڈھٹائی سے ترقی پسندی کی آڑ میں اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ لوگ باقاعدہ کلبوں میں جاتے ہیں۔ اونچے چائے خانوں میں چائے پیتے ہیں۔ روزانہ شراب سے دل بہلاتے ہیں۔ امپوٹڈ کپڑا پہنتے ہیں۔ ریس کورس جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر خرابات میں حصہ دار ہوتے ہیں لیکن بات مزدور اور کسان کی کرتے ہیں۔ ان پر طرہ یہ کہ روپے کے ہوس میں اندھے ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار پر بری طرح برستے ہیں مگر خود سرمایہ دار بننے کے لیے ہر جائز ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔ میرے سامنے کئی مثالیں ہیں کہ کھدر پہننے والے دیکھتے دیکھتے ہی لکھ پتی ہوگئے۔ گلبرک میں کوٹھیاں خرید لیں۔ کار آگئی۔ کھدر کی جگہ امپوٹڈ قمیض اور امپوٹڈ ٹائی کے ساتھ امپوٹڈ بیوی بھی آگئی۔

کچھ سیدھے سادے لوگ بھی ترقی پسندوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہایت سادگی سے کیمونزم پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ غلط یا صحیح اپنی ذہنی سطح کے مطابق سچے ہوتے ہیں چونکہ انہوں نے کیمونزم کو پیشہ ورانہ طور پر اپنایا نہیں ہوتا، اس لئے وہ ہمیشہ خوار اور بیکار رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سچائی ہمیشہ ضائع جاتی ہے کیونکہ عملی زندگی میں عیاری عام طور پر سچائی پر حاوی رہتی ہے!

میرا تجربہ ہے اور سارے اہل نظر کا تجربہ ہوگا کہ سچائی انسان کو الگ تھلگ کر دیتی ہے۔ سچا آدمی ہمیشہ تنہا رہ جاتا ہے۔ معاشرے سے کٹ جاتا ہے۔ دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے اور لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خود میں، جو نہ کٹر مذہبی آدمی ہوں نہ ناستک اور نہ کیمونسٹ، کسی ایسے سچ کی تلاش میں ہوں، جو نہ مات کھائے اور نہ پیشہ وارنہ سیاست کی زد میں آئے لیکن ہر سانس نے مجھے یہی مشاہدہ دیا کہ یہ معصومیت، احساسات

اور جذبوں کا دور نہیں ہے بلکہ سائنس کی صدی ہے۔ شعور ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتا ہے جس میں مادی مفاد کا پہلو ہو اور مفاد کے حصول کے لیے ہر حربہ جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے میں ایسا آدمی فٹ نہیں آتا' جو جذبوں کے کاروبار کا متلاشی ہو۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمارے سماج کا مزاج ہی کچھ یوں بن گیا ہے کہ مثالیت کے لیے دامن وا نہیں کرتا.........

میں نے اپنی طرح کے جتنے لوگ دیکھے' درماندہ اور پریشان۔ وہ حیرت سے گوئے سبقت لے جانے والوں کی طرف دیکھتے رہ گئے اور سوچتے رہے کہ تقدیر اور تدبیر میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے۔ عیاری اور دانشمندی میں جیت کس کی ہوتی ہے؟ اور یہ بھی کہ عیاری کو دانشمندی کیوں نہ کہا جائے اور دانشمندی کو سادگی کا نام کیوں نہ دیا جائے؟

اس عرصے میں راشدہ کے گھر والوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ فلمی معاشقوں کا ذکر اس لیے نہیں کروں گا کہ یہ محض دل لگی ہوتی تھی۔ میں کسی لڑکی سے متاثر نہ ہوا' اگرچہ ایک دو اچھے چانس ملے اور مالی طور پر خوش حالی سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر میں اس صلاحیت سے بے بہرہ تھا کہ وقت سے فائدہ اٹھاتا۔ ورنہ مس سارا کو ہی کیوں نظر انداز کرتا۔

ایک دوست کے ذریعے راشدہ کے والدین سے رشتہ کی بات ہوئی تو وہ مان گئے لیکن بہت جلد ان کا تبادلہ لاہور سے مری ہوگیا اور وہ لوگ چلے گئے مگر رابطہ قائم رہا۔ خط وکتابت کے علاوہ کبھی کبھار ان سے ملنے مری چلا جایا کرتا۔

شادی کی بات آگے بڑھی تو راشدہ بیمار ہوگئی اور تقریباً" مرتے مرتے بچی۔ یوں سال ڈیڑھ سال کے لیے بات ملتوی ہوگئی۔ مری سے ان کا تبادلہ راولپنڈی ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا' جب میں فلم "بارات" بنا رہا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ سے واپسی پر پنڈی ٹھہر گیا۔ شادی کی بات پھر آگے بڑھی اور طے ہوا کہ دو ماہ بعد شادی کر دی جائے لیکن قدرت کو شاید کچھ ایسی جلدی نہ تھی۔ میری چھاتی میں ایک ماہ سے درد ہو رہا تھا۔ یونائٹیڈ کرسچن ہسپتال کے امریکی ڈاکٹر بوز نے معائنہ کیا تو پسلیوں میں کسی پرانی چوٹ کی تشخیص کی۔ میں



نے تائید کی کیونکہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہاکی کھیلتے ہوئے میری داہنی پسلیوں میں گیند لگی تھی۔ ایکسرے سے معلوم ہوا کہ تین چار پسلیاں ناکارہ ہو چکی ہیں اور اپریشن کرنا پڑے گا۔ میں اپریشن کے لیے تیار ہوگیا اور ہسپتال داخل ہوگیا۔ یونائٹیڈ کرسچن ہسپتال کا سارا عملہ عیسائی ہے......... جس دن اپریشن ہونا تھا' ہسپتال کی ساری نرسیں میرے کمرے کے باہر جمع ہوگئیں۔ انہوں نے اپریشن کی کامیابی اور میری صحت یابی کے لیے دعائیہ گیت گایا۔ اس گیت نے میری روح کو بے حد تقویت پہنچائی۔ اپریشن تھیٹر جانے سے پہلے ایک نوجوان خوبصورت پادری آیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ میرے پاس بیٹھا رہا۔ پیار و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ جانے سے پہلے اس نے اجازت چاہی کہ میرے لیے دعا مانگے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر انجیلِ مقدس کی آیات پڑھنے لگا۔ مجھے یہ سب کچھ بے حد اچھا لگا۔

اپریشن تھیٹر میں ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ کلوروفام سنگھایا گیا۔ مجھے یاد ہے' اٹھائیس انتیس تک گنتی کے بعد مجھے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔ دوسرے دن ہوش آیا تو میری چار پسلیاں کاٹی جاچکی تھیں۔ میں خون میں لت پت پڑا تھا۔ شدتِ درد کا یہ عالم کہ روح لرز لرز گئی......... جب تکلیف ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو مارفیا کا انجکشن لگا دیا جاتا۔ یوں دس بارہ گھنٹے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں گزر جاتے۔ مارفیا کا اثر ختم ہو جاتا تو درد بے کراں کا وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ چنانچہ پھر سے انجکشن لگتا......... مارفیا کے علاوہ بھی دوسرے کئی انجکشن لگتے۔ ان گنت گولیاں کھانے کو دی جاتیں۔ ان سب کا ردِعمل یہ ہوا کہ کھانا پینا مستقل جاتا رہا۔ دوائیوں کی بوباس میرے دماغ میں ایسی سا گئی کہ کھانے پینے کی اشیاء پر دوائیوں کا گمان گزرتا تھا۔ آٹھ دس دن کے بعد معلوم ہوا کہ اپریشن ناکام ہوگیا ہے۔

میں اس خبر سے بھی مایوس نہ ہوا۔ کیونکہ دل کہتا تھا کہ کچھ کام باقی ہیں۔ جو مجھے کرنا ہیں موت کو ایسی جلدی کیا ہے۔ اس دنیا میں ایسے کون سے کام ادھورے پڑے ہیں جو میرے بغیر مکمل نہ ہوں گے.........

میں نے اپنے عزیزوں' رشتہ داروں سے یہ خبر چھپائی تھی' مگر میرا بھتیجا عبدالرؤف جو اس بیماری میں میرے ساتھ رہا اور جس نے میری بے پناہ خدمت کی' اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اطلاع پہنچادی۔ بس پھر کیا تھا بہن بھائی اور رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ لوگ میری بے چارگی اور کیفیت دیکھ کر روتے۔ آنسو بہاتے تو میرا بھی دل بھر آتا۔ بس یہی وہ نکتہ تھا کہ میں انہیں اطلاع پہنچانے سے گریز کر رہا تھا۔ دراصل میں اپنی بے بسی اور بے کسی کے اظہار پر راضی نہیں تھا۔ ایک ماہ بعد دوسرے آپریشن کا فیصلہ کیا گیا.........

میں اس حد تک کمزور ہوگیا تھا کہ اگر جسم پر کھال نہ ہوتی تو ہڈیوں کے اس ڈھانچے کی طرح لگتا' جو سائنس کے سٹوڈنٹ کو دورانِ تربیت دکھایا جاتا ہے۔ دوسرے اپریشن پر میری بہنوں نے منتیں مانیں۔ کالے بکرے ذبح کئے گئے لیکن ڈاکٹر بوز کی جان توڑ کوشش اور محنت کے باوجود اپریشن کامیاب نہ ہوسکا بلکہ حالت مزید خراب ہوگئی۔ فلم ٹریڈ کے لوگ آتے' مجھے دیکھ کر حیران ہوتے کہ سانس کس طرح لے رہاہوں۔ دوست احباب سب مایوس تھے۔ ہر ایک کا خیال تھا' صبح دوپہر یا شام کسی وقت بھی میری موت کی خبر آسکتی ہے۔ کروٹ تو کجا کمزوری کا یہ عالم تھا' تھوکنا ہوتا تو اشارہ کرتا اور رومال سے منہ صاف کردیا جاتا۔

نوجوان امریکن پادری ہفتے میں ایک دوبار آتا۔ پھولوں کا گلدستہ لاتا اور تقریباً آدھ گھنٹہ مجھ سے پیار بھری باتیں کرتا۔ آخر میں دعا پڑھتا اور پھر میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہتا.........

"یسوع مسیحؑ ضرور شفا دے گا۔"

نرسوں کے رویے میں بھی انتہائی روحانیت تھی۔ نہایت نرمی اور محبت سے روزانہ میرا منہ ہاتھ دھوتیں۔ ہر تیسرے دن ڈرائی غسل دیتیں اور باقاعدگی سے دوا کھلاتیں......... ایک ڈاکٹر بوز تھا' جب بھی دیکھنے کے لیے آتا' اس کے چہرے پر تفکر اور پریشانی کے آثار ہوتے۔ دو ناکام اپریشنوں کا ردِ عمل اس کی شفاف نیلی آنکھوں میں صاف



دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ کافی دیر تک ڈاکٹر بنجمن سے میرے متعلق گفتگو کرتا رہتا۔ دبلے پتلے ڈاکٹر بوز کی حرکات و سکنات اور چہرے مہرے سے جس طرح کی کرنیں پھوٹتی تھیں' وہ اسی فرشتہ خصلت آدمی کا مقدر تھیں۔

وہ ایک نصب العین کے لیے زندہ رہنے والا ڈاکٹر تھا۔

آخر میرے تیسرے اپریشن کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ڈاکٹر بوز کا خیال تھا' جب تک پیچھے کی پسلیاں نہیں نکالی جائیں گی' میرا زخم ہیل اپ نہیں ہوگا۔ لیکن اس بار وہ زور دے رہا تھا کہ اپریشن کے وقت میرے ورثاء کی موجودگی بے حد ضروری ہے اور خصوصی اجازت بھی۔ ڈاکٹر بوز کی اس پیش بندی سے میں کسی حد تک چونکا۔ شاید موت میرے سر پر منڈلا رہی تھی لیکن نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی کہ میری یقین افروزی میں کمی نہ آئی اور حوصلہ مندی برابر بڑھتی گئی۔ میں ان سب خطرات کو خندۂ استہزا میں زیر و زبر کردیتا تھا......... بجا کہ میرا جسم چھلنی چھلنی تھا۔ میری دو چار ہڈیاں گل چکی تھیں لیکن میری روح بیمار نہیں تھی۔ میرے وجدان میں پھول کھلے ہوئے تھے اور کوہِ ندا سے صدا آرہی تھی.........

"میں ابھی نہیں مرسکتا۔ میں ابھی نہیں مروں گا!"

چنانچہ حسبِ قواعد میرے لواحقین پہنچ گئے۔ اس بار مشتاق اور شیریں گل بھی آئے تھے۔ میری حالت دیکھ کر کوئی بھی اپریشن کے لیے تیار نہ ہوا۔ مجھ میں خون ہی کہاں باقی رہ گیا تھا کہ اب آخری قطرہ بھی اپریشن کی نذر ہو جاتا۔ لیکن جب انہیں سمجھایا گیا کہ موجودہ حالت میں مریض زیادہ سے زیادہ چھ ماہ زندہ رہ سکتا ہے' پھر اپریشن کا رسک کیوں نہ لیا جائے تو وہ راضی ہوگئے۔

اب ایک اور مسئلہ پیدا ہوگیا' وصیت کرنے کا۔

میرا روپیہ کہاں ہے؟ کس بنک میں ہے اور اس کا تصرف کیا ہوگا؟

مگر بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے گا۔ کس میں اتنی ہمت تھی' مجھ سے پوچھے' مجھ سے کہے۔ مجھے یہ احساس دے کہ میں موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑاہوں اور

کاروبارِ حیات کو نمٹاتا چلوں!

بالآخر شیریں گل نے نہایت سلیقے سے حرفِ مدعا بیان کیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا.........

"اس کا مطلب ہے' اقرار کر لوں' تسلیم کر لوں' گویا مرگیا ہوں۔ یہ سب کچھ بتانے کا مطلب یہ ہوا کہ میں ہار گیا' زندگی ہار گئی......... بھائی میں وصیت نہیں کروں گا۔ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ موت کے پروانے پر دستخط کرنے کی بجائے میں جینے کی ذمہ داری اٹھاتا ہوں۔ مجھ میں زندگی کی اہلیت باقی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ مجھے ابھی نہیں مرنا۔ ابھی میرے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں!

سب نے خفت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر بوز کو میرے جواب کا لبِ لباب سنایا گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔

انہی دنوں غیر متوقع سلطانہ کا خط ملا کچھ اخباروں میں میری بیماری کی خبر اور تصاویر چھپ چکی تھیں۔ سلطانہ نے لکھا تھا.........

> آپ کی بیماری کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے' یہ سب کچھ سچ ہو پھر بھی یقین نہیں آتا کہ آپ موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔ محبتوں سے اس قدر بھرپور شخص خودکشی تو کرسکتا ہے لیکن اس عمر میں بیماری اسے زیر کرے گی' دل اس کا یقین نہیں کرتا.........
>
> گل صاحب' آپ جہاں بھی ہوں' جس کے بھی ہوں مگر آپ کا زندہ رہنا بے حد ضروری ہے۔ میرا دل کہتا ہے بلکہ میرا ایمان ہے' آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔ میں نے اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ دو چار نمازیں پڑھی ہوں گی لیکن آج میں نہایت صاف ذہن اور گداز دل کے ساتھ سجدہ ریز ہوئی اور آپ کی صحت یابی کے لیے دعا مانگی۔ چار پسلیوں کے بغیر سہی۔ بس ایک بار پھر



آپ کو ویسا ہی توانا دیکھنے کا ارمان ہے!

سلطانہ کے خط نے مجھے مزید تقویت پہنچائی۔ تصور تصور میں ایک بار پھر میں شام کٹیا پہنچ گیا۔ تھا خط لکھنے کو بہت دل تڑپا لیکن انگلیوں میں قلم پکڑنے کی سکت نہیں تھی۔ کوئی دوسرا میرے دل کی بات کیونکر کہہ سکتا تھا.........

آخر تیسرا اپریشن بھی ہوگیا......... بارہ چودہ گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد مجھے درد کا احساس ہوا تو نیم ہوشی کی کیفیت میں بڑبڑاتے ہوئے' اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ احباب اور رشتہ داروں کو میرے قریب آنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ مجھے یاد ہے' بالکل ایک خواب کی طرح' جیسے بہت دور سے آواز آئی تھی۔ میرے ردِ عمل پر ڈیوٹی نرس نے کہا تھا.........

"اپریشن کامیاب ہوگیا ہے۔"

اور جب میں تقریباً" ہوش میں آرہا تھا اور غیر ارادی طور پر دایاں ہاتھ اٹھایا تو خلافِ معمول ہاتھ اوپر تک اٹھ گیا۔ جب کہ پہلے اپریشن کے بعد ہی اس ہاتھ کی حرکت محدود ہوگئی تھی۔ اسی لمحے مجھے یقین آگیا کہ زندگی جیت گئی اور موت میری بالیں سے بوریا بستر اٹھا کر چلی گئی ہے۔

ڈاکٹر بوز بہت خوش تھا۔ اس نے حکم دیا "مریض کو کھانے کے لیے جو کچھ مانگے مہیا کیا جائے۔"

سلطانہ کی اماں ان دنوں راولپنڈی میں مقیم تھیں۔ غالباً" سلطانہ نے میری بیماری کی اطلاع کردی تھی۔ ایک دن وہ اچانک ہسپتال پہنچ گئیں۔ میں انہیں دیکھ کر جس قدر خوش ہوا' میری حالت دیکھ کر وہ اسی قدر رنجیدہ ہوگئیں۔ مگر یہ وہ دن تھے کہ میری طبیعت کسی حد تک خورد ونوش کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ اماں نے ہسپتال کا کھانا پینا یک لخت موقوف کر دیا۔ وہ روزانہ صبح دس بجے آتی' بھنا ہوا چوزہ یخنی اور پھل پھول لاتی۔ وقفے وقفے سے کھلاتی۔ دن بھر پیاری پیاری باتوں سے دل بہلاتی۔ کبھی سر دباتی کبھی ہاتھوں اور پاؤں کے تلوے سہلاتی۔ اپنی ماں ہوتی تو اس سے زیادہ کیا کرتی۔ مسلسل پندرہ دن جب

تک ہسپتال سے ڈسچارج سرٹیفکیٹ نہ ملا‘ اماں برابر میری رکھوالی کرتی رہیں۔

لمبی بیماری میں مریض عام طور پر تنہائی سے اکتا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس سے ملنے آئیں۔ باتیں کریں۔ تین ماہ کی بیماری کے دوران جو جو آدمی مجھ سے ملنے آیا‘ ایک ایک کر کے آج بھی مجھے یاد ہیں۔ برے وقت اور برے دنوں میں ہمدردی کے دو بول کہنے والا آدمی‘ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان پادری کئی سال گزرنے کے باوجود آج بھی میرے سینے کے کسی نرم گوشے میں بیٹھا ہوا ہے اور زندگی کی نوید دے رہا ہے۔ اماں سے جملہ دُوریوں کے باوجود میرے احساس کے ہر ہر سانس میں ان کے وجود کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔

دراصل زندگی ایسی ہی تابانیوں سے عبارت ہے۔

تقریباً“ شام کا وقت تھا جب میں یونائیٹڈ کرسچن ہسپتال سے رخصت ہوا۔ تین ماہ بعد فیروز پور روڈ پر لہر در لہر قمقمے دیکھے تو محسوس ہوا گویا آج نیا جنم لیا ہے۔ لیکن یہ جنم ایک بالغ بچے کا جنم ہے۔ اس سے قبل روشنیوں کے اس شہر کی چکا چوند کا احساس کبھی اس انداز میں نہیں ہوا تھا۔

ہسپتال میں جتنے دن رہا‘ مارفیا کے انجکشن کی وجہ سے نیند آجاتی تھی۔ لیکن اب ڈاکٹر نے سختی سے منع کردیا تھا۔ لہٰذا شروع کی پانچ چھ راتیں سخت اذیت میں گزریں اور ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہ لگ سکی لیکن رفتہ رفتہ حالات سدھرنے لگے۔ دس پندرہ دن بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے لیے آنکھ لگ جاتی تھی۔ پھر بتدریج اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔
ڈاکٹر بوز نے مشورہ دیا کہ تین چار ماہ کے لیے گھر چلا جاؤں کیونکہ مجھے اچھی خوراک کے ساتھ محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔

کمزوری کا اب بھی یہ عالم تھا کہ سہارے کے بغیر پلنگ سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ قدم اٹھانا تو درکنار کروٹ لینے کے لیے رؤف کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ تقریباً“ ایک ماہ بعد اس قابل ہوا کہ لاٹھی کے ذریعے دس بیس قدم چل لیتا۔

انہی دنوں راشدہ کے والد کا خط موصول ہوا۔ انہوں نے میری خیریت پوچھی تھی۔



میری زیرِ تکمیل فلم ”بارات“ میں دو چار دن کا کام باقی تھا۔ اس فلم کے فلمساز وزیر علی اور رتن کمار اصرار کر رہے تھے کہ واپس آکر فلم مکمل کروں۔ خود میری بھی خواہش تھی لیکن اس کے باوجود دو ماہ اور لگ گئے.........

لاہور پہنچ کر راشدہ کے والد سے رابطہ پیدا کیا۔ انہوں نے کوئٹہ آنے کی دعوت دی لیکن ابھی میری صحت اس قابل نہ تھی کہ اتنا طویل سفر کرتا اور پھر بارات کی ریلیز سے پہلے لاہور چھوڑنا مشکل تھا۔

لاہور کے دوستوں اور لوگوں نے مجھے چھ پسلیوں کے بغیر چلتا پھرتا دیکھا تو بے حد حیران ہوئے۔ وہ تو اپنے خیالوں میں مجھے دفنا چکے تھے۔ کچھ لوگ شرمندہ اور معذرت خواہ تھے کہ ہسپتال نہ آسکے۔ میں بظاہر ان کی معذرت قبول کرتا رہا لیکن یہ میرے لئے مکمل اجنبی لوگ تھے۔ ایک طرح سے یہ یک طرفہ منافقت تھی کہ ایک دوسرے کا خبث باطن جاننے کے باوجود دنیا داری ہوتی رہی‘ لیکن دیکھا دنیا میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ جو شخص تم سے شدید نفرت کرتا ہے‘ سامنا ہوگا تو گلے لگائے گا۔ انتہائی محبت سے خیریت پوچھے گا اور موقع ملنے پر پشت میں تیر ستم گاڑے گا۔

اور یہ بھی کہ اعتدال پسندی‘ کمزوری اور بلند آہنگی‘ شہ زوری۔ شہ زور احترام کے لائق‘ اعتدال پسند نظرانداز کرنے کے قابل.........

جو بہت بولے دانشمند‘ جو کم بولے بدھو.........

یہ سب باتیں اپنی جگہ‘ دنیا کے اپنے طور سہی۔ انسانوں کی بوقلمونیاں بھی روا‘ مگر میں نے تو بڑے دعوے سے جینے کی حامی بھری تھی۔ میں جو محبتوں کے لیے جیتا رہا۔ کیا ساری زندگی محبتوں کے لیے جینے کو کافی سمجھا جائے گا.........؟

میں سیاسی آدمی نہیں تھا کہ اس ملک کا صدر یا وزیراعظم بنتا اور شیر شاہ سوری کی طرح مختصر مدت میں نقشہ ہی بدل دیتا۔ میں ڈاکٹر بھی نہیں تھا کہ خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر پورے ملک کا روگ دور کر دیتا۔ (ویسے میرے سماج میں ایسے ڈاکٹر نہیں ہیں) میں وکیل بھی نہیں تھا کہ حق کے لیے لڑنے کو ہی زندگی کا نصب العین قرار دے کر مثال قائم کرتا

(ایسا وکیل بھی میری نظر سے نہیں گزرا) میں تو بس ایک قلمکار تھا۔ پیار کے بول کہنے والا، محبت کو عام کرنے والا، پریت سنگیت کا رسیا۔

میں تاجر بھی نہیں تھا کہ راتوں رات ہزار کے دو ہزار اور لاکھ کے دو لاکھ بناتا۔ میں کوئی بھی پیشہ اختیار کرتا، ناکام ہوتا۔ اس لئے کہ میرے خمیر میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا عنصر مفقود تھا۔ مجھ میں صرف ایک صلاحیت تھی کہ محبت کروں اور محبت ہی کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ بڑے بڑے داؤ لگانے، شراب پینے اور سازش کرنے سے محبت کرنا زیادہ اچھا کام ہے......... میں بار بار سوچتا۔ جس طرح کسان زمین سے بیج اگاتا ہے اور ثواب کماتا ہے اگر میری صلاحیت بھی یہی ہے کہ محبت کے بیج اگاؤں تو اپنے اصل سے انکار کیوں کروں اور وہ کام کیوں نہ کروں جو میری فطرت کے عین مطابق ہے اور جس کے لیے مجھے نیا جنم ملا ہے!

جانے وہ کون سی ساعت سعید تھی، جب ایک معصوم چہرہ میرے تصور میں ابھرا۔ اس کی روشن پیشانی پر جیتا جیتا خون چمک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"میں شہید محبت ہوں۔ شہید وفا۔ میرا نام "تن تارارا" ہے!"

میں نے اسی لمحے اس الہامی تصور سے وعدہ کیا.........

"تجھے زندہ جاوید کردوں گا۔ میں تمہاری کہانی گھر گھر پہنچا دوں گا۔ ساری دنیا کو بتادوں گا کہ ناگاہل کی ایک آوارہ پری پہلی لڑکی تھی، جس نے میری خاطر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی تھی!"

یوں میں نے اپنے دوسرے جنم کا آغاز کیا اور اپنے پہلے ناول "تن تارارا" کے لیے پہلا فقرہ لکھا.........

"یہ جگنوؤں کے دیس کی کہانی ہے۔"

کیا بتاؤں کہ یہ ناول لکھتے وقت میں کتنا سرشار تھا۔ مجھ پر وجد طاری تھا۔ تن تارارا کی روح ہر سانس پر میری ہمدم رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ یہی وہ کام تھا، جو مجھے کرنا تھا اور جس کا آغاز میں نے کردیا تھا۔ ناول کی تکمیل تک عجیب سی بے ساختگی رہی۔



میں نے ایک جملہ بھی شعوری کوشش سے نہیں لکھا۔ میں ان تخلیقی لمحوں کی کہانی کیوں کر بیان کروں کہ کیسے مضمون اترتے تھے۔ کیسے رقم ہو جاتے تھے کہ دوسرے دن پڑھتا تو حیرت ہوتی۔ کیونکہ آسمانی باتوں اور زمینی باتوں میں صرف ایک رات کا فاصلہ ہوتا۔

جب یہ ناول تکمیل کو پہنچا اور میں نے اس کا مسودہ تسلسل سے پڑھا تو ایسا لگا کہ ناگاہل میں جو کچھ مجھ پر بیتی تھی، محض ایک خواب تھا اور جو کچھ ناول میں لکھا گیا ہے وہی حقیقت ہے۔ غالباً" یہی اس کہانی کی خوبی ہے۔

میری صحت اب بحال ہوگئی تھی۔ کوئی شخص جسے میرے اپریشن کا علم نہ ہو وہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ میری چھ پسلیاں نہیں ہیں.........

اب میں کوئٹہ جانے کے لیے تیار تھا۔ ایک طرح سے وہ احساس اب باقی نہ رہا کہ کوئی لڑکی چھ پسلیوں کے بغیر مجھے نظرانداز کرسکتی ہے۔

کوئٹہ کا موسم نہایت شاندار تھا۔ یہ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر مجھے اچھا لگا۔ راشدہ کے ہنستے کھیلتے گھرنے مجھے مکمل طور پر محبت کی پناہ میں لے لیا تھا۔ ان گنت ناکامیوں کے بعد میں محبت کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا.........

دس بارہ دن وہاں رہا۔ شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ میں بہت خوش تھا۔ راشدہ کی دبی دبی مسرت میری روح میں حلول ہو رہی تھی۔

بالآخر وہ دن بھی آگیا کہ راشدہ دلہن بن کر لاہور آگئی۔ سال ایسی سرشاری میں گزرا گویا سہاگ رات کی پہلی صبح طلوع ہوئی ہو۔ ان بارہ مہینوں کی صبحیں شامیں اور لیل و نہار میں ایسی گرفتگی، شیفتگی اور خود فراموشی تھی کہ آسام کی بے مثال گیتا کی خودسپردگی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ لیکن جیسا کہ ہوتا ہے ارمان پورے ہو جائیں اور حسرتیں نکل جائیں تو محبت بلی کی طرح دبے قدم پہلو سے گزر جاتی ہے اور انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کتنے بڑے المیے سے دوچار ہو چکا ہے!

دراصل وہ لمحہ، جس کے لیے آدمی زندگی داؤ پر لگاتا ہے۔ جس کے حصول کے لیے ہمیشہ تڑپتا ہے۔ جسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتا ہے، اس لمحے

کی گرفت ہی زندگی کا نکتۂ عروج ہے۔ لیکن جب احساس ہوتا ہے یعنی احساسِ ملکیت کہ وہ لمحہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا غلام ہوگیا ہے تو نکتۂ عروج کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان محبت کے لیے نہیں' فرض کے لیے جیتا ہے!

میرے ساتھ بھی کم و بیش یہی ہوا۔ میں جو محبت کے زور سے ساری کائنات کو سمیٹنا چاہتا تھا اور جذبات کی وسعتوں سے پوری زمین پر پھیل جانا چاہتا تھا' محض ایک عورت تک محدود ہو کر رہ گیا.........

تو یہ ہوتی ہے محبت......... کہ مل جائے تو زندگی کی ساری چکا چوند ماند پڑ جائے اور روح کی ساری شادابی بنجر ہوجائے اور دنیا خالی خالی محسوس ہو اور آدمی سوچے کہ زندگی کے پاس کون سا راز باقی رہ گیا ہے کہ تلاش جاری رکھے.........؟

محبت کا طوفان تھم گیا تو فرض نے دامن تھام لیا۔ عدیل عادل آگیا۔ میرا شوخ وشنگ بچّہ۔ زندگی میں ایک نئی کرن پھوٹی' نئی امید در آئی اور بے معنویت کا جمود ٹوٹا.........

پھر وسیم قصیر آیا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والا' شرمیلا اور متین' ذہین اور فطین۔ میری بہت سی خصوصیتیں لیے ہوئے۔ گویا چراغ سے چراغ جل اٹھا۔ میں اپنی ہستی کو ایک نئے روپ میں دیکھ رہا تھا.........

ہما آئی تو بالکل نئے احساس کے ساتھ۔ وہ محبت جو بیٹی کو باپ سے ہوتی ہے' پاکر زندگی نہایت رواں دواں ہو جاتی ہے اور پھر فرض کچھ ایسا بھاری پتھر نہیں رہ جاتا!

جب یہ راز کھلا کہ عورت کی محبت' محض نصف ہے کل نہیں تو یہ تجربہ "پیاس کا دریا" کی صورت میں رقم ہوگیا۔ یہ میرا دوسرا ناول تھا۔ جسے اہلِ نقد نے "تن تارارا" کی طرح تسلیم کیا۔ لیکن احباب میں کچھ اختلاف رائے بھی تھا۔ کچھ دوست "تن تارارا" کو بڑا ناول کہتے تھے اور بعض "پیاس کا دریا" کو.........

مجھے یہ بحث سن کر اطمینان ہوتا تھا کہ دونوں فریق بہر حال کسی ناول کو رد نہیں کرتے تھے۔ جھگڑا محض درجہ بندی کا تھا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جس ترتیب سے میرے



ناول آتے رہے ہیں۔ یہ ترتیب خود میری ذہنی ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے۔

ہوسکتا ہے "تن تارارا" زیادہ بکا ہو۔ زیادہ لوگوں نے پڑھا ہو اور "پیاس کا دریا" کم لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچاہو لیکن اس کے باوجود میں کہوں گا کہ تن تارا را کے بعد "پیاس کا دریا" مراجعت کا نہیں' آگے بڑھنے کا سفر ہے۔ دونوں ناولوں کے بعد تیسرا ناول "زہر کا دریا" مزید سفر جاری رکھنے کے عزم کی علامت ہے۔

منزل کہاں ہے؟ شاید "جنت کی تلاش" میں اس مہم کا سراغ مل سکے جناب احمد ندیم قاسمی نے اس ناول پر جو دیباچہ لکھا ہے، اس سے بھی منزل کی نشان دہی کا احساس ہوتا ہے۔

اس ناول کی تکمیل کے لیے میں مسلسل چھ سال جسمانی اور ذہنی طور پر سفر میں رہا۔ ان چھ سالوں میں مَیں نے اپنے پیارے بچوں کا پیٹ کاٹا' بیوی کی آسائشوں اور خواہشوں کو نظر انداز کیا' اپنے پروفیشن سے دھوکہ کیا' مالی پریشانیوں کا شکار ہوگیا۔ دوستوں نے نااہل کے لقب سے نوازا کیونکہ موٹر خریدنے یا کوٹھی بنانے کے اہتمام کی بجائے کتاب پر وقت اور سیاحت پر روپیہ خرچ کررہا تھا۔

لیکن یہ چھ سال اور ان چھ سالوں کا تخلیقی کرب' میری زندگی کا حاصل ہے! میں کہہ نہیں سکتا کہ ایسی لگن پھر جنم لے گی.........؟ لے گی تو کیا روپ اختیار کرے گی۔ میرے لہو میں اتنی تب و تاب باقی رہے گی کہ دیا جلتا رہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جس کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔

میری خواہش ہے کہ جب تک زندگی کا آخری سانس چل رہا ہو۔ میرا قلم بھی متحرک ہو۔ ادھر سانس ٹوٹے ادھر قلم چھوٹے.........

غالبا" یہی وجہ ہے کہ "جنت کی تلاش" تکمیل ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نصف صدی پر پھیلا ہوا افسانہ' ایسی ایسی یادیں کہ مستقبل کی نوید تھی۔ ان میں ایسے ایسے رنگ کہ قوسِ قزح کا گمان ہو۔ ناکامیاں ہی ناکامیاں' کامرانیاں ہی مرانیاں .........

میں نے اپنی یادداشتیں لکھنے کا آغاز کر دیا۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہوں گے کہ اس

صفائی اور دیانت سے اعتراف کریں گے......... اعتراف بھی ایسا نہ تعلّی کے ساتھ اور نہ پشیمانی اور معافی کے معنوں میں بلکہ جو کچھ پیش آتا رہا اسے قبولنے میں انسانی فطرت کا رویّہ تھا۔ اخلاق اور سماج کا کتنا حصہ رہا اور یہ کہ حسن اور جوانی کو نظر انداز کرنے والی فطرت' کیا انسان فطرت کہلائے گی.........؟

کوئی ہے' مجھے بتائے کہ محبت ملے اور پائے استحقار سے ٹھکرا دے؟ کم از کم مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انسانی فطرت سے بلند تر رویہ اختیار کرتا اور پھر انسان ہونے کے دعوے سے بھی باز نہ آتا۔

سچی بات یہ ہے کہ تمام تر تہذیب کے باوجود فطرت کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ رگوں میں دوڑنے والے لہو کی بھی اپنی ایک تہذیب ہے۔ سوسائٹی اس تہذیب پر قید و بند عائد کرسکتی ہے' فنا نہیں کرسکتی.........

اس لئے کہتا ہوں کہ میرا اعتراف تعلّی اور پشیمانی کے معنوں میں نہیں ہے۔ میں خون کی سچائی پر یقین رکھتا ہوں اور اپنی سرشت کو رد نہیں کرتا۔ اس لئے جو سوسائٹی انسانی سرشت کو شکنجے میں ڈال کر کوئی نئی شکل دینا چاہتی ہے' اس کی زندگی عارضی ہو گی۔ اس کے ثبوت میں اپنی شادی کی مثال دیتا ہوں.........

راشدہ سے شادی کو چودہ سال ہوگئے ہیں۔ میرا بیٹا عدیل عادل بارہ سال کا ہورہا ہے۔ دوسرا بیٹا وسیم قیصر دس سال کا ہورہا ہے ہما پانچ سال کی اور فائق خیام اپنی تمام معصومیتوں کے ساتھ زندگی کی پہلی سالگرہ منا چکا ہے۔

وہ سیدھی سادی لڑکی جس کا ذکر پہلے ابواب میں ہوچکا ہے' اب ایک عورت ہے' چار بچوں کی ماں۔ ان چودہ برسوں میں اس کی تمام سحرکاری اور ساری نزاکتیں ختم ہو چکی ہیں۔ محبت کی جگہ فرض نے لے لی ہے مگر اس کے باوجود معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے ہوئے......... دو دو سال تک بات نہ کی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر سے صلح کے عہد نامے ہوئے۔ اسے احساس ہے کہ اس شخص کے بغیر چارہ نہیں' جو اس کے چار بچوں کی ڈھال ہے۔ مجھے بھی احساس ہے کہ میرے بچوں کو اس سے اچھی اور سچی ماں نہیں مل



سکتی.........

غالباً" یہی احساس ہے جو جناب احمد ندیم قاسمی کے گھر میں بھی جاری و ساری ہے۔ جناب فارغ بخاری کے گھر میں بھی اور جناب عدم کے گھر میں بھی اور کل تک یہ احساس خالد احمد جیسے بے فکرے کے گھر تک بھی پہنچ جائے گا اور وہ زندگی کے نظام میں بندھ جائے گا اور میرے ادب کی طرح اس کے شعروں میں بھی گرم مصالحے کی خوشبو گڈمڈ ہو جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ خلاء سے اتر کر اس کے پاؤں زمین پر ٹک گئے ہیں اور اسے حقیقتوں کا شعور ہو گیا ہے.........

اور یہ کہ وہ اس زمین کا شاعر ہے.........!

زمین کا یہ رشتہ اسے ایک عورت ودیعت کرتی ہے کیونکہ اس عورت کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے کے باپ کا اعزاز بھی اسے یہ عورت ہی عطا کرتی ہے۔ یوں انسانی رشتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے .........

بڑھتی رہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں خوش ہوتا ہوں کہ جونہی زندگی رکتی ہے ' کوئی وسیلہ پیدا ہو جاتا ہے' کوئی نئی کرن پھوٹتی ہے اور انسان اس کے سہارے چند سال ہنسی خوشی گزار دیتا ہے۔ مثلاً" محبت کا نشہ مل جائے تو دو چار سال کا خمار نہ ملے تو زندگی بھر کی تمنا.........

اولاد کی آرزو مل جائے تو ایک مخصوص طمانیت کا احساس نہ ملے تو جیون بھر کی تڑپ.........

دولت کا حصول مل جائے تو ایک خاص برتری کی کیفیت نہ ملے تو حسرتوں کی یلغار.........

ان سب باتوں میں کہیں نہ کہیں خوشی پنہاں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ پہلو ہیں۔ حاکمیت اور اقتدار میں بھی نشہ ہوتا ہے۔ شہرت اور ناموری میں بھی' تفخر کا احساس ہے۔ کام و دہن کی لذت سے بھی انکار نہیں.........

تو پھر زندگی کیوں رکے اور جمود کیوں.........؟

مگر میں تو اپنی بات کروں گا۔ جس نے محبت کے کئی جام توڑے۔ جس نے اولاد کی خوشی بھی دیکھی، دولت بھی دونوں ہاتھوں سے لٹائی۔ حاکمیت نہ سہی، کام و دہن کی لذت تو پائی۔ اقتدار نہ سہی، شہرت کا ذائقہ تو چکھا.........

لیکن اتنا کچھ پاکر کبھی کبھی احساس ہوتا کہ زندگی خالی خالی سی ہے۔ کچھ کمی ہے اس میں، جس کا وجدان مجھے نہیں ہوا مگر ایسا مایوس بھی نہیں تھا کہ گھٹن کا احساس ہوتا اور مرنے کے لیے سوچتا.........

جوں جوں زندگی آگے بڑھتی گئی، طمانیت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ بچوں کی شرارت سے من کھل گیا۔ ان کی ذہانت سے روح سرشار ہوگئی۔ دال روٹی مل کر کھائی تو من سلوئی کا لطف آیا۔ ان کے تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو بھی ایک مزہ پایا۔ ان کی ننھی منی پیشانیاں چومنے میں بھی ایک سرور۔ ان کے رخساروں کے لمس میں بھی ایک نشہ، ان کے بالوں پر ہونٹ رکھ دینے میں بھی راحت اور ان کو گلے لگانے میں بھی ایک ملکوتی گدگدی کا احساس.........

یہ سب لطافتیں یہ ساری مسرتیں، ایک پیسہ خرچ کیے بغیر میسر.........

گویا دولت کے بغیر بھی خوشی کے کئی گوشے ہیں۔ آدمی کام کرے، محنت کرے اور مسرتوں کی وہی حد رکھے، جس سے اس کا ضمیر زندہ و تابندہ رہے۔ کروڑ پتی ایک رات میں ہی اتنی نیند لے سکتا ہے، جتنی ایک مزدور کے حصے میں آتی ہے۔ عورت سے محبت کے معاملے میں بھی وہ مزدور پر فوقیت نہیں رکھتا۔ ٹھنڈا پانی حلق سے اترے تو دونوں ایک ہی طرح کی راحت محسوس کرتے ہیں۔ دھوپ بھی دونوں کے حصے میں برابر کی آتی ہے۔ بہار کی نیرنگیوں سے بھی دونوں برابر محظوظ ہوتے ہیں۔ فطرت روئے زمین کے ہر جاندار سے مادرانہ رویہ رکھتی ہے۔ وہ کم و بیش اور درجہ بندی کی سرشت نہیں رکھتی.........

میں اپنے بچوں میں درجہ بندی نہیں کرسکتا۔ جو بہت ذہین ہے، وہ بھی پیارا ہے۔ جو کم ذہین ہے، وہ بھی پیارا ہے۔ خوبصورت ہے، وہ بھی۔ جو کم خوبصورت ہے، وہ بھی، میں سب سے یکساں محبت کرتا ہوں۔



کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح، میرے ذہن میں ایسے کسی سوال نے کبھی جنم نہیں لیا.........

میرا خیال ہے، کسی باپ کی فطرت ایسی نہیں ہوسکتی۔ کم از کم میری سرشت میں تو درجہ بندی نہیں ہے.........

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب شام کو گھر آتا ہوں تو بچے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ضد کے باوجود ہر ایک کو یہ احساس ہے کہ ابو میرا ہے۔ میں شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح سے ان کے اس احساس کو تقویت پہنچاتا ہوں۔ میں نے بیوی بچوں کو کبھی اپنی پریشانیوں میں شریک نہیں کیا۔ جتنے تیر آتے ہیں، اپنے سینے پر روکتا ہوں۔ جتنی مصیبتیں آتی ہیں، اپنی روح میں سمیٹ لیتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مالی خوش حالی کے بغیر بھی میں اپنی محدود دنیا میں خوش ہوں۔

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اپنے بچوں سے انصاف کرسکتا ہے تو اپنے دوستوں سے بھی غافل نہیں رہ سکتا۔ اگر دوستوں سے غافل نہیں رہ سکتا تو بنی نوع انسان کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ یہیں زندگی میں ایک شفاف چشمہ پھوٹتا ہے اور ساری کدورتیں بہا کر لے جاتا ہے اور انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے.........

مجھے یقین ہے کہ میرے دل میں کسی کے لیے بغض اور نفرت نہیں ہے۔ میں کسی سے انتقام نہیں لے سکتا اور کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور لوگ مجھے نقصان پہنچاتے ہیں، میں حتی الوسع ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ نقصان سے بچنے کی حد تک مقابلہ بھی کرتا ہوں لیکن اگر نقصان پہنچانے والا زیر دست ہو جائے اور میں زبردست تو مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اسے معاف کردوں۔

آج کے دور میں اس چلن کو پسندیدہ رویہ نہیں کہا جائے گا لیکن کیا کروں، اس رویے سے میرے بہت سے بوجھ اتر گئے ہیں۔ بہت سی الجھنیں ختم ہو گئی ہیں اور صاف ستھرے ذہن کے ساتھ زندہ ہوں.........

شاید ان گنت محبتوں کا بھی اس میں ہاتھ ہو کہ پاپا کر کھویا اور کھو کر پایا۔

میری روح میں محبتوں کی اتنی مہریں ثبت ہوچکی ہیں کہ نفرتوں کا احساس ہی ختم ہوگیا ہے..........

یہ ٹھیک ہے۔ مجھ جیسا آدمی نفرتوں کے لیے نہیں ہیں' محبتوں کے لیے پیدا ہوتا ہے!

***